ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

۱۹۳۳ع

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ، الہ آباد

هندستانی سنہ ۱۹۳۲ ع

ایڈیٹر : اصغر حسین ' اصغر

مجلس مدیران

فہرست مضامین

صفحہ

صفحہ

باہتمام شیام سندر سریواستوا - کایستھ پاٹ شالا پریس ' الہ آباد -
ناشر - ڈاکٹر تارا چند ' ہندستانی اکیڈیمی - الہ آباد -

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۳ { بابتہ ماہ جنوری ۱۹۳۳ع } حصہ ۱

ولی کا غیر مطبوعہ کلام

(از مولوی نصیرالدین ہاشمی ' مولف دکھنی مخطوطات)

ایک زمانہ تھا کہ اردو شاعری کی ابتدا ولی سے قرار دیجاتی تھی اور اسے اردو شاعری کا " بابا آدم " کہا کرتے تھے ؛ مگر اب کہ ولی سے دو صدی پیشتر کی شاعری کے بکثرت نمونے مل گئے ہیں اس خیال کی تردید ہوگئی ہے - شمالی ہند اور دکن کا کوئی قدیم اور جدید تذکرہ ایسا نہیں ہے جس میں ولی کا ذکر نہ ہو اور اس کے کلام کا کوئی نہ کوئی نمونہ نہ پیش کیا گیا ہو - یورپ کے محققین نے بھی ولی کے متعلق بہت کچھ تحقیق و تلاش کی ہے اور اس کا کلام شائع کیا ہے - مگر باوجود اس کے اس شاعر کے متعلق متعدد امور ایسے ہیں جو اب تک مختلف فیہ رہے ہیں -

ولي کا نام مختلف تذکرہ نویسوں نے مختلف بتایا ھے -
چنانچہ اتنے نام اُس سے منسوب کیے گئے ھیں :— شمس‌الدین ،
شمس ولي ، ولي الله ، ولي‌الدین ، محمد ولي ، ولي
محمد - اِن میں سے کوئي ایک نام صحیح ھوسکتا ھے
اور یہ نام ولي محمد ھے[1] - نام کی تحقیق کے لیے شمالي ھند
کے تذکروں کے علاوہ ھم کو دکن کے قدیم تذکروں کو بھي پیش
نظر رکھنا چاھیے ، کیونکہ شاعر کے اھل وطن کے قول کو ترجیح
ھے خصوصاً جب کہ ان تذکرہ نویسوں کا زمانہ ولي سے قریب
تر بھي ھے - مگر دکن کے قدیم تذکروں یعني گلشن گفتار[2] -
چمنستان شعرا[3] اور ریاض حسیني[4] میں بھي کسي قدر اختلاف ھے -
حمید نے شاعر کا نام ولي محمد لکھا ھے - شفیق اور فتوت نے
محمد ولي - بخلاف اس کے جو دیوان[5] ابوالمعالي کے بھتیجے
محمد تقي نے مرتب کیا ھے اُس میں " ولي محمد " نام
لکھا گیا ھے - ابوالمعالي ، ولي کے خاص دوست اور رفیق تھے

---

(۱) بہت ممکن ھے کہ " شمس‌الدین " لقب ھو اور اس طرح پورا نام
" شمس‌الدین ولي محمد " ھو اور اُسي کا مخفف " شمس ولي " ھو گیا ھو -
(اِدارہ) -

(۲) مصنفۂ خواجہ خان حمید (سنہ ۱۱۶۵ھ میں تصنیف ھوا) - حیدرآباد
سے شائع ھوا ھے -

(۳) مصنفۂ لچھمي نارائن شفیق (سنہ ۱۱۷۵ھ میں تصنیف ھوا) انجمن ترقي
اردو نے شائع کیا -

(۴) مصنفۂ خواجہ عنایت‌اللہ فتوت (سنہ ۱۱۷۵ھ میں تصنیف ھوا) .
ھنوز شائع نہیں ھوا ھے -

(۵) یہ دیوان انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ھے - دیکھو " یورپ
میں دکھني مخطوطات " ص ۳۸۲ -

اِس لیے اُن کے بیٹے کا ولي کے نام کو غلط لکھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا - اور پھر یہ دیوان سنہ ۱۱۵۱ھ میں مرتب ہوا ہے جبکہ ولي کے انتقال کو کچھہ ہی عرصہ گزرا تھا - یہي نام حمید نے بھي بتایا ہے اور حمید کا تذکرہ دکن کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اِن تمام باتوں پر نظر کرکے یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر کا نام ولی محمد تھا -

ولي کے وطن کے متعلق جو اختلاف ہے اُس پر جامع " کلیات ولي " مولانا احسن مارہروي نے تفصیل سے بحث کي ہے اور بخوبي ثابت کیا ہے[1] کہ ولي گجرات کا باشندہ نہیں تھا بلکہ دکن هي اُس کا اصلی وطن تھا - احسن صاحب نے خود ولی هي کے دو شعر نقل کیے هیں جن کے بعد ولی کے دکھني ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ـ شفیق اور فتوت اور محمد تقي ولي کے اورنگ‌آبادي ہونے پر متفق هیں - اور دکن میں سوا اورنگ‌آباد کے کسی شہر کو ولی کا وطن ہونے کا دعوی بھي نہیں - اِس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ولي اورنگ‌آباد (دکن) کا اصلي باشندہ تھا -

تاریخ وفات کے متعلق دو بیانات هیں - بعض اصحاب سنہ ۱۱۵۵ھ قرار دیتے هیں اور بعض سنہ ۱۱۴۳ھ - قدیم دکھنی تذکروں میں اِس کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے - مولف " اردوے قدیم " نے سنہ ۱۱۴۳ھ قرار دیا ہے اور مولف " اردو شہ پارے " بھی اُس سے متفق هیں اِس لیے سردست اِسی کو ولی کا سنہ وفات تصور کرنا چاهیے -

---

(۱) " کلیات ولي " (مطبع انجمن اردو ، اورنگ‌آباد) ، ص ۱۵ و ۱۶ -

ولی کی تصلیفات کے متعلق میں نے '' یورپ میں دکھنی مخطوطات '' میں تفصیل سے بحث کی ہے (ص ۳۶۴) ؛ یہاں صرف اِسی قدر کہ دینے کی ضرورت ہے کہ دیوان کے سوا اُس کی کوئی اور تصلیف صحیح طور پر اُس کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتی - دکنی شعرا کے حسب عادت کوئی طویل مثنوی ولی نے نہیں لکھی - ولی کا کلام اب تک کئی بار شائع ہوا ہے اور سب سے آخر '' انجمن ترقی اردو '' کی جانب سے ولی کا کلیات بڑی کاوش اور تلاش کے بعد نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے اور اُس میں متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا مواد یکجا ہے مگر اب بھی ولی کے بعض قلمی دیوانوں میں ایسا کلام ملتا ہے جو نہ کسی مطبوعہ دیوان میں ہے اور نہ '' کلیات ولی '' میں - یورپ کے پندرہ نسخوں میں غزلوں کے سوا جس قدر کلام غیر مطبوعہ تھا اُس کو میں شائع کر چکا ہوں[1] - افسوس ہے کہ یورپ کے قیام کے زمانے میں مجھے اِتنا وقت نہیں ملا کہ غزلوں کا بھی مقابلہ کرتا -

دیوان ولی کا ایک ایسا ہی نسخہ راقم‌الحروف کے بزرگ مولوی خلیل‌الله صاحب کے کتب خانے میں ہے جو سنہ ۱۱۵۵ھ کا لکھا ہوا ہے - جو کلام '' کلیات ولی '' میں نہیں داخل ہے مگر اِس نسخے میں ملتا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :—[2]

---

(۱) رسالہ '' معارف '' (اعظم گڑھ) جلد ۲۵ شمارہ ۲ و ۳ اور '' یورپ میں دکھنی مخطوطات '' مولفہ نصیرالدین ہاشمی ص ۴۸۸ -

(۲) اِس غیر مطبوعہ کلام کا متن چونکہ مضمون نگار صاحب نے ایک اکیلے قلمی نسخے سے لیا ہے اور یہ نسخہ جا بجا سے غلط معلوم ہوتا ہے ' اِس لیے جہاں کہیں کوئی تصحیح ممکن نظر آئی حاشیے میں درج کردی گئی - یہ حاشیے اِدارے کی طرف سے لکھے گئے ہیں - مضمون نگار صاحب اِن کے ذمہ دار نہیں - ایڈیٹر -

پو پلـچھ ترے ھاتھ کا پیچدار
ہے دستا مرے جر[1] کتیں مثل مار
چو بھا ہے مرے دل میں خار جلوں[2]
پسو چبرا تـرا جمدری نوکدار
کـمر تھـرا تھلـچھ[3] دیکھ کر
ھوا ہے تو[4] یک دل مرا چار چار
تھرے پردلي کے بولھولان تمام[5]
کیے ھیں وہ اسـتار مـرا داغدار
خماري تھرے نین کی یاد کر
ولي کے انکھاں سو لھوسکے دھار دھار[6]

پھرتے ھیں تھرے عشق سیں مجنوں ھو یاراں ھرطرف
گرتے ھیں تھرے بـرہ کے یکسر پرگاراں ھرطرف[7]
یو خال ہندو دیکھ کے تجھ[8] ھـوئے ھیں کافراں
تسبی مصـلا ڈال دے کے دیندا‌راں ھـر طـرف

---

(۱) جي -
(۲) چبھا....خار جلوں -
(۳) تپنچھا کمر میں ترا دیکھ کر -
(۴) یو -
(۵) غالباً "دلي" کے لام کو تخفیف کے ساتھ باندھا ھے اور ' استار
شاید کتابت کا سہو ھے - ممکن ھے کہ شعر تقریباً یوں ھو :—
ترے پر دلي کے یو پھولاں تمام کیے ھیں یو بستر مرا داغدار
(۶) ولي کي انکھاں سوں لھو دھار دھار -
(۷) برہ یعني "فراق" ؛ پر = پلا ؛ گاراں =" اولے " (واحد " گار ") -
(۸) تجھ مکھ -

مجروح ہوکر[1] عاشقاں تجھ، جو اُن کے ھل اِپر
شمشیر ابرو سیں تہر[2] لاگے جودھاراں ہرطرف
گلشن میں[3] تجھ رشک سیں لالہ کوپہاں چاک کر[4]
جیوں تجھ درس کے خوف سیں رنگیں اناراں ہر طرف
کھایا ہے سنبل سر بسر بے جاں اپس میں دیکھ کر
زلف‌انکہ[5] تجھ رخسار پر پکڑے یو ناراں ہر طرف
ہر ایک میری[6] چشم سیں ہر خوبرو کے جی پہ ہیں
لاگیں ہے کاری سخت جیوں خنجر کے دھاراں ہر طرف
ہر جھاڑ پر تجھ عشق سیں پرتہاں[7] ہیں قمریاں مست ہو
اپنی گلی میں بہا کر برہا کے هاراں[8] ہر طرف
تک تجھ حسن کوں دیکھ کر سب ہوش اپنا کھوے کر
پرتے ہیں تیرے خدمت ہو سب[9] گلعذاراں ہر طرف

---

(۱) ہوئے عاشقاں تجھ، جور ' اُن........

(۲) ترے -

(۳) میں ہے تجھ -

(۴) " چاک کر " (یعنی چاک کیے ہوئے) -

(۵) زلفاں کوں (؟)

(۶) ہر پلک تیری (پلک کا لام ساکن) -

(۷) پڑھتیاں (پڑھتیاں اور قمریاں کی ی مخلوط) -

(۸) اپلے گلے میں بہاے کر برہا کے هاراں (یعنی اپلے گلے میں رنج فراق [؟] کے طوق ڈال کر) -

(۹) پڑھتے ہیں تیرے منقبت سب - (پہلے مصرعے میں حسن کا س متحرک) -

پڑے ولي کے نین سوں انجھواں ایے شدت ستے[۱]
برسے ہے جیوں دل ستے کڑکے سوں باراں ہر طرف[۲]

دوست مت رکھ رقیب بدگو کوں
سرخ روئي نہ دے سیہ رو کوں
کار عاشق[۳] راست بازي ہے
کج نکو کر سجن اپے[۴] ابرو کوں
گیسوے تابدار دلبر کے
دام ہے[۵] میرے دل کے آھو کوں
دل عشاق بند ہوتے ہیں
جب وہ کھولے اپس کے گیسو کوں
جیوں[۶] عاشق سوں شوخ چشم ' ولي !
آب دیتا ہے تیغ ابرو کوں

---

(۱) پڑتے ولي کي نین سوں انجھواں ایسی شدت سیتي -

(۲) برسے ہے جیوں بادل سیتي کڑکے سوں باراں ہر طرف (یعني یوں برستا ہے جیسے باراں بادل سے کڑکے (گرج) کے ساتھ ہر طرف [برسے]) -

(۳) عاشق تو -

(۴) سجن تو -

(۵) دام ہیں -

(۶) خوں -

هوا هے رشک مہر و مشتری کوں
سجن کی دیکھ دستور[1] زری کوں

نہیں هے مشک کوں کنچہ قدر جب سوں
معطر کئے[2] هے زلف عنبری کوں

هوویں مجلوں صفت هر نقش دیوار
اگر دیکھیں وہ اُس رشک پری کوں

کیا تجھ رشک لب نے لعل کوں خوں
کہو جا یو حقیقت جوهری کوں

ولی آتا هے بیهوشی سوں مدهوش
نظر کر تجھ گلابی بکتری کوں

پڑیا هے رشک میں سورج رخ سید معالی سوں
رها هے زرد هو[3] چندر اُس کے لب کی لالی سوں

دیا هے داغ لالا نے اپس دل رشک سیں دیکھو
جو دیکھا اُس کے پر[4] جامہ اُنے رنگ گلابی سوں

خجل هو دیکھ کر اُس کے چمن میں غنچۂ لب کوں
چنبیلی کی هر......کلیاں هر ایک[5] ڈالی سوں

---

(۱) دستار -

(۲) معطر کی (یعنی سجن نے زلف کو معطر کیا) -

(۳) زرد هو هو چندر -

(۴) یعنی اُس کے بدن پر -

(۵) هری کلیاں هر اک گلبن کی (؟)

چلے جب انجمن میں وہ یتیمن ہے اُس کے پاواں سوں
اوٹھیں ہو ہو کے سب زندے عزیزاں نقش فانی سوں

کشش تل اُس کے چہرے کی کہاں جو اب بشر کے ہے[1]
عطارد جو ہوا حیراں ایس کے فکر عالی سوں

شب تارے کون جاگا کہاں ہو اُس کے گھر بہتر[2]
پڑے جب چوکلیں[3] چلدنا جو اُس مکہ کی اُجالی سوں

ہوا ہوں عاشقی کے ملک کا میں جب سہتی صوبہ
چلے معزول ہو بختوں سہری نسدن[4] بحالی سوں

ولی توں شعر اپنے کی نہ کر تعریف ہر کس کن
ہنسے کا تجہ پہ بےغایت گھر کر (؟) کوئی خیالی سوں

چشم تیرے جو مست و غلطاں ہیں
ہدہرے میں.........کاں ہیں

یو دو ہونٹ و چشم مست ہوتے[5]
تار گیسو کے کیوں پریشاں ہیں

---

(۱) کہاں جرأت بشر کی ہے (؟)

(۲) شب تاریک کوں جاگنا کہاں ہو اُس کے گھر بہیتر -

(۳) چوکلن (؟) - '' کن '' اور '' کنے '' کے معنے پاس یا طرف کے ہیں اور غالباً اِسی سے کلن ہوگا - اگر یہ خیال صحیح ہے تو '' چوکلن '' کے معنی چاروں طرف یا چوطرفا کے ہوں‌گے - اِس لحاظ سے مصرع یوں ہوگا - پڑے جب چوکلن (یا چوکلیں) چلنا یو اُس مکھ کی اُجالی کا - '' چلنا '' دکن میں کھلی ہوئی چاندنی کو کہتے ہیں اور تلفظ اِس لفظ کا '' چننا '' ہے - '' جو '' کے بجائے '' یو '' زیادہ مناسب ہے -

(۴) نختاں مرے تس دن -

(۵) یو جو دو ہونٹھ و چشم مست ہوئے (؟) -

رحم کر ، لطف دکھا[1] درشن

ھجر تیرے میں بار بہجاں ھیں

تیرے پلکاں بھواں کماں اُنکی[2]

عاشقاں جان و دل سوں قرباں ھیں

تجھ زنخداں کے چاہ کے بھیتر

یو سف مصر آج حیراں ھیں

خاتم حسن دیکھ تیرے ھات

تجھ اطاعت میں سلیماں ھیں[3]

دیکھ کر تجھ لباں کی یو سرخي

خون دل لعل رشک مرجاں ھیں

آج بازار حسن میں تیرے

مشتري زھرہ[4] و کیواں ھیں

صد ھزاراں شمع زَیَن مہانے

سوز سوں ، مکھ ترے کے گریاں ھیں

عشق تیرے کا جو ھوا ھو مریض

دیکھ[5] اُسکي دوا میں لقماں ھیں

آفریں شعر پر ولي کے سن

بولتے وہ کہ جو سخندان ھیں

---

(۱) لطف کر ' دکھا -

(۲) تیر پلکاں ، بھواں کماں اُن کے -

(۳) سب سلیماں ھیں -

(۴) اور (؟)

(۵) دنگ -

حسن کا نعمت تجکوں مہسوں ہو ئیچوا[1]

مکہ تھرا ماہ وسال اللہ کوں ہوئیچو[2]

سرو شمشاد سب چمن مہانے

قد ترا دیکھ سر نگوں ہوئیچو[3]

دوست جو فہر تھرے مکہ کا ہے

دشمن چرخ نیلہ گوں ہوئیچو

جو نین تھرے مکہ کوں نا دیکھے

نت رواں اُس نین سوں خوں ہوئیچو

جن[4] کے خوباں کا قد ترے آنگے

لعطلہ ولعتہ چونکہ نوں ہوئیچو[5]

قد ترا دیکھ خم جو نہیں ہوتا

اُس کا تن مثل بید مجنوں ہوئیچو[6]

تھرے دیدار کا جو نہیں طالب

حق کے دیدار سوں بروں ہوئیچو

---

(۱) میموں ہو ۔

(۲)....ماہ و سال میگوں ہو ۔ (ظاہر ہے کہ یہ شعر کسی اور غزل کا مطلع ہے ۔)

(۳) ہوجو یا ہوئیچو (ردیف) ۔

(۴) جگ ۔

(۵) لعطلہ و للعبلہ جیوں کہ نوں ہوجو ۔

(۶) " ئیچو " زائد ہے؛ اِس لیے یہ شعر بھی اس غزل کا نہیں ' یا پھر مصرع یوں پڑھا جائے : " اُس کا تن مثل منجنوں ہو جو " (منجنوں = دولاب کا پہیا) ۔

شمر تیرے کا شوق عالم میں
روز و شب ، اے ولی ! فزون ہونچھو

صاف دل کوں اگر مدام رکھو
جام جمشید کا مقام رکھو
گر تمیں تاب انتقام نہیں
بے سمجھ مت کسی سے کام رکھو
خیال کی مت کرو طرف داری
خاطر زلف مشکفام رکھو
ناز کی سر کشی کوں دیکھوں گا
آج میرا نیاز نام رکھو

توغ ابرو کی عجب رو جھاڑا ہے
کئی ہزاراں کوں جی سوں مارا ہے
ایک غمزے سوں چشم کے اَنلے
کئی چکاروں کیتیں پچھاڑا ہے
اُس کی صورت کوں حق مصور ہو
کھیلچ کھا ناز سوں اُتارا ہے
ہر ملک' عاشقوں کے جی کے تئیں
کاتنے کوں[۲] آرا ہے

(آ) پلک -
(۲) پس ایک -

گال کے در کي کیا کروں تعریف
پہلو میں ماہ جیوں[1] ستارا ہے
اُس کے سر چیرہ[2] مقیشي کا
کیا جھلک اور عجب چکارا[3] ہے
آج اُس سهد[4] کي خوبی کا
غل پریوں میں پکارا[5] ہے
حق سیں مغرور ہو کہ[6] پھرتا ہے
ہے ولي باز کیا بچارا ہے

جلبي کي کلے رشک سوں ہر کیلي[8]
تو بہٹتا سجیا سر پر[9] جب صندلي
گال چھوڑ کے سب چمن کے ، سجن !
کریں شور بلبلاں تیرے[10] آ گلی

---

(۱) " پہلو میں ماہ کے " یا " پہلو میں ملا کے جیوں " -
(۲) طرۂ -
(۳) جھکارا -
(۴) سیدۂ -
(۵) کیا پکارا -
(۶) ہو کے -
(۷) ہے ولي ؛ یار ! کیا بچارا ہے (?)۔
(۸) چنے کي کلي .... ہر کھلي (یعني چنبے کي ہر کلي.... کھلي) -
(۹) تو پھیلتا سجیا سر پر -
(۱۰) کریں شور بلبل تري -

تری تیغ ابرو کي دهشت سيتی
بجلسي فلک کے اُپر بجلي[1]
اگرچه جلیں سب شمع پر پلنگ[2]
همیں[3] تجه شمع پر شمع ساري جلي
تهرے لب هستي کوں کہاں پهونچتی[4]
اگر کوئی بولے شکر کی ڈلي
پری دیکھ تجه مکه کي جهلکار کوں
قدم‌بوس کرنے کو آوے چلي
فراموش قانون حکمت کرے
اگر مکه کوں دیکھے ترے بوعلی
پڑے تهرے[5] پلیچ میں زلف کے
ولایت بسر جائے اپني ولي

زبس نرم ہے[6] پانو کے اُس تلے
که ریشم په رکهتے هیں انبلي (?) چهلے
گرائے مستے ہوئے کے[7] غش کرے
وہ جب عطر جامے پر اپنے ملے

---

(۱) چمکتی (؟)........بیجلی (؟) -

(۲) پتنگ -

(۳) هیں -

(۴) ترے لب هنسي کوں کہاں پولنچتي (یعنی تیرے لب کي هنسي کو کہاں پہنچتي ہے) -

(۵) پڑے گر تری ' پیچ میں ' زلف کے -

(۶) هیں -

(۷) گرائی سیتی ہوے کي -

ادھر سیں اُسے سرو سجدہ کریں
کہ جب وہ کٹکتی[1] چمن میں چلے
نظر کرم سوں ایک شوخ کے
چمن میں گل کئی ہزاراں گلے[2]
وہ مکھ دیکھ روشن سورج آپ سوں
اپس تن کتیں چال کرتے چلے
حرکت جو اُس کان میں دُر کے دیکھ[3]
دل عاشق کے مانند[4] پارا ہلے
کرے مشتری رشک جب ہاتھ[5]
کناری جو اُس شوخ کے جھل جھلے[6]
ولی کے بچن دل کے دریا سیتی
نکلتے کہ جیسے دراں ہز....[7]

کدھی میری طرف لالن تم آتے نہیں سو کیا معنی
چھبیلا تک اپس کا مکھ دکھاتے نہیں سو کیا معنی

---

(۱) مٹکتی (؟)

(۲) نظر کرم سوں ایک اُس شوخ کی - چمن میں گلی کئی ہزاراں گلے -

(۳) حرکت کو اُس کان میں دُر کی دیکھ -

(۴) پارا ہلے -

(۵) اُس ہاتھ پر -

(۶) کی جھلجھلے (یعنی جھل جھل چمکے -

(۷) دُراں ترملے -

جدائی کے.........ھو ظالم تو میری توجہ کوں
کہ مجھ اِس دکھ کی پھانسی سوں چھڑتے[1] نہیں سو کیا معنی
کیا ھوں جان و من اپنا فدا تیری محبت میں
ادھوں لگ[2] بات دل کی مجھ سلاتے نہیں سو کیا معنی
ولی اِس بات کی(؟) ھے رات دن افسوس مجھ دل میں
کہ میری بات تم خاطر میں لیاتے نہیں سو کیا معنی

تیرے ھونٹاں کی لالی سوں ، معالی !
چھپی پانوں میں جا ملہدی کی لالی
ترا قد دیکھ تجھ پانوں پر جھکہ جھکہ[3]
پڑے شمشاد کی ڈالی پہ ڈالی
بیاں تجھ زلف کی سیاھی کا کیا کہوں
کہ نہیں ھے مثل اُسکی رات کالی

یہہ غزل نامکمل ھے کیونکہ اِس کے بعد کا ایک ورق نہیں ھے ـ اِس دیوان میں ایک مستزاد ایسا ھے جو "کلیات ولی" (ص ۱۷۴) میں بطور سادہ غزل کے درج ھے :—

میں سورۂ اِخلاص ترے رو سوں لکھا ھوں اے معنی الفت
بسم‌اللہ دیوان تجھ ابرو سوں لکھا ھوں صفوان محبت
تجھ چشم کی تعریف کوں آھو کے نین پر از دقت بیلھی

---

(۱) چھڑاتے -
(۲) یعنی ابھی تک -
(۳) پاؤں پہ جھک جھک -

اکثر قلم نرگس جادو سوں لکھا ہوں   تـصویـر نـزاکـت

اے موے میاں! وصف ترے موے میاں کي   با حـال پریشاں

وحشي......کمر[1] پر قلم مو سوں لکھا ہوں   دائـم کـلـفـت[2]

تجھ طرۂ طرار کي تعریف کوں ۰ اے شوخ !   ایماء حیاء شوق[3]

سنبل کے چمن میں گل شب بو سوں لکھا ہوں   ہنگامۂ وحشت سوں[4]

اے مردمک چشم اوپر[5] حال ولي کا   نظر کر اپنے کرم سوں[6]

پیکاں کے قلم کر اپس آنجھوں[7] سوں لکھا ہوں   لہوسوں انکھیاں کے[8]

---

(۱) کلیات : '' چیتے کي کمر '' -

(۲) دائم [ہے یو ؟] کلفت -

(۳) ایماے حیا سوں (؟) -

(۴) '' سوں '' کو قلمزد کرنا چاہیے -

(۵) کلیات : '' اِس مردمک چشم طرف ' -

(۶) '' نظر '' کو قلمزد کرنا ضروری ہے مگر پھر بھی یہ ٹکڑا بے معنی ہے -

(۷) کلیات : '' پلکاں....آنسو '' -

(۸) اِس ٹکڑے میں نہ وزن ہے نہ قافیہ نہ معنی - ممکن ہے کہ اخیر شعر کم و بیش اِس طرح ہو :

'' اے مردمک چشم ! نظر حال ولي کا   کر اپنے کرم سوں

پلکاں کے قلم کر اپس انجھواں سوں لکھا ہوں   انکھیاں کي حکایت ''

مقبرۂ خسرو

(از مولوی سید مقبول احمد صمدنی مؤلف " حیات جلیل ")

مرقد خسرو الہ آباد اور نواحی الہ آباد بلکہ صوبہ الہ آباد کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے ' جسکے سامنے لاکھوں بندگان خدا سرادب خم کرتے ہیں - مجھے اندیشہ ہے کہ یہ دعوی تامل کے ساتھہ مانا جاے گا کیونکہ اس صوبہ میں بہت سے مشہور مزارات و معابد ' آثار عتیقہ ' پاک تیرتھوں اور مقدس مقامات موجود ہیں - مذہبی تعلق و تقدس کے لحاظ سے خود پریاگ کا گھن سال پتال‌پوری‌مندر اور اس کا اکشےوٹ درخت یہاں کی بڑی پرستش‌گاہ سمجھے جاتے ہیں - لاکھوں نہیں ' کروروں عقیدتمندوں اور عبادتگزاروں کا مرجع ہیں - مگر حقیقت یہ ہے کہ روضۂ خسرو کا جذبۂ احترام کسی خاص جماعت یا قوم و ملت کے دلوں کے ساتھہ وابستہ و محدود نہیں - شاید اس کا طواف ' کم از کم نظارہ ' مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم کرتے ہیں ؟ یعنی وہ ریاضت کش جاتری اور تارک‌الدنیا سادھو جو دشوار گزار و پیچیدہ راستے طے کرکے دور و دراز مقامات اور پہاڑوں سے اپنے اپنے طریقوں پر پرستش اور یاد الٰہی کے لئے یہاں آتے ہیں - جو تربینی کے سنگم کے اشنان کو گناہوں سے برات کا وسیلہ و ذریعہ مانتے اور سعادت و برکت ابدی کی دستاویز سمجھتے ہیں - یورپ اور امریکہ کا وہ مغرور و متکبر سیّاح جو اپنی ذاتی

نخوت ' قومي تفاخر اور ملکي خصوصیات اور آن بان کے سامنے
پراني دنیا بلکہ سارے جہان کو ہیچ اور حقیر سمجھتا ہے '
یہاں پہونچکر وطني سر بلندي و رفعت کا خیال دور کر دیتا
اور بےاختیار سر طاعت جھکا دیتا ہے - وہ ہراس و ہیبت پیدا کرنے
والي ہیبت ' جس نے اس بیسویں صدی میں دارا و سکندر کے
تاج کو بھي ناچیز و بےحقیقت ثابت کر رکھا ہے ' بادۂ پندار
سے سرمست و سرشار اِنسان کے پرغرور سر سے خود بخود ہٹ
جاتي اور تعظیم و ادب کا خراج پیش کرتي ہے - اِدھر ایک
متواضع و کریم‌النفس ایشیائی‌نژاد دورھي سے دیکھہ کر برھنہ‌پا
ہو جاتا ہے - اس خاک کے پتلے مُنکسر مزاج ' صافی مشرب
کے آئین عجز و نیاز کي پہلی دفعہ ' اور جادۂ ارادت و عبرت کا
پہلا قدم یہ هي ہے - عرفي کی روح جو جیتے جی جہانگیر کے
لئے مضطرب اور اُس کي پرستار رهي تهي ' لاهور هوتي هوئي
تاکستان شیراز سے آجاتي هے - ان دونوں نوواردوں کو عجزوفروتنی
کا یکساں مظاہرہ کرتے ہوئے پاتي ہے - تحیر و استعجاب کا تأثر
دل سے نکل کر زبان حال پر آ جاتا ہے - وہ اس مٹے ہوئے
عظمت و جلال کو سراهتی ہے ' جس نے

بیگانہ ز تاج کرد تارک آوارہ زکفش کرد پارا

اِس بڑے اور آباد شہر (الہ‌آباد) کي آبادي کا بیشتر
حصہ ' بلا کسي اِمتیاز فرقہ و جماعت کے ہر روز ' ہر ہفتہ '
ورنہ کم سے کم سال میں دو تین مرتبہ تفریحاً یا کھیل تماشوں
کے سلسلہ هي سے خسرو باغ ضرور پہونچ جاتا ہے اور پھر وہاں
پہونچکر ہر آنکھہ والے کي نظریں اور عبرت و حسرت بھري نگاہیں

بےاختیار مقبرہ تک پہونچ جاتي هيں - مختصر یہ کہ اس دَور آزادي و آزاد خيالي اور روشنی و روشن دماغي ميں بھي " يادگار خسرو " کي عظمت و ھيبت برقرار بلکہ روز افزوں ھے اور سروش غيبی کي یہ صدا قائم :

چشم خونبار کو صرف چمن آرای کر
شاید آجائے پئے سیر گلستان کوئي

آغاز سلسلہ یا واقعات کو سمجھ لینے کے لئے اتنا یاد رکھنا ضروری ھے کہ خسرو لاھور ميں ' جہانگير کی پہلي بيگم ' راجہ بھگوان‌داس کي بيٹي ' رانی مان‌بائی مخاطب بہ شاہ‌بیگم کے بطن سے ۲۴ امر داد ماہ الٰہی (رمضان ۹۹۵ ھ)[۱] سن بتیس جلوس اکبر شاھي ميں پيدا ھوا تھا - مسٹر بيوریج پرانے حساب سے اسکی انگريزي تاریخ ۴ اگست ۱۵۸۷ع لکھتے ھيں[۲] ' میرے شمار سے دو دن بعد ' یعني ۶ اگست ھوتی ھے - باپ کا بڑا بیٹا ' اور دادا کا پہلا پوتا تھا - اِس لیے بڑي خوشیاں منائی گئی تھیں ' جن کا تذکرہ ' تذکرۂ خسرو میں کرچکا ھوں -

اُس کي موت خواہ بقضاے الٰہي آئي ھو یا بلائي اور کسي کے ھاتھ کی لائي ھوئي رھی ھو ' معتمد خاں مولف اقبال نامۂ جہانگیری اور غیرت خاں خواجۂ کامگار حسیني محرر جہانگیر نامہ کي روایت کے مطابق ۲۰ بہمن ۱۰۳۱ کو ھوئي تھي - جس

---

(۱) قاموس المشاھیر ' نظامي بدایونی صفحہ ۲۲۳-و-اوریئنٹل بیاگرفي کل ڈکشنري ' صفحہ ۱۵۲ -

(۲) جورنل‌رایل ایشاٹیک سوسائٹي میں مسٹر بیوریج کا مضمون - بابتہ جولائي ۱۹۰۷ صفحہ ۵۹۷ -

کو مسٹر بیل ۹ ماہ مذکور یعنی ۱۳ ربیع‌الثانی اور مسٹر بھوریج ۲۹ جلوری ۱۶۲۲ بتاتے ھیں[1] - اور حقیقت یہ ھے کہ بڑی بیکسی و بےبسی کی حالت میں (دکن میں) ھوئی - شاھجہاں (شاھزادہ) جب راجگان احمدنگر و برار کے مقابلہ کے لیے میدان جنگ کو چلا ھے تو بڑے اصرار و لجاج سے جہانگیر سے اجازت لے کر اور انی راے‌سلگھہ دَلَن اور آصف خاں کی حفاظت سے خسرو کو باھر نکلوا کر اپنے[2] ھمراہ لیتا گیا تھا - جہانگیر نے شاھجہاں کو کامل اختیارات[3] دیدئے تھے کہ جسطرح مناسب ھو خسرو کے ساتھہ برتاؤ اور سلوک کرنا - سب اُس کی تمیز و صوابدید پر چھوڑا[4] تھا - سرکاری رپورٹ اور تزک[5] کی خبر تو یہ ھے کہ خسرو نے وھاں دردقولنج سے یکایک وفات پائی - مگر ایک جماعت کا اشتباہ بلکہ دعوی ھے کہ شاھجہاں نے اُس کو مروا ڈالا تھا ' تاکہ مقابلہ کا سب سے بڑا دعویدار اور اُمرا و مقربین شہنشاھی کا سب سے زیادہ محبوب[6] و عزیز شاھزادہ دنیا سے رخصت ھو جاے اور تاج و تخت اُس کے لیے خالی رھے -

---

(۱) جورنل مذکور ' صفحہ ۱۰۶ -

(۲) ایضاً صفحہ ۵۹۷ اور تنکن صاحب کی آگرہ ھینڈ بک ' صفحہ ۲۳ -

(۳) تاریخ جہانگیر از گلیڈون ' صفحہ ۹۲ -

(۴) خافی خاں کے الفاظ یہہ ھیں '' وحکم شد کہ خسرو خسران مآل راھمراہ بردہ قسمے کہ خاطر از وجمع باشد نگاہ دارند '' - منتخب‌اللباب ' حصہ اول صفحہ ۳۰۷ -

(۵) تزک جہانگیری ' صفحہ ۳۴۲ - ترجمہ انگریزی ' جلد دوم ' صفحہ ۲۲۸ - اقبال نامہ جہانگیری ' صفحہ ۱۹۱ -

(۶) اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج - از کرنیل میلی‌سن ' صفحہ ۱۳۲ -

مسٹر بیل[1] نے مفتاح میں کم و بیش پرانی کتابوں سے دونوں روایتیں نقل کر دی ہیں ۔ لکھتے ہیں کہ "شاہزادہ خسرو مدت تک محبوس رہا ۔ آخر باپ کے خوف سے اکبرآباد سے بھاگ کر الہ آباد چلا آیا اور وہیں اقامت اختیار کی ۔ حتی کہ وفات پائی "........" بعض تواریخ میں مرقوم ہے کہ شاہجہاں جب ولایت دکن کی تسخیر کو گیا تو بھائی کو بھی لیتا گیا اور وہیں شہید کرا دیا ۔ جہانگیر نامہ میں تحریر ہے کہ وہ دکن میں درد قولنج سے فوت ہوا ۔ اگر یہ صحیح ہے تو تعجب ہے کہ اس کا مزار الہ آباد میں کیسے بنا ۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ تکفین و تدفین کے بعد بادشاہ کے حکم سے اس کی نعش احقاق شہادت کے لیے قبر سے نکالی گئی تھی ۔ شاید اس کے بعد الہ آباد بھیج دی گئی ہو ، اس لیے کہ اس کی ماں کی قبر وہیں تھی ۔ "

اُس زمانہ کے یوروپین[2] سیاحوں اور لکھنے والوں کی متفقہ خبر اور اطلاع یہی ہے کہ شاہجہاں نے خسرو کو ہلاک کرا دیا تھا ۔ موافق و مخالف دونوں طرح کی روایات اور تحریرات پر ، میں شاہزادہ خسرو کے تذکرہ میں ضروری تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں ۔ یہاں نقل و تکرار کی حاجت نیز گنجائش نہیں پاتا ۔ مسٹر بیوریج کو اس بارہ میں اختلاف ہے ۔ فرماتے ہیں[3]

---

(۱) مفتاح التواریخ صفحات ۳۳۵ و ۳۳۶ ۔

(۲) مسٹر ڈی لاریلی ۔ پیٹر منڈی ۔ ولیم ٹیری ۔ پلسارٹ ۔ ہربرٹ ۔ وان ڈوئر ۔ ڈی لٹ ۔

(۳) جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ، جولائی ۱۹۰۷ ، صفحہ ۵۹۹ ۔

کہ زہر دیئے یا گلا گھونٹنے کی کوئی شہادت نہیں پائی جاتی -
میں کہتا ہوں کہ راجپوتوں کی تاریخیں صاف لفظوں میں
خسرو کے مروا ڈالنے کا الزام خورم پر لگاتی ہیں -

تہمت قتل مثائے سے نہیں جانے کی
خون ناحق مرا سرخی ہے ہر افسانے کی

حال کے سرکاری مورخین و مفتشین میں سے مسٹر سی
ڈی استیھل ' ضلع الہ‌آباد کے گزیٹیر (جلد ششم مطبوعہ ۱۸۸۴)
میں بحوالہ تاریخ الفنسٹن صاحب (صفحہ ۴۹۱) لکھتے ہیں[1]
کہ خسرو کو شاہجہاں نے سنہ ۱۶۲۱ میں قتل کرا دیا تھا -
کرنیل نیول گزیٹیر جدید میں تحریر فرماتے ہیں[2] کہ بدنصیب
شاہزادہ خسرو الہ‌آباد کو حراست میں بھیجدیا گیا تھا - سنہ ۱۶۲۲
میں فوت ہوا - عام خیال یہ ہے کہ باپ کے اشارے یا حکم
سے ہلاک کرا دیا گیا تھا -

شمس‌العلماء مولوی ذکاءاللہ خاں بہادر نے ہندوستان کی
مبسوط تاریخ میں جو اسی سر زمین (الہ‌آباد) پر بیٹھہ کر لکھی
گئی تھی اس واقعہ کو دردناک تفصیل کے ساتھہ لکھا ہے - اس لئے
ان کی اصل عبارت[3] یہاں نقل کردینا ضروری سمجھتا ہوں -

'' باپ کے ساتھہ بےادبی کرنے سے سلطان خسرو ہمیشہ نابینوں
(نابینائوں) کی پتلی کی طرح نظر بند رہتا تھا اور اپنی پاداش
میں گرفتار تھا - اور اُس کی نگرانی خواجہ ابوالحسن کو سپرد

---

(۱) صفحہ ۱۳۸ -
(۲) سنہ ۱۹۱۱ع ' صفحہ ۱۶۹ -
(۳) تاریخ ہندوستان - مطبوعہ سنہ ۱۸۹۷ع - جلد ہفتم - صفحہ ۱۹ -

تھی - اب خواجہ ' شاہجہان کے لشکر کے ساتھہ روانہ ہوا - جہانگیر نے جمعیت خاطر کے لیے خسرو کو شاہجہاں کے وکلا کے سپرد کیا -''

'' سلاطین ذیشان جن برادروں اور خویشوں کو معدوم کرنے کو بہبود عالم جانتے ہیں - ان سے دنیا کے خالي کرنے کو محض صواب سمجھتے ہیں اور مشیران ملک و ملت بمقتضاے مصلحت و ناگزیر کار مطلق شرکاء دولت کا استیصال خیر اندیشي و بہبود اہل روزگار جانتے ہیں - دین و دولت کے صواب کو یوں کی تجویز سے ربیع الثاني سنہ ۱۰۳۱ کو سلطان خسرو کو ملک عدم کو روانہ کیا - جہانگیر نے شراب کے نشہ کي بےخبري میں خسرو کو شاہجہاں کو حوالہ کر دیا تھا - گفتگوے مردم کے رفع کے لیے دوسرے روز ارکان دولت اور اعیان حضرت نے تکبیر و درود پڑھکر اس کي نعش کمال تعظیم و نہایت تکریم سے اُٹھائي - بر ہان پور سے لے جا کر عالم گنج میں اُس کو مدفن کیا - اُس مظلوم کي بیکسی و بےچارگي پر عورت و مرد اس کو درد کے ساتھہ روتے تھے اور اِس سانحۂ ناگزیر نے مدتوں تک دور و نزدیک کو رنج و الم میں رکھا - اور جب تک وہ شہر میں مدفون رہا شب جمعہ کو ایک عالم اِس کے مرقد کي زیارت کو جاتا - پھر یہاں سے اُس کی نعش الہ‌آباد میں منتقل ہوئی - ہر منزل میں بدستور شہر اُس کي قبر نمودار کی گئی - برسوں تک پنجشنبہ کو اُس موضع کے آدمي گردا گرد سے جمع ہو کر رات کو اُس خالی قبر پر گزارتے تھے - سلطان خسرو کے مارنے سے غرض یہ تھي[1].........''

---

(۱) تاریخ ہندوستان - عہد جہانگیری - مطبوعہ سنہ ۱۸۹۷ م - جلد ہفتم - صفحہ ۲۹-

" شاهجہاں نے اول خسرو کو آنجہانی بنایا اور پھر ازسرنو دولت خانہ برہان پور کے درو دیوار کو جشن نو روزی سے آرایش دی - اور بزم فیروزی کی پیرایش کی اور اس میں طلاء و نقرہ کی ریزش کی[1] - "

اورنگ زیب عالمگیر اس تمام تکریم و احترام کے ساتھہ جو ایسے باپ کے شایان شان تھی شاہجہاں کو جواب میں لکھتا ہے[2] -

" آپ مجھے برا کیوں کہتے ہیں - کیا آپ اپنے بھائیوں خسرو اور پرویز کو بھول گئے - باوجودیکہ انہوں نے آپ کو کوئی گزند نہیں پہونچایا تھا مگر یاد کیجئے کہ آپ نے اُن کے ساتھہ کیا سلوک کیا " -

خافی خاں ، نظام‌الملکی خود کو بچاتے ہوئے دوسرے کے حوالہ سے لکھتے[3] ہیں " خسرو راکہ ہمراہ شاہزادہ شاہجہاں دادہ بودند ، بقول غیرت خاں مولف جہانگیر نامہ مسموم نمودند " -

منشی المنشاشی لالہ سجان رائے فرماتے ہیں کہ جلوس[4] کے پندرھویں سال اسی زندان خانہ میں خسرو نے ودیعت حیات

---

(۱) تاریخ هندوستان - عہد جہانگیری - مطبوعہ سنہ ۱۸۹۷ع - جلد ہفتم - صفحہ ۳۰ -

(۲) رقعات عالمگیری ، مطبوعہ دارالمصنفین ، جلد اول ، صفحہ ۲۲۲ ، نمبر ۱۳۰/۷ -

(۳) منتخب‌اللباب ، حصہ اول - صفحہ ۳۲۵ -

(۴) خلاصۃالتواریخ ، صفحہ ۴۲۵ قلمی - ۴۴۵ مطبوعہ -

سپرد کي - و " در زبانہا افتاد کہ باد شاهزادہ شاهجہاں اور[1]
آنچناں تنگ کرد کہ در زندان فنا گرفتار گشت " -

تقریباً یہي قول اور یہي الفاظ منشي غلام حسین خاں '
صاحب سیر المتاخرین کے بھي ھیں -

شمس العلماء آزاد دھلوي نے تحریر[2] کیا ھے کہ " سنہ ۱۰۳۰
میں خسرو مر گیا - شاهجہاں مہم دکن پر رخصت ھوا تھا -
وہ آکر باپ سے اس بد نصیب بھائي کي سفارش کیا کرتا تھا -
اس موقع پر جہانگیر نے اُس سے کہا - میں دیکھتا ھوں
خسرو ھمیشہ آزردہ اور مکدر رھتا ھے اور کسي طرح اُس کا دل
شگفتہ نہیں ھوتا - اُسے تم اپنے ساتھہ لیتے جاؤ اور جس طرح
مناسب ھو حفاظت میں رکھو - وہ دکن میں بھائي کے ساتھہ
تھا کہ دفعۃً درد قولنج اُٹھا اور مرگیا - بعض مورخ یہہ بھی کہتے
ھیں رات کو اچھا بِچّھا سویا صبح دیکھو تو فرش پر مقتول
پڑا ھے - "

سرولیم سلي مین کي روایت[3] ھے کہ " شاهزادہ ولیعہد کي
ماں کے مار ڈالنے سے نورجہاں کو توقع تھي کہ اسطرح تخت
خود بخود اس کے آوردہ و متوسل[4] (شہر یار) کے لیے خالي
ھوجائے گا - خسرو کو وحشیانہ طور پر بصارت سے محروم کرا دینے
کے بعد نامہربان باپ مہربان ھوگیا - اور خسرو کے ساتھہ بڑي

---

(۱) صفحہ ۳۹ -

(۲) دربار اکبری ' صفحہ ۲۷۹ -

(۳) سیاحت و تذکرے (ریبلس اینڈري کلکشنس) ' جلد اول ' صفحہ ۳۰۲ -

(۴) داماد بھي تھا پہلے شوهر کي لڑکي کا شرهر -

شفقت و مہر سے پیش آنے لگا تھا - لیکن جب خسرو کا بھائي شاھجہاں جنوبي ہند کي گورنري پر مقرر ہوا تو اس نے اپنے بیچارے نابینا بھائي کي راحت و آسایش کے متعلق اپني ناخاطر جمعي اور پریشان بالي کا نمائشی اظہار کیا - اندیشہ ظاھر کیا کہ دارالسلطنت میں اس کي فراغت و آرام کا اتنا خیال کون رکھے گا - اس لئے وہ خسرو کو لے کر اپنے صوبہ دکن چلا گیا اور وھاں اُس کو قتل کرا دیا - کیونکہ یہي ایک صورت تھي جس میں وہ اپنے لئے یقیني طور پر تاج و تخت کو محفوظ سمجھتا تھا '' -

اس پر ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ اپنے نوٹ نمبر ایک میں صرف اسی قدر اضافہ[1] کرتے ھیں کہ سال قتل ۱۰۳۱ھ یعني ۱۶۲۱-۲۲ تھا -

مسٹر کین لکھتے[2] ھیں کہ ''سنہ ۱۶۱۱ع (؟) میں ناعاقبت‌اندیش و بدنصیب خسرو مر گیا اور الہ‌آباد میں اپني ماں کے برابر اُسی باغ میں جو آج تک اُس کے نام سے منسوب ھے ' دفن ہوا - شاھجہاں کے ولي عہد سلطنت ہو جانے کا اعلان (اگرچہ) ہوچکا تھا تاہم وہ اپنے سوتیلے بھائي کي موت کے شبہہ سے پاک نہیں رہا - البتہ یہہ الزام کبھي اس کے خلاف ثابت نہیں ہوا - اور خود اُس کے طریق عمل میں بھي کوئي ایسي بات پائي نہیں جاتی جس سے ایسي ستمگاری کي تہمت کا وہ سزاوار ہو '' -

---

(۱) سیاحت و تذکرے (ریبلس ایلٹري کلکشنس) ' جلد اول ' صفحہ۴۰۳ -

(۲) کین کی مغل ایمپائر ' صفحات ۱۱۸ و ۱۱۹ -

اس طویل سلسلہ نقل و حکایت اور روایت و درایت کو ڈاکٹر استینلے لین پول کی اس تحریر[1] پر ختم کرنا چاہتا ہوں - کہ " جہانگیر کا دوسرا لڑکا شاہجہاں خسرو کو ملکی معاملات میں انتہا درجہ کا پر خطر مد مقابل شمار کرتا تھا - جو بات کہ دراصل واقع ہوئی ہے کبھی بھی منکشف نہ ہوگی - البتہ جب شاہزادہ خورم دکن کو فتنہ و فساد کے استیصال کے لیے ' سنہ ۱۶۲۱ع میں گیا تو اصرار کرکے اپنے بڑے بھائی کو بھی ساتھہ لیتا گیا - بد نصیب خسرو وہیں مرا - کہا تو جاتا ہے کہ بخار سے - مگر مشرق میں بعض اوقات ایسے بخار نہایت ٹھیک وقت پر آجاتے ہیں " -

مسٹر هنری بیوریج تزک جہانگیری کے ترجمہ کے دیباچہ[2] میں ارقام فرماتے ہیں کہ " جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا - اُس نے اپنے رشتہ‌داروں کو رخصت کردینے میں تاخیر نہیں کی - ایک ترک کی طرح اس نے کسی قریب (قریبی) کو تخت کے قریب نہیں رہنے دیا - فی‌الحقیقۃ اس پر بڑا (قوی) شبہہ[کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے بڑے بھائی خسرو کو کئی سال پیشتر قتل کرا دیا تھا " -

تزک کی قولنج والی اطلاع کے متعلق موصوف کا خیال[3] ہے کہ " یہہ تاریخ ۲۰ اور ماہ ' بہمن ہونا چاہیے - خسرو

---

(۱) قرون وسطی کا ہندوستان تحت حکومت مسلمانان ' صفحہ ۳۲۱ -

(۲) صفحہ ۶ - دیباچہ -

(۳) ترجمہ تزک انگریزی ' صفحہ ۲۲۸ - اور - رائل ایشیاٹیک سوسائٹی کا رسالہ بابت سنہ ۱۹۰۷م ' صفحہ ۶۰۱ -

دکن میں فوت ہوا اور ماننا پڑے گا کہ برہان پور یا آسیر میں ۲۰ بہمن سنہ ۱۰۳۱ تقویم قدیم سے ۲۹ جنوری سنہ ۱۶۲۲ع کے مطابق ہوتی ہے - لیکن اُس کے مرنے کی تاریخ ہنوز محقق و مشخص نہیں ہوئی ہے " -

اسقدر ثابت ہے کہ خسرو کی لاش بڑی عجلت کے ساتھہ برہان‌پور[۱] میں سپرد خاک[۲] کر دیگئی تھی - اسکا باعث خواہ سیاسی ہو یا کچھہ اور مصلحتیں رہی ہوں یا شاہجہاں کی ذاتی کاوش و مآل اندیشی یا میدان جنگ اور جدال و قتال کی ہنگامی ضرورتیں - لیکن غالباً خفیہ (کا نفیذنشل) اطلاعات کے پہونچنے اور چنددر چند شبہات کے پیدا ہونے پر چندماہ کے بعد قبر کھولی[۳] گئی اور مئی سنہ ۱۶۲۲ میں بادشاہ کے حکم (سے خسرو کی) لاش نکالی اور دارالسلطنت آگرہ کو روانہ کی گئی - آگرہ میں ۲۰ جون ۱۶۲۲ کو پہونچی[۴] - وہانسے الہ‌آباد لائی گئی[۵] اور بالآخر خلدآباد کے باغ

---

(۱) تاریخ اپنے کو دہراتی ہے - یہ وہی برہان پور ہے ' جہاں ذیقعد سنہ ۱۰۴۰ھ (مئی ۱۶۳۱ ع) میں ممتاز محل ارجمند بانو بیگم نے انتقال کیا تھا جہاں باغ زین‌آباد میں اسکی لاش امانتاً دفن کردی گئی تھی - پھر چھہ سات مہینے بعد اکبرآباد منتقل ہوئی - (ڈنکن صاحب کی آگرہ ہینڈ بک ' صفحہ ۱۳۹ - اور - منشی معین‌الدین کی تاریخ تاج ' صفحہ ۱۰ — وبادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد اول صفحات ۴۰۲ و ۴۰۳ -

(۲) تاریخ جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد صفحہ ۳۳۹ -

(۳) ,, ,, ' صفحہ ۳۳۹ بحوالہ نکولس بانگہم وغیرہ -

(۴) ,, ,, ,, بحوالہ رابرٹ ہیوز -

(۵) , ,, صفحہ ۳۳۹ بحوالہ پیٹر منڈی -

میں اپنی مادر گرامی نژاد کے قریب اُسکے پہلو میں دفن کر دیگئی - یہ دولت اسلامی کے عروج اور زرپاشیوں کا وقت تھا - راستہ ا میں جنازہ جہاں جہاں سے گزرا اور جن جن مقامات پر اُتارا گیا مختلف قسم کی یاد گارین قائم ہوتی گئین - کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے باغ لگا دئے گئے - کہیں کہیں مقبروں کی وضع کی خانقاہیں اور مسافر خانے بنائے گئے - ایک یوروپین سیاح فرانسسکو پلسارٹ صاحب Francisco Pelsart اپنے سفرنامہ میں سنہ ۱۶۲۷ کے احوال میں لکھتے[۲] ہیں کہ ان مقامات پر فقیروں کی ایک کثیر تعداد متصرف و دخیل ہو گئی ہے - یہ لوگ مُزَوِر ' مجاور یا خادم زود اعتقاد عوام‌الناس کو یقین دلا دیتے ہیں کہ خداوند عالم و عالمیان نے عالم رویا میں ہمکو ایسا حکم دیا ہے کہ جو لوگ تم سے صلاح و مشورے کے طالب ہوں انکو نجات و برات کی بشارت دیتے رہو - اس طریقہ و ریاضت سے ان اشخاص کو کثیر رقمیں اور نقد و جلس خوب وصول ہو جاتا تھا '' -

برہان پور والی قبر سے نعش نکالنے کے کچھہ شواہد و اسناد اور بھی ہیں -

نکولا بانگھم اور جستی مین آف لے Nicholas Bangham and Justiman Offley نے ۹ مئی سنہ ۱۶۲۲ کو برہان پور سے سورت فیکٹری کو رپورٹ کی[۳] تھی کہ سلطان خسرو کو قبر سے نکالا ہے - دہلی لئے جاتے ہیں - بادشاہ کا حکم ایسا ہی آیا ہے - پروفسر بینی پرشاد کا خیال ہے اور یقیناً صحیح خیال ہے کہ آگرہ کی بجائے

---

(۱) پیٹر منڈے ' جلد دوم ' صفحہ ۱۰۶ -

(۲) ترجمہ صفحہ ۱۸ -

(۳) ہندوستان کی انگریزی کوٹھیاں - بابتہ سنہ ۲۳-۱۶۲۲ ' صفحہ ۷۹ -

دھلي سہو کتابت یا نعزش قلم سے نکل گیا[1] ھے - پیٹر منڈي صاحب Peter Mundy کا بھي یہي بیان[2] ھے کہ خسرو کي لاش برھان پور سے آگرہ لائي گئي تھي - اسکی تائید دوسرے ذرائع سے بھي ھوتي ھے - آگرہ کے کارکن رابرٹ ھیوز صاحب Robert Hughes نے اس تاریخ (۹ مئي سنہ ۱۶۲۲ کو) سورت فیکٹري کو تحریر[3] کیا تھا کہ آج سلطان خسرو کا تابوت برھان‌پور سے یہاں آیا ھے - کل الہ‌آباد چلا جائے کا - وھاں اپني ماں کے قریب دفن ھوگا -

منڈي صاحب بظاھر ایک بے ھودہ و لغو سي روایت بھي نقل[4] کرتے ھیں کہ " خسرو فی‌الواقع آگرہ میں پیوند زمین کر دیا گیا تھا - لوگ اُسکی حرمت و پرستش ولي و شہید کي طرح کرنے لگے تھے - نور محل، جو اس سے زندگي بھر نفرت و عناد رکھتي رھي ' کیسے ضبط و برداشت کر سکتي تھي کہ مرنے کے بعد خسرو کا یہ ادب و احترام ملحوظ رکھا جاے - اس نے بادشاہ سے کچھہ اس طرح منت و سماجت کی کہ وھاں سے بھي ھٹا کر ' مردہ‌آباد ' یا ' کزروآباد ' Cazrooabad یا حقیقتاً الہ‌آباس کو منتقل کر دینا پڑا " -

اِس قول کي تائید یا تصدیق کسي اور اھل قلم سے نہیں ھوتي - یہ تسلیم ھے کہ اس واقعہ سے گیارہ بارہ برس پیشتر نورجہاں (۱۰۱۹ ھ مطابق ۱۶۱۰ع میں) شبستان جہانگیري میں داخل ھو چکي تھي اور بادشاہ پر پورا قابو حاصل کر لیا تھا -

---

(۱) تاریخ جہانگیر ' صفحہ ۳۳۹ -

(۲) سیاحت نامہ جلد دوم - صفحہ ۱۰۵ -

(۳) انگریزي , فیکٹریاں بابتہ ۲۳-۱۶۲۲ ' صفحہ ۹۴ -

(۴) جلد دوم ' صفحات ۱۰۵ و ۱۰۶ -

ابھي یہ واقعات تازہ تھے اور مقبرہ کي تعمیر کو دس برس بھي نہ گزرے ھوں گے کہ پیٹرمنڈی صاحب سنہ ۱۶۳۲ع میں یہاں (الہ‌آباد) آئے اور مقبرہ دیکھا تھا - فرماتے[1] ھیں کہ " چوٹي کے قریب لکڑي کا کٹھرہ یا جنگلا لگا ھے - اِس میں سچے موتیوں کی سیپیوں سے ترصیع (جڑائی) کا کام کیا گیا ھے - اس میں مخملی زر کار شامیانہ (کھنڈپی) سایہ گستر ھے - سر پر شاھزادہ کي دستار ھے - پہلو میں مصحف (قرآن مجید) رکھا ھے - خوش عقیدہ سیاح کا بیان ھے کہ اس کے قتل کے لئے جس وقت لوگ اس کے سر پر پہونچے ھیں تو خسرو اپني شریعت کي اِسي کتاب کو پڑھ رھا تھا " -

لیکن آج کیا حالت ھے - ڈاکٹر بیني پرشاد لکھتے[2] ھیں " کہ دیکھنے والا وھاں پہونچ کر صرف ایک بڑی سی سادہ قبر پاتا ھے - آپ بھی جائیں اور درد انگیز و رقت خیز فارسی کتبہ کو پڑھ لیں " - یا اِتنا انتظار فرمائیں کہ آگے چل کر مقبول ھیچ مدان کا قلم مساعدت کرے اور ' ھندستانی ' کے انھیں قابل قدر صفحات پر مقبرہ کا ایک دھندلا سا خاکہ کھینچ سکے -

بد نصیب خسرو اور اسکی قبر کا مادي احترام کرنے والا اب کون ھو سکتا ھے - اس کا ماتم کرنے والي ' اس کے باپ دادا کي سلطنت مدت ھوئي مٹ چکي - اُمرا کے قصر و ایوان صفحۂ ھستي سے یک قلم معدوم و ناپید ھو چکے - کچھ

---

(۱) سیاحت نامہ ' جلد دوم ' صفحہ ۱۰۶ ۔

(۲) تاریخ جہانگیر ' صفحہ ۳۳۲ -

پرانی یادگاریں باقي هیں تو صرف مشائخ و فقرا کي - جنکی عظمت و استحکام کو بھي زمانہ کا زبردست هاتھہ رفتہ رفتہ مٹا رہا ہے -

اب خاک پہ هیں کل تخت پہ تھے
اک زیست کی حالت وہ بھي تھي

اللہ کي قدرت یہ بھي ہے اللہ کي قدرت وہ بھي تھي -

جلد باز انسان کا قلم اِس قدر جلد کہاں سے کہاں پہونچا - کہنا یہ تھا کہ جہانگیر اور اُس کے بیٹے پوتے کا زمانہ جس کو مورخ دولت مغلیہ کے شباب کا وقت بتاتے هیں دیگر اسلامی مزارات و مقابر کي طرح ' مقابر خسرو باغ کے لئے بھی اچھا گذرا - چمن کي گلکاریاں اور پھولوں کي روشیں صدیوں بعد کیا کہہ سکتي هیں - هم بھي تو سمجھتے تھے کہ شاهزادہ ایک خیابان دلکش یا بہشت بریں کے ٹکڑے میں دفن ہے - اُس کي یہ آرزو کہ

لطف آتے اسیري میں ' اے کاش قفس اپنا
پھولوں سے لدا هوتا ' پھولوں سے بھرا هوتا

بعد مرگ پوري هو گئی - لیکن حسرت ہے اور عبرت کہ اِس ازلي حرمان نصیب کی تربت اِس سے بھی محروم ہے - نہ وهاں پھولوں کي چادر ہے نہ کلیوں کا هار - بیدرد و سنگدل انسانوں کي مجوزہ ترتیب و تنظیم کے ساتھہ وهي پتھروں کا ڈھیر ہے اور بس -

اِس دستور کي مذهباً اصلیت و صحت سے بحث نہیں ' لیکن معمولاً ممتاز مسلمانوں کی قبر پر ' خواہ وہ امتیاز کسي گروہ و ملت کے پیشوا هونے کي حیثیت سے حاصل هو خواہ دنیوي وجاهت و مرتبت سے ' دو چیزیں ضرور هوتي هیں - ایک روشنی

دوسري خوشبو - مقبرہ کے چبوترے پر پہونچتے هي زائر و متزاور
کي نظر ایک سفید نویس سیاہ تختہ ' اور ملجملہ اُس کي متعدد
هدایات احترامي و ' انتظامي مجریہ و دستخطی حاکم ضلع کے '
پہلي هي دفعہ پر پڑتي ہے جس کے رو سے دیواروں کے طاقوں پر چراغ
جلانے کي ممانعت هے - رهي خوشبو - اگر کي بتیوں اور عطر
و عنبر کے مرکبات کی بجٹ میں غالباً کوئي مد نہیں - پھولوں
کا سلسلہ یوں قطع هو چکا -

پھول کیسے ' مومنوں کي قبر پر
خاک بھي تم سے نہ ڈالي جائیگي

کچھہ اوپر سو برس ہوئے - اس کي گئي گزري حالت میں
بشپ هیبر Bishop Heber الہ‌آباد آئے تھے - اپنوں کے جور و جفا کے
مظلوم و بے زبان فریادی یا اپني حوصلہ مندی و بلند همتي کے شکار
خسرو کي قبر کو دیکھا تھا - یہہ عظیم‌المرتبت واجب‌التقدیس سیاح
لکھتا[1] هے کہ " سرا سے ملحق ایک نذر غفلت باغ ہے - جسمیں عمدہ
قسم کے آموں کے پرانے درخت هیں - جس میں تین خوبصورت
مقبرے هیں - دو تو دو شاهزادوں پر اور ایک ' ایک شاهزادي پر '
بنائے گئے هیں جو شہنشاهي خاندان کے تھے - یہہ بڑے بڑے
بلند چبوتروں پر بنے هیں - ان کے نیچے تہہ خانے هیں - بیچ والے
میں عمدہ منبت کام کیا هے - قبر پتھر کي ' تابوت کي
طرح هے - اس کے اوپر ایک نہایت بلند مدور (گول) کمرہ سا
بنا هے - اس پر ایک گنبد سایہ کئے ہے - جس کے اندر
نہایت خوب و عمدہ رنگ آموزي کي گئی ہے - باهر کی طرف

---

(۱) هیبر صاحب کا جورنل ' جلد اول ' صفحہ ۴۴۳ -

اس سے بھی زیادہ خوشنما نقاشی ہے - یہہ سب نہایت پاکیزہ و سنجیدہ اور دل پر اثر ڈالنے والے ہیں - پرتکلف ہے مگر گل و گلزار یا زیبایشی و نمایشی نہیں - یہہ خیال جو عام طور پر انگلستان میں پھیلا ہوا ہے کہ مشرقی تعمیرات وحشیانہ اور بد مذاقی کا نمونہ ہوتی ہیں ' ان کو دیکھ کر غلط اور بالکل جھوٹ ثابت ہوتا ہے - "

ڈاکٹر بھولی پرشاد اس کی نسبت لکھتے[۱] ہیں کہ پورب طرف کو ' بالکل اُس موقع کے قریب جہاں میونسپلٹی کا واٹرورک کا کارخانہ ہے اور پانی صاف کرنے کے حوض بنے ہیں وہ ' خاص ' اور اُس باغ کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار ' سلطان خسرو کا مقبرہ ہے -

ان عمارات میں سے داھنی طرف کو پہلی ' بالکل اخیر ' پورب جانب ' خسرو کی دائمی خوابگاہ ہے - اور اس وقت مجھے اِسی قدر کہنا ہے کہ مقبرہ سنگین اور مستحکم ، گنبد دار ہے - اس پر نہایت خوب نقش و نگار ہیں -

قطعہ تاریخ وفات روضہ کے اندر گنبد کے قریب لکھا ہے -

آہ - افسوس آسماں را سہرت بیداد شد
آرے آرے کار چوں بر ظلم آمد داد شد
زندگی زد خیمہ بیروں از دیار خرمی
دید چوں بنیاد عالم را خراب آباد شد
اهل وآو باھی اند آگاہ از فلک کا حداث او
ہر کجا زد شعلۂ خاکسترش برباد شد

---

(۱) تاریخ جہانگیر ' صفحہ ۳۴۲ -

گلبنے هر جا که بهلي برگ ریز اندر پهست
بلبل ایں باغ بودن مصلحت از یاد شد
گلعذارے را طراوت چهست کا خرخار مرگ
از پئے چاک قبا صد سوزن فولاد شد
چوں بلب رام حدیثے را که مي سوزد بآه
مشکل است اما جهاں تا هست ایں معتاد شد
آں گل رعنا که بود آرائے گلشن صد دریغ
عندلیباں را برنگ و بوئے او دل شاد شد
چاک پیراهن شد از خار قضا در باغ عمر
هم زمیں بگریست هم از آسماں فریاد شد
شد قبا بر قامت مردم قبا در ما تمش
شاہ خسرو را بسوئے خلد چوں ارشاد شد
آں تن نازک که برَوے بود پیراهن گراں
در تہِ خاک جفا افسوس استعداد شد
شد غریقِ رحمت حق چوں ولیِّ پاک بود
خاصِ درگاہ خدا و همدم اوتاد شد
سلمي از شُد سال فوتش ,, فیض لایق '' بازگو
صفۂ جنت زجان پاک او آباد شد

کتبه سلطان سر هندي

مسترالیست وک ' مستر بیل اور مستر بیوریج نے اس' قطعه کو نقل کرکے هندوستان کی تاریخ پر احسان کیا هے - ورنه یه وہ جرم تها جسکے ارتکاب سے همارے فارسی مورخ محترز و گریزاں رهے تهے - ممکن تها که خسرو کی همدردي و ماتم پر جهانگیر و شاهجهاں کے عهد میں کچهه داروگیر هوجاتي ' لیکن ان کے بعد

پوچھنے والا کون تھا - " رہا اورنگ‌زیب - اُس نے تو خود خسرو اور اپنے دوسرے چچا پرویز کي بےگناهي اور اپنے باپ کي چشم عنایت کا ذکر ایک رقعہ[1] میں کیا ہے - مسٹر بیوریج نے اپنے همزبان دوستوں کي سہولت اور سمجھنے کے لئے اس قطعہ کا ترجمہ بھي کر دیا اور بعض اشعار و الفاظ پر حاشیہ (حسب ذیل نوٹ) لکھا[2] ہے -

۱—خرمي کے لفظ سے مسٹر برن خیال کرتے ھیں کہ یہہ شاهجہاں کي طرف اشارہ ہے ' جس کا نام خورم[3] تھا -

۲—شاید لفظ خسرو کي تلمیح ہے جسکے معني آفتاب کے ھیں - یہ وهي لفظ ہے جو Cyrus کہا جاتا ہے -

۳—بیل صاحب بجاے " اهل و آوباش " کے " اهل اوباش " لکھتے ھیں - اگر یہ صحیح ہے تو معني هوں‌گے " لوگ عام طور پر " -

۴—اوتاد - لغواً ' خیمے کي کھونٹیاں : :props

---

(۱) رقعات عالمگیر - جلد اول ' صفحہ ۲۲۲ - نمبر ۱۳۰/۷ مطبوعہ دارالمصنفین -

(۲) جورنل رایل ایشیاٹیک سوسائٹي لندن - جولائی ۱۹۰۷ع - صفحہ ۶۰۵ -

(۳) ان صاحبوں کي ذهانت ' بالغ نظري و نکتہ سنجي اس سے بھي زیادہ قابل احترام ہے - مولوي ذکاءاللہ اپني تاریخ هندوستان جلد هفتم میں سلطان خورم کي ولادت کے سلسلہ میں نقل فرماتے هیں کہ " ٹوڈ صاحب نے اس نام کي نسبت یہہ لکھا ہے کہ غالباً اصل میں وہ ' کورم ' تھا - جس کے معنے کچھوے کے هیں - جو اس کي رجپوتني ماں کي قوم کا نام تھا - یہہ قیاس اس سبب سے درست نہیں معلوم هوتا کہ مسلمانوں میں بیٹے کے نام میں ماں کي قوم کو کچھہ دخل نہیں هوتا - باپ دادا کا نام رکھا کرتے هیں - "

۵ـــ'' سلمی '' محبوبہ کے لیے ایک عام لفظ ہے اور شاید یہاں انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے - ایسٹوک صاحب اس کے معنے لیتے ہیں Askst thou - تاریخ فیض لایق سے ۱۰۳۱ھ (۱۶۲۲ع) برآمد ہوتا ہے - مصرع اخیر سے بھی یہی پایا جاتا ہے - خسرو ۲۴ امر داد ۹۹۵ یعنی ۴ اگست 1587 کو پیدا ہوا تھا - اور آخر جنوری ۱۶۲۲ میں فوت ہوا - مرنے کے وقت اس کی عمر ساڑھے چونتیس (۳۴½) سال رہی ہوگی - اس کی پیدایش کا تذکرہ اکبرنامہ جلد سوم میں صفحہ ۵۲۳ پر ہے - ''

مسٹر بیوریج کا علم و فضل مسلم ہے - میرے دل میں اُن کی بڑی عزت و وقعت ہے - مرحوم نے بھی اپنے ترجمہ مآثرالامرا میں اس ناچیز کو یاد کیا[1] ہے - تاہم اظہار حقیقت پر مجبور ہوں کہ اُن کی بعض تشریحات کی حقیقت لفظی باریک بینی یا نکتہ نوازی سے زیادہ میری سمجھہ میں نہیں آتی - مجھے تسلیم ہے کہ متعدد ' مطبوعہ و قلمی ' متداول نیز کمیاب ' تذکروں کی ورق گردانی سے اس عہد کے کسی شاعر کا نام سلمی نہیں ملتا ہے - یہہ بھی صحیح ہے کہ عرب و عجم میں یہہ کلمہ ہر معشوقہ کے لیے ' فرضی ہو یا حقیقی ' مستعمل ہوتا ہے - لیکن سلمی کی موشگافی کرکے ' سل ما ، askst thou '' اسئل انت '' کہنا کسی ترکیب سے صحیح نہیں ہوسکتا - سل بمعنی اسئل ضرور ہے اور قرآن حمید

---

(۱) جلد اول ' صفحہ ۵۷۳ - فٹ نوٹ بحوالہ ۳۰۵ - شائع کردہ ایشیاٹیک سوسائٹی بنگال - سنہ ۱۹۱۳ء -

میں بھي آیا ہے - لیکن مۓ یا ماَ کے معني کیا ہوں گے ؟
ان کا خیال صحیح ہو یا غلط ، مگر اِن کي کوشش و تلاش
قابل تحسین ضرور ہے -

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اس کتبہ کی آج بھي وھي حالت ہے جو مسٹر بیل نے تقریباً
ایک صدي اور مسٹر ڈیوھرسٹ نے چہارم صدي پیشتر دیکھي
تھي - ڈیوھرسٹ صاحب ہمارے صوبہ کے نامور سویلین (حال
وظیفہ یاب تقاعد) اور مشرقي زبانوں اور علوم کے فاضل متبحر
ھیں - پچیس چھبیس برس پہلے تعلقات حکومت کے سلسہ
میں الہ آباد وارد[1] تھے تو یہاں کے کتبوں پر بھي توجہہ فرمائي
تھي - لکھتے ھیں کہ " خود خسرو کی قبر پر طویل قطعہ
بارہ بیت کا ہے اور اچھي حالت میں ہے - بالکل صاف ہے
اور پڑھا جاتا ہے - البتہ چوتھي بیت کے شروع کے کچھہ لفظ
یعني " گلبنے ھر جا کہ " بالکل مٹ گئے ھیں - اُس کے
سوا پورا کتابہ ٹھیک اور مکمل ہے - " ممدوح نے وہ کتابت
یا ٹایپ کي چند غلطیاں[2] جو بیوریج صاحب کے مطبوعہ قطعہ
(مشمولۂ آرٹیکل) میں پائي جاتی تھیں ، ظاھر کردی تھیں -
تیسری سطر کے پہلے مصرع کي تصحیح کر دي تھي - پانچویں
میں خار بجائے خاک درست کر دیا تھا - اتفاق سے سنہ ۱۹۰۷
میں شاعر کا نام " معلمی " چھپ گیا تھا اس کو بھی ظاھر

---

(۱) جورنل رایل ایشیاٹیک سوسائٹي لندن ، جولائي سنہ ۱۹۰۹ ، صفحہ۷۳۹

(۲) جورنل رایل ایشیاٹیک سوسائٹي لندن ، جولائي سنہ ۱۹۰۹ ، صفحات
۷۳۹ و ۷۳۷ -

کر دیا تھا - نیز طریق املا یا بعض حروف کو ملا کر لکھنے پر توجہہ دلائي تھی جو اُس وقت (عہد شاھي) میں رائج تھا اور اس کتبہ میں نمایاں ھے - مثلاً '' عندلیبانرا '' بجاے '' عندلیبان را '' و '' دلشاد '' بجاے '' دل شاد '' و '' لایق '' بجاے '' لائق '' - کتبہ کی عبارت کا پچھم یعنی کعبہ کي طرف[1] سے شروع کیا جانا یہ بھي آپ ھي کي نظر دقیقہ‌رس کا اِدراک اور نکتہ نواز قلم کا التماس تھا -

دو کلموں کو ملا کر لکھنے سے نسخ و نستعلیق میں خواہ کتنی ھی دلکشي و نظر فریبی پیدا ھوجاتي ھو ' مگر پڑھتے وقت نگاہ کو اُلجھن ضرور ھوتي ھے - یہہ آج کی بات نہیں - ایک صدي پیشتر مسٹر فرنسیس بیلفور (F. C. Belfour) نے یہی شکایت کی تھي - انہوں نے جب سنہ ۱۸۳۱ میں شیخ علي ' حزین کے خود نوشت احوال کو مدون و مرتب کرکے لندن میں بڑے اهتمام سے فارسی ٹائپ میں چھپوایا ' تو ایک مستقل مقالہ ' انگریزی میں ' '' اعلام '' (Advertisement) کے نام سے لکھا[2] تھا - اور معذرت کی تھی کہ دو دو لفظوں کا یکجا لکھنا (مثلاً آنشہر ' یکسال ' وغیرہ) فارسي کتابت اور قلمي کتابوں میں ھمیشہ سے چلا آتا ھے - جن کا جدا کرنا کسی شخص ' خصوصاً اهل مطبع کے لیے دشواري سے خالي نہیں -

---

(۱) جورنل رایل ایشیاٹیک سوسائٹي لندن ' جولائی سنہ ۱۹۰۹ ' صفحہ ۷۳۸

(۲) صفحہ ۳ -

حالات جلال

(حضرت آرزو لکھنوي جانشین جلال)

نام و خاندان
ولادت و وفات
وطن و تعلیم

میر ضامن علي نام اور جلال تخلص تھا ۔ حکیم میر اصغر علي صاحب کے بڑے بیٹے اور بہ اعتبار نسب سید رضوي تھے ۔ سنہ ۱۲۴۳ هجري میں پیدا هوئے اور اسی برس کے هو کر سنہ ۱۳۲۴ هجري میں انتقال کیا ۔ کربلاے تالکٹورہ لکھنؤ میں دفن هوئے ۔ سنہ وفات ذیل کے مصرع سے نکلتا هے :—

میر ضامن علي جلال آہ آہ

یہ تاریخي مصرع بھی شعرا میں مصرع طرح بن گیا ۔ کئي شاعروں نے یهی ایک مصرع نکالا اور قطعہ کرکے کمال مرحوم کے آگے پیش کیا ۔ ایک تاریخ میں نے بھي کہي تھی جو درج ذیل هے ۔

چو استادم کہ بد فردوسي هند
بہ تعلیم روح انوري رفت
نوشتم آرزو تاریخ رحلت
بہار گل ز باغ شاعري رفت

حضرت جلال کے بزرگ لکھنؤ کے محلہ ڈالي گنج یار میں رهتے تھے ؛ یہ بھی وهیں پیدا هوئے لیکن رامپور سے آنے کے بعد انہوں نے ملصورنگر میں قیام کیا اور وهیں سے کوچ کر کے دارالبقا کو گئے ۔

جلال کی با قاعدہ تعلیم عربی میں میبذی تک تھی مگر مطالعہ بہت وسیع تھا - رام پور کے کتب خانے کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو پڑھ نہ ڈالی ہو - یہاں تک کتابیں دیکھیں کہ آخر آنکھوں میں ناسور پڑ گئے -

جناب جلال کا آبائی پیشہ طبابت تھا - اُنھوں نے بھی طب پڑھی تھی - کچھ دنوں محلہ سوائے معالجخاں میں آفتاب‌الدولہ بہادر قلق کے مکان میں مطب بھی کیا تھا - مگر جب شاعری ذریعۂ معاش بن گئی تو طبابت ترک کر کے پوری توجہ شاعری کی طرف مبذول کردی - وہ طبیب بھی اِس پائے کے تھے کہ باوجود ترک فن کے بعض مریض آکر پریشان کرتے تھے اور بغیر نسخہ لکھوائے کسی طرح نہ ٹلتے تھے - اِسی بنا پر حضرت جلال اپنے جاننے والوں میں حکیم صاحب کے نام سے ذکر کیے جاتے تھے -

ابتدائے شاعری

حکیم صاحب امیر علی خاں ہلال کے شاگرد ہوئے اور اُنھیں کے تخلص کا ہموزن و ہم‌قافیہ تخلص جلال اختیار کیا - ہلال چند ہی روز میں ہونہار شاگرد کے کلام کی اصلاح سے عاجز ہو گئے - آخر ساتھ لے کر اپنے استاد میر علی اوسط رشک کے پاس پہنچے اور شاگرد کو استاد کے سپرد کر آئے -

رشک علم و تحقیق میں دوسرے ناسخ سمجھے جاتے تھے - اُن کی شاگردی نے جلال کی مذاقِ خیال ' مشقِ شعر سے تحصیلِ فن اور تحقیق مسائل کی طرف پھیر دی - جب رشک

زیارات عتبات عالیات کو گئے[1] اور وهیں کے هو رهے - تو جلال نواب فتح‌الدوله برق سے اصلاح لینے لگے -

برق بھی شیخ ناسخ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے - حکیم صاحب کو اُن کی شاگردی سے بھی بہت کچھ فائدہ پہونچا که زمانے نے پھر پلٹا کھایا اور نواب فتح‌الدوله برق بھی ' مغرول شاہ اودہ کے همراہ رکاب مٹیا بُرج چلے گئے اور کچھ دن بعد وهیں انتقال کر گئے - مگر اب حکیم صاحب خود اُستاد هو چکے تھے - دو محققوں کی تحقیقات کا خزانه اُن کے قبضهٔ اقتدار میں آچکا تھا اور قوت اجتہادی پیدا هو چکی تھی -

بزرگ داشت

ایک مرتبه کسی مشاعرے میں جلال بھی گئے تھے اور میاں هلال بھی تھے ' مگر جب غزل پڑھنے کا وقت آیا تو هلال نے نہایت عاجزی کے ساتھ حکیم صاحب سے کہا که '' میں آپ کے سامنے کیا پڑھوں '' مطلب یه تھا که میری جرأت نہیں هوتی که آپ کے سامنے منه کھولوں - اُس وقت حکیم صاحب نے کہا '' آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے هیں '

---

(۱) میر علی اوسط رشک کی روانگی سے متعلق حسب ذیل قطعهٔ تاریخ حضرت جلال نے کہا :—

قنسیو ' شاہِ شہیداں کے مزارِ پاک کا
قصد فرماتے هیں دیکھو قبله و کعبه مرے
پوچھ کر تاریخ هاتف سے پکار اُٹھا جلال
کربلا جاتے هیں دیکھو قبله و کعبه مرے

سنه ۱۲۶۷ هجری

میں وہي ہوں جس نے آپ کے سامنے بارہا بغرض اصلاح اپنا کلام پیش کیا ہے "۔ اِس واقعے سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جلال بہت تھوڑے زمانے میں اپنے استاد سے اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ وہ اُن کے سامنے کچھ پڑھتے ہوئے جھجھکتے تھے ۔ ساتھ ہي ساتھ اِس برتاؤ سے جو اُنھوں نے اپنے اُستاد سے برتا جلال کي شریفانہ سیرت کا بھي پتا ملتا ہے ۔

ریاست رام‌پور سے وابستگي

سنہ ۵۷ کے غدر کے بعد جو تباھي لکھنؤ پر آئي اُس کي داستان بہت عبرت انگیز ہے ۔ سیکڑوں آدمی ، معزول بادشاہ کے ساتھ چلے گئے ۔ ہزاروں خانماں برباد ہو کر غریب‌الوطن ہو گئے ۔ بہتیرے باوضع گھروں میں کنڈیاں بند کر کر کے مر گئے اور اپني بد حالي کسي پر ظاہر نہ ہونے دي ۔ بعض اہل کمال کو دربار رامپور نے اپنے ظل عاطفت میں لے لیا حکیم صاحب کے والد میر اصغر علي صاحب بھي اُنھیں وابستگان دولت میں سے تھے ۔ وہ طبیب بھي تھے اور داستان‌گو بھي ؛ مگر داستان‌گوئي میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے ۔ منشي احمد حسین قمر مصنف " طلسم ہوشربا " کو اِنھیں سے شرف تلمذ حاصل تھا ۔ میر اصغر علی صاحب اِسی سلسلے سے نواب محمد یوسف علي خاں بہادر والی رام‌پور کے دربار میں پہنچے تھے اور ملازم ہو گئے تھے ۔

ایک روز داستان کہنے میں کسی خاص موقع پر جو اشعار[۱] مہر صاحب نے پڑھے وہ نواب صاحب کو بہت پسند آئے - پوچھا یہ اشعار کس کے ہیں - انہوں نے کہا میرے بڑے لڑکے جلال کے ہیں - نواب صاحب نے اُسی وقت طلب کر لیا - حکیم صاحب وہاں پہنچتے ہی پچاس روپئے ماہوار پر ملازم ہوگئے -

نواب یوسف علی خاں کا زمانہ

اب جلال کو ایک قدرداں بھی ملا اور اطمینان کی زندگی بھی نصیب ہوئی ' پھر جو دل کا شوق وہی معاش کا ذریعہ ' ترقی کے زینے طے ہونے

---

(۱) اشعار حسب ذیل ہیں :—

وہ گوندھی یار کی مشاطہ نے پری چوٹی
کہ صدقے کرتی ہے جس پر ہر اک پری چوٹی
نہ بھٹکے پر دل سودا زدہ کبھی اِتنا
کرے جو کوچۂ کاکل کی رہبری چوٹی
جو پرورش دل عشاق کی ہے مد نظر
تو ہو دراز پے سایہ گستری چوٹی
لگائے میرے دلِ مبتلا کو اک کوڑا
ضرور دے اِسے تعزیر خود سری چوٹی
جو بال کھلتے ہیں اُن کے مہکتی ہیں گلیاں
کہ مشک نافہ ہے جوڑا تو عنبری چوٹی
مگر کوئی چمن آرا ہے تیری مشاطہ
بنا دے سنبل گلزار دلبری چوٹی
جلال دیکھے کبھی شانۂ دلِ صد چاک
نکل کے ایک کی چوٹی سے دوسری چوٹی

لگے اور معراج کمال کی آخری منزل تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا اور انجام میں کامیاب ہوئے -

ایک روز نواب صاحب نے فرمایش کی کہ کوئی ایسا قصیدہ کہیے جس میں کوئی حرف ایسا بھی نہ کرنے پڑے جس کا گرنا شعرا نے جائز سمجھا ہے - حکیم صاحب نے یہ قصیدہ نظم کرکے سنایا :—

ہے شگفتہ ہر چمن ' وہ رنگ لائی ہے بہار
جوش گُل بے انتہا ' مرغان گلشن بے شمار

جو شجر ہے باغ کا ' وہ کر رہا ہے شکر حق
خاک پر ہر شاخ ' سجدے کر رہی ہے بار[1] بار

قہقہہ زن کبک ہے ' طاؤس گلشن مست ناز
رقص کن اک سو صبا ' نغمہ سرا اک سو ہزار

زلف عنبر فام کے مانند سنبل مشک بیز
سرخی رخسار گل مانند روے گلعذار

ہو گئی ہے اس قدر بارد ہوا گلزار کی
سرو جس کے برد سے ہر وقت رہتا ہے چنار

کیا قدم ان کو مبارک فصل گلشن کا ہوا
بار اب کی بار لائے سروہاے جوے بار

ہو چکی ہے جمع گو سب انجمن گلزار کی
چشم نرگس پر کسی کا کر رہی ہے انتظار

---

(۱) یہ کلام ابتدائی ہے - حضرت جلال نے بعد میں لفظ پر " مگر " کے معنی میں کبھی استعمال نہیں کیا -

سب طرح کے گل شگفتہ فصل گلشن نے کیے
اور ھي گل کے لیے بلبل مگر ھے بیقرار

مطلع دیگر

کون ' وہ گل زندگاني چمن کي جو بہار
شکل سبزہ فیض سے جس کے ھرا ھے روزگار
ابر لطف و بحر جود و مکرمت ' دریاے فیض
پاک دل ' روشن گُہر ' والا نسب ' عالي تبار
عرش عز و جاہ ' شاھنشاہ ' عالم کی پناہ
جم حشم ' یوسف علي خانِ امیرِ ذي وقار
بے تکلف لوگ بنواتے جواھر کے محل
واقعی ھوتے اگر زر بخش ایسے تین چار
بحر کا دامن لبالب ' سیپ کا مملو دھن
بن گیا نیسان رحمت دستِ مروارید بار
کر دیا قطرات شبنم کو ' گُہر دے کر ' غني
زر دیا اتنا ھوئے تُلہاے گلشن مالدار

قطعہ

اِس طرح کا شخص ' عالي حوصلہ ' ھمت بلند
چشم مہر و ماہ سے ' گذرا نہ ھوگا زینہار
ماہ کو ھر رات کرتا ھے عنایت تاجِ سیم
بخشتا ھے مہر کو ھر روز شملہ زر نگار
اِس دعا پر ختم کر اب تو قصیدے کو جلال
دے شفا کامل مرے نواب کو پروردگار

نواب صاحب نے بہت تعریف کی اور فرمایا کہ میں اِس قصیدے کو جواہر میں تولونگا ۔ مگر جلال کے نصیب نے جہاں ترقی کمال کے واسطے میدان وسیع دے دیا تھا وہاں مالی منفعت کے لیے اِک تنگ دائرہ کھینچ دیا تھا - دفعۃً نواب صاحب کی عالت نے طول کھینچا ' حکیم صاحب کو قصیدے کا صلہ نہ ملا اور نواب صاحب ارتقال کرگئے -

حضرت جلال نے نواب صاحب موصوف کے انتقال پر یہ قطعۂ تاریخ کہا :—

آں مغفرت مآب زہستی نمود کوچ
روئے بہ کاروانِ عدم دادہ یوسفے
گفتہ جلال مصرعِ تاریخ رحلتش
در چاہ قبر حیف بیفتادہ یوسفے

سنہ ۱۲۸۱ھ

نواب کلب علی خاں کا عہد

نواب یوسف علی خاں صاحب کے بعد اُن کے فرزند ارجمند نواب کلب علی خاں بہادر تخت نشین ہوئے - جلال اپنی جگہ برقرار رہے اور مسند نشینی کے متعلق ایک قصیدہ اور متعدد تاریخیں کہیں - طول بیمحل کے خیال سے یہاں صرف ایک قطعہ لکھا جاتا ہے :—

گشت چوں کلب علی خان بہادر بجہاں
صاحب طالع اسکندر و ہمرتبۂ جم
مصرعِ سالِ جلوسش چہ رقم ساخت جلال
جلوہ فرمودہ سرِ مسندِ اقبال و حشم

سنہ ۱۲۸۱ھ

اِس عہد میں دربار رامپور کملائے فن سے بھر گیا - جو موجود تھے وہ تو تھے ہی ' جو نہیں تھے وہ بھي پہنچ گئے - منشی مظفر علي خاں اسیر تو نواب مرحوم کے اُستاد اور اُسي وقت سے وظیفہ خوار تھے - منشي امیر احمد صاحب امیر عبدۂ قضا پر مامور ہوئے ' اور اُستادي کے خلعت سے بھی سرفراز ہوئے - نواب مرزا خاں صاحب داغ داروغۂ اصطبل مقرر ہوئے - علاوہ اِن کے مفتي سعداللہ صاحب شارح معیارالشعار ' آفتاب‌الدولہ قلق ' امداد علي بحر اور نواب احمد حسن خاں عروج ایسے باکمالوں سے دربار معدنِ علم و ادب ہوگیا - مرزا غالب بھی دربار کے وظیفہ خوار تھے اور کبھي کبھی آیا کرتے تھے -

مرزا نوشہ سے جلال کي ملاقات

ایک مرتبہ حکیم صاحب مرزا سے ملنے گئے - مرزا اُس وقت شراب نوشي میں مصروف تھے ایک جام حکیم صاحب کے سامنے بھي پیش کیا - اُنھوں نے کہا " میں نہیں پیتا ہوں " - مرزا نے آسمان کي طرف دیکھ کر کہا " آج تو ابر ہے " جلال نے پھر انکار کیا - غالب نے کہا " ابر بھی ہے اور سردي بھي ہے " - آخر جلال نے جھلا کے کہا " میں حرام جانتا ہوں " - اُس وقت غالب مسکرائے ' اور بولے کہ " پھر یہ شعر آپ نے کیونکر کہا :—

رات مے خوب سی پي صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ھاتھ سے جنت نہ گئي "

دربار میں وقعت کي بحث

دربار میں آئے دن مشاعرے اور مناظرے ہوا کرتے تھے ؛ حکیم صاحب کسي بات میں دخل کم دیتے تھے اور اگر بولنے پر مجبور ہوتے تھے تو اکثر

اُنھیں کی بات بالا رھتی تھی - ایسی ھنگامہ آرائیاں بہت ھوئیں - سب کے لکھنے میں طوالت ھے ؛ بعض خاص خاص واقعات درج کیے جاتے ھیں :—

نواب کلب علی خاں صرف شاعروں کے قدرداں ھی نہ تھے بلکہ خود بھی پختہ کار شاعر تھے - ایک مرتبہ کا ذکر ھے کہ نواب صاحب نے دربار میں اپنی ایک نو تصنیف غزل پڑھی ، جس کا مطلع یہ تھا :—

دیکھ کر رنگ اُس کی قامت کے
ھوش اُڑ جائیں گے قیامت کے

مطلع پر واہ واہ ، سبحان اللہ کی آوازیں بلند ھوئیں مگر حکیم صاحب اپنی جگہ خاموش بیٹھے رھے - نواب صاحب کی نظر یوں تو سبھی پر رھتی تھی مگر حکیم صاحب کی طرف خاص طور پر توجہ رکھتے تھے - جب غزل پڑھ چکے تو پوچھا کہ کیوں میاں حلال تم نے اور اشعار کی تو تعریف کی مگر مطلع پر کچھ نہ بولے - انھوں نے عرض کی "تمام دربار تعریفیں کر رھا ھے ، ایک میری تعریف کیا چیز ھے" - نواب صاحب نے فرمایا "تمھیں بھی تو اچھا برا کچھ کہنا چاھیے تھا" عرض کیا "سبحان اللہ ، کلام الملوک ملوک الکلام" - نواب صاحب اُن کی ادائیں خوب پہچانتے تھے ، فرمانے لگے "صاف صاف کہو ، یہ کلام الملوک اور ملوک الکلام سننا میں نہیں چاھتا" - اُس وقت حکیم صاحب ضبط نہ کر سکے اور صاف صاف کہدیا کہ "جس مطلع کے قافیے ھی غلط ھیں ، میں اُس کی تعریف کیا کروں" - اس پر اھل دربار انگشت بدنداں

ہوگئے اور نواب صاحب نے تیور بدل کر پوچھا " کیا غلطی ہے ؟ " حکیم صاحب نے فرمایا " حضور نے مطلع میں روی کے ساتھ تاسیس و دخیل کا التزام کیا ہے اور اشعار میں اس کی پابندی نہیں کی ' یہ درست نہیں ہے " - نواب صاحب نے پوچھا " کیا کسی مستند شاعر نے ایسا نہیں کیا ہے ؟ " حکیم صاحب نے فرمایا " ہرگز نہیں ' ہر مستند شاعر مطلع کا منشا جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیے کا اختیار کرنا اس امر کا اظہار ہے کہ کن کن حروف کی پابندی اختیار کی گئی ہے " - نواب صاحب دوسرے شعرا کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا " کیا یہ اعتراض درست ہے ؟ " سوا بحر کے سب نے کہ دیا کہ " حضور یہ یونہیں کہا کرتے ہیں ' جس طرح حضور نے فرمایا ہے بالکل درست ہے " - نواب صاحب نے فرمایا " یہ اعتراض کا جواب نہیں ہے ! مثال پیش کرو " - تمام اساتذہ کے دواوین اولٹ پلٹ کر ڈالے گئے مگر مثال نہ نکلنا تھی نہ نکلی -

صاحبزادہ چھٹن صاحب کا مشاعرہ اور داغ و جلال کے مصرعے

نواب صاحب کے داماد صاحبزادہ چھٹن صاحب کے یہاں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا - محمد شاہ‌خاں جو باڈی گارڈ کے ایک معزز عہدہ‌دار اور حکیم صاحب کے جاں‌نثار شاگرد تھے آکر کہنے لگے کہ " شاگردان داغ نے آپس میں طے کیا ہے کہ آپ کی غزل پر تعریف نہ کریں " - حکیم صاحب نے فرمایا " یہ حالت ہے تو مشاعرے میں جانا بےسود ہے - " محمد شاہ‌خاں نے کہا " نہیں مشاعرے میں تو ضرور تشریف لے چلیے - جیسا کچھ ہوگا دیکھا

جائیگا '' - حکیم صاحب نے اُن کے تیور بد دیکھ کر فرمایا
کہ '' نہیں میں مشاعرے میں نہ جاؤنگا '' - محمد شاہ خاں
نے کہا '' کب تک نہ جائیے گا ؟ '' حکیم صاحب کچھ سوچے
اور فرمایا '' میں اس شرط سے چلتا ہوں کہ تم لوگ داغ
کي غزل پر خاموش نہ رہنا ' رہي میری غزل تو اگر اُس
میں کچھ خوبی ہوگي تو دشمن بھي داد دیگا '' -

غرضکہ مشاعرے کا دن آیا اور حکیم صاحب مشاعرے میں
گئے - نشست کي حالت سے یہ بھي پتا چلتا ہے کہ شعرا
کے بیٹھنے کے لیے کوئي ترتیب مقرر نہ تھي ' جو جہاں بیٹھ
گیا وہاں بیٹھ گیا - اس مشاعرے میں جہاں داغ بیٹھے تھے
وہاں اُن کے قریب کوئی برابر کا شاعر نہ تھا - کئي آدمیوں
کے بعد حکیم صاحب بیٹھے تھے اور اسیطرح حکیم صاحب کے
بعد بھی دو ایک آدمي اور تھے اور اُن کے بعد منشي امیر احمد
صاحب تشریف رکھتے تھے - جس وقت داغ پڑھے خوب رنگ
ہوا مگر جب حکیم صاحب کی باری آئي تو دو تین شعر تک
وہي آثار ظاہر تھے جن کي خبر پہلے مل چکی تھي - اثنائے
خوانندگي میں حکیم صاحب نے داغ سے فرمایا کہ '' میرا ایک
مصرع آپ سے لڑ گیا ہے ' اس لیے میں اس شعر کو ترک کرتا
ہوں '' - داغ نے اصرار کیا کہ '' نہیں ضرور پڑھیے '' - اور لوگوں
نے بھي ہاں میں ہاں ملائی کہ دیکھیں انہوں نے کیسا مصرع
لگایا ہے - داغ کا شعر تھا :-

یہ تري چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال برا ' ایک کا حال اچھا ہے

حکیم صاحب نے پڑھا :—

دل مرا ' آنکھ تری ' دونوں ہیں بیمار ؛ مگر
ایک کا حال برا ' ایک کا حال اچھا ہے

شعر پڑھنا تھا کہ مشاعرے میں ہنگامہ مچ گیا - تعریف نہ کرنے کا بندھا ہوا عہد ٹوٹ گیا اور سب تعریفیں کرنے لگے ۔ صاحبزادہ چھتن صاحب نے یہ کہہ کر داد دی کہ " داغ کے مصرع میں ابہام رہ گیا اور آپ نے صاف کر دیا کہ کس کا حال برا اور کس کا حال اچھا ہے " -

کلام کا اثر

حکیم صاحب کے کلام سے لوگ اِسی طرح متاثر ہوتے تھے - ایک واقعہ اور ملاحظہ ہو - دوسرا دیوان " کرشمہ‌گاہ سخن " مرتب ہو چکا تھا اور صاف کرنے کے لیے کاتب کے سپرد کیا گیا تھا - کاتب صاحب صوفی منش تھے - جیسے ہی اِس شعر پر پہونچے :—

وہ آنکھ ہی نہیں اُن کو ملی کہ حضرت شیخ
بتوں میں قدرت پروردگار دیکھیں گے

ایک نعرہ مارا اور سجدے میں جاکر بیہوش ہو گئے - حکیم صاحب اندر تھے - اِس آواز پر گھبرا کے باہر آئے - کاتب صاحب کا یہ حال دیکھ کر اور گھبرائے - ہوشیار کر کے حال پوچھا تو اُنھوں نے کہا کہ آپ کے اس شعر نے مجھے بے اختیار کر دیا -

لفظ " زرا " کا املا

لفظ " زرا " کا املا پہلے " ذال " سے تھا - حکیم صاحب نے " زے " سے لکھنا شروع کیا - عرصے کے بعد لوگوں نے اِسی کو صحیح مانا -

مجھ سے خود ریاض احمد صاحب ریاض خیرآبادي نے ایک دن بیان کیا کہ " زرا " کو " زے " سے لکھنے کی ابتدا تمہارے اُستاد نے کي اور پندرہ برس بعد منشي امیر احمد صاحب نے بھی اِس لفظ کو " زے " سے لکھنے کي اپنے شاگردوں کو ہدایت کی " -

جلال کی خود داری اور نواب کی قدردانی

جلال ایک خود دار بزرگ تھے - اپنے فن کي عزت تاج کی عزت سے زیادہ جانتے تھے - نواب کلب علی خاں لاکھ منصف مزاج تھے پھر بھی والی ملک تھے - راج ہٹ مشہور ہے - بارہا جلال سے بگڑي ' اکثر تو جلال خود ہی بگڑ کر لکھنو چلے آئے اور پھر بلائے گئے - مگر ایک مرتبہ خود نواب صاحب نے بگڑ کر کہا کہ " نکل جاؤ میرے ملک سے " - بھلا اب جلال کہاں ٹھہرنے والے تھے - بستر باندھا اور چل کھڑے ہوئے - مگر نواب صاحب بعد کو پشیمان ہوئے اور حکم صادر کر دیا کہ جلال جانے نہ پائیں - جس وقت حکیم صاحب ناکے پر پہنچے تو روکے گئے اور کہا گیا کہ آپ کے جانے کی اجازت نہیں ہے - حکیم صاحب کو پھر پلٹنا پڑا - دربار میں پہنچ کر شکایت کي کہ " آپ نہ مجھے رہنے دیتے ہیں نہ جانے دیتے ہیں " - نواب صاحب نے کہا " ہماري زندگي بھر کہاں جاؤ گے - یہ شعر و شاعری کے جھگڑے تو رہا ہي کرتے ہیں اور اِنہیں جھگڑوں میں لطف ہے " -

غرورِ ذاتي

ایک مرتبہ حکیم صاحب لکھنو آئے ہوئے تھے کہ نواب صاحب کا خط آیا جس میں ایک غزل بھي تھی - نواب صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ میں نے اِس

غزل میں کوئی الف ہلدی کا بھی نہیں گرایا ہے - جلال نے ایک غزل نو شعر کی کہی اور اُس میں یہ التزام کیا کہ کوئی حرف حروف علت میں سے نہ گرنے پائے اور ایک شعر میں تسکینِ اوسط اِس طریقے سے لائے کہ بغیر تسکین کے پڑھو تو " ی " گرتی تھی اور تسکین کے ساتھ پڑھو تو نہیں گرتی تھی - غزل تلاش کرنے پر بھی نہ ملی مگر وہ صورت ذہن میں ہے جسے میں ایک شعر میں نظم کر کے بغرض وضاحت پیش کیے دیتا ہوں :—

اللہ رے اضطراب خاطر بیخوف ہوں اور لرز رہا ہوں
مفعولن فاعلن فعولن مفعول مفاعلن فعولن

حکیم صاحب نے غزل بھیج دی اور لکھ دیا کہ میں نے اس میں الف ' واو ' ی ' کوئی حرف نہیں گرایا ہے - خط دربار میں کھلا اور پڑھا گیا - اُسی آخری شعر پر لوگ بیساختہ کہہ اُٹھے کہ " ی " گر گئی - نواب صاحب نے کہا " پھر غور کر لیا جائے " بعد غور و خوض کے یہی طے پایا کہ " ی " گرتی ہے - میاں بحر عروض دانی میں مشہور تھے اور یہی خصوصیت اُنہیں دربار رام پور میں لے گئی تھی ورنہ استعداد علمی معمولی تھی - نواب صاحب بحر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا " تم کیا کہتے ہو؟ " بحر نے کہا " خداوند نعمت " ی " گرتی ہوئی تو ضرور معلوم ہوتی ہے مگر جلال کا دعویٰ ہے اسلیے تامل ہوتا ہے " - مگر وہاں نقارخانے میں طوطی کی آواز کیا وقعت رکھتی تھی - ان کے قول کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور زور شور کے ساتھ جلال کے نام خط لکھا گیا کہ تم اسی

منھ پر استادی کا دعویٰ کرتے ہو کہ نو شعر کی غزل میں تین حرفوں کے اسقاط سے بچنے کا دعویٰ کیا مگر بچ نہ سکے اور آخری شعر میں '' ی '' گرا گئے !

جس وقت یہ خط حکیم صاحب کو ملا تو اچھل پڑے کہ وار چل گیا اور جواب میں تحریر کیا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ حضور کا دربار کملاے فن سے معمور ہے ' مگر یہ غزل بھیج کر واضح ہوگیا کہ کسی کو موزوں پڑھنا بھی نہیں آتا - یہ جواب کس شوق سے سر دربار پڑھا گیا ہوگا اور اس کے سننے کے بعد لوگوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی اسے خود سمجھ لیجیے - مگر اس وقت بحر کی بن پڑی اور کہنے لگے کہ حضور میں نے کیا عرض کیا تھا - جواب لکھنے میں جلدی کی گئی جس سے سب کی عزت اور اعتبار پر حرف آیا -

اس واقعے کے بعد پھر حضرت جلال طلب نہیں کیے گئے -

حکیم صاحب جب آخری مرتبہ نواب صاحب سے ریاست منگرول سے وابستگی خفا ہوکر لکھنؤ آئے تو جہاں وطن میں آنے کی خوشی تھی وہاں سلسلۂ معاش منقطع ہونے کا رنج بھی تھا - مگر خدا تو بڑا مسبب الاسباب ہے - حسب اتفاق اُسی زمانے میں تذکرۂ ضیغم کے نام سے حالات شعرا میں ایک کتاب دکن سے شایع ہوئی - یہ کتاب نواب شیخ حسین میاں والی منگرول کے ملاحظے سے بھی گزری - کتاب میں جلال کے حالات بھی مع نمونۂ کلام درج تھے - نواب صاحب نے شیخ محمد عمر جلون سے ارشاد کیا کہ یہ شخص قابل قدر ہے - نواب صاحب کے ایما سے خط لکھا گیا اور ۱۳۰۳ ہجری میں حکیم صاحب دربار منگرول میں پہنچے -

یہاں سے روانگی کے وقت تار دیدیا گیا تھا - جب معلوم ہوا کہ حکیم صاحب فلاں گاڑی سے پہنچینگے تو محمد عمر صاحب جلوں جو نواب صاحب کے میر منشی (پرائیویٹ سکریٹری) ہونے کے علاوہ وکیل سرکار بھی تھے ' چند اور ارکان دولت کو ساتھ لیکر استقبال کے لیے گئے - حکیم صاحب اس اعزاز و احترام کے ساتھ دربار میں پہنچے - اور نواب صاحب کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا اسی وقت خلعت سے سرفراز ہوئے - ایک سو پچیس روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا ' سرکاری مکان رہنے کو ملا اور دو آدمی خدمت پر مامور ہو گئے -

متروک الفاظ کا دیوان سے اخراج

وہاں کے حالات بھی مفید و دلچسپ ہیں مگر اختصار کے خیال سے صرف چند لکھے جاتے ہیں - ایک روز نواب صاحب نے فرمایا کہ آپ نے جن الفاظ کو بعد میں ترک کیا ہے اور پہلے ' دوسرے دیوان میں وہ لفظیں موجود ہیں ' میں چاہتا ہوں کہ انہیں بھی اپنے کلام سے نکال دیجیے - حکیم صاحب نے دونوں دیوانوں سے وہ الفاظ نکال دیے - مگر یہ سرکاری دیوان تھے اور وہیں رہے - عام طور پر جو دیوان لوگوں کے پاس ہیں وہ اسی طرح ہیں جس طرح چھپے تھے -

ایک اتفاق

جب نواب صاحب ہوا خوری کو نکلتے تھے تو حکیم صاحب کی قیامگاہ پر پہلے تشریف لاتے تھے اور اپنے ساتھ گاڑی پر بٹھا کر ہوا خوری کو لے جایا کرتے تھے ایک مرتبہ عجیب اتفاق ہوا ایک تنگ راستے پر کچھ پتھر پڑے ہوئے تھے - گاڑی وان نے وہاں گاڑی موڑنا چاہی - گاڑی مڑی

تو مگر اُسکے کڑّے ٹوٹ گئے - گھوڑے عربی تھے فوراً رک گئے - ملازموں نے نواب صاحب کو اُتارنا چاہا - فرمایا " پہلے حکیم صاحب کو اُتارو کہ ضعیف آدمی ھیں " - آخر جب حکیم صاحب کو اُتروا لیا تو خود گاڑی سے اُترے - اُسی وقت دوکانداروں نے اٹھکر چونیاں ' اٹھنیاں نچھاور کرنا شروع کیں اور فوراً ایک بزاز نے نہایت عمدہ قالین نکالکر بچھا دیا -

حکیم صاحب تو گاہ گاہ یاد فرمانے پر دربار میں جایا کرتے تھے مگر حکیم صاحب کے داماد میر محمد نظیر صاحب مقال بلاناغہ حاضر دربار رھتے تھے - محرم کا زمانہ تھا نواب صاحب اپنے یہاں کی مجلس میں کبھی کبھی خود بھی مرثیہ پڑھا کرتے تھے - حسب اتفاق جو مرثیہ پڑھنے والے تھے اُس میں گھوڑے کی تعریف کے چار مصرعے تو رہ گئے ' اور بیت کاغذ نچ جانے سے غائب ھوگئی - نواب صاحب نے مقال سے کہا " اِس کی بیت حکیم صاحب سے کہلوا لائیے " - اُنھوں نے کہا " وہ مرثیہ کہنا نہیں جانتے " - نواب صاحب نے فرمایا " وہ سب کچھ جانتے ھیں - آپ جا کے کہیے وہ ابھی کہدینگے " -

مرثیہ کی بیت

میر محمد نظیر صاحب جناب جلال کے پاس آئے اور نواب صاحب کی فرمایش بیان کی - حکیم صاحب نے چاروں مصرعے پڑھوا کر سنے اور فوراً یہ بیت کہ کر لکھوادی -

طاؤس کی ھے چال ' چلن کبک دری کا
آھو کا چھلاوا ھے ' جھمکڑا ھے پری کا

جس وقت نواب صاحب نے یہ بیت دیکھی پھوک گئے اور میر محمد نظیر سے کہا کہ " دیکھا آپ نے ' اب کوئی سمجھ سکتا ھے کہ یہ بیت علحدہ سے کہی گئی ھے یا خود مصنف کی کہی ھوئی ھے ؟"

پنڈت پیم نرائن کانپور کے باشندے اور اچھے

پنڈت پیم نرائن کے ساتھ مروت کا برتاو

شاعر تھے - اُنھوں نے ایک مثنوی کہی تھی جس کا نام ,, بہار کشمیر ,, رکھا تھا - یہ مثنوی اُردو میں تھی - ایک فارسی کا قصیدہ نواب شیخ حسین میاں رئیس منگرول کی مدح میں کہکر مثنوی کے ساتھ نواب صاحب موصوف کی خدمت میں بھیجدیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اِسے حضور کے نام نامی سے معنون کرنا چاھتا ھوں - حکیم جلال صاحب اس زمانے میں وھیں موجود تھے - نواب صاحب نے مثنوی حکیم صاحب کے پاس بھیجدی اور کہلا بھیجا کہ آپ اسے دیکھ دیں - اگر اس میں کوئی غلطی نہ ھو تو میں اسے اپنے نام سے معنون کرنے کی اجازت دیدوں - یہ نئی بات نہ تھی بلکہ جب کبھی کوئی شاعر اُن کی مدح میں کچھ کہہ کر لاتا تھا تو نواب صاحب اُسے پہلے حکیم صاحب کو دکھا کر اطمینان کر لیتے تھے پھر اُسکے چھپنے کی اجازت دیتے تھے - حکیم صاحب نے مثنوی کو بغور ملاحظہ کیا اور جہاں جہاں قابل ترمیم تھی حاشیے پر لکھ دیا - نواب صاحب نے مثنوی مصنف کو واپس کی اور لکھوا دیا کہ اگر ان عیوب کو آپ دور کردیجیے تو میں آپ کی خواهش کے موافق اجازت دیدوں - اُنھوں نے جواب میں دیا کہ میں جلال کا شاگرد نہیں کہ اُن کے اعتراضات تسلیم کرلوں یا اصلاح کی اجازت دیدوں -

مگر جب حکیم صاحب لکھنؤ واپس آئے تو ایک روز پنڈت پیم نرائن صاحب آئے اور کہا کہ در حقیقت میں غلطی پر تھا اور آپ کے اعتراضات بالکل بجا تھے - اب میری التجا ہے کہ آپ اس کی اصلاح بھی فرمادیں اور سفارش بھی کردیں

کہ میرا کام بن جائے - حکیم صاحب انتہا کے با مروت تھے - مثنوی رکھلی اور درست کر کے سفارشی خط لکھ بھیجا - نواب صاحب نے روپیہ بھیجدیا اور لکھ بھیجا کہ آپ خود چھپوا کر مصنف کو دیدیں اور کچھ نسخے یہاں بھی بھیجدیں - حکیم صاحب نے مثنوی کی تاریخ طبع بھی کہی اور چھپوا کر کچھ جلدیں نواب صاحب کو بھیجدیں اور باقی مصنف کے حوالے کردیں -

" بہار کشمیر " کی طباعت کا قطعۂ تاریخ یہ ھے :—

کانپوری ھیں جو اک پیم نرائن پنڈت
ناظم ملک سخن شاعر بے مثل و نظیر
کہہ کے اک مثنوی تازہ اُنہوں نے فی الحال
اور اُسے کرکے مسمی بہ " بہار کشمیر "
جلد تر پیش کش والی منگرول کیا
تاکہ چھپ کر ھو وہ مشہور جہاں بے تا خیر
اس کے نیرنگ سے بیرنگ ھے گلزار نسیم
کھوئے جس کا اثر اگلوں کے سخن کی تاثیر
طبع کا سال بھی کیا خوب شگفتہ ھے ' جلال
لائی پاکیزہ شگوفے یہ بہار کشمیر

سنہ ۱۳۰۵ ھ

کمال کی دعوت ولیمہ

حکیم صاحب نے اپنے لایق فرزند حکیم محمد مہدی صاحب کمال کی شادی کی اور اُنھیں لیکر منگرول گئے - نواب صاحب سے عرض کیا " میں نے لڑکے کی شادی کر دی ھے اور اِس غرض سے حاضر ھوا ھوں کہ حضور بھی دعوت ولیمہ قبول فرمائیں " - نواب صاحب نے

دعوت قبول کي - حکیم صاحب نے اپنی قیامگاہ پر ، محمد عمر صاحب کے اهتمام میں دعوت کي - نواب صاحب مع امرا و ارکان ریاست تشریف لائے - خاصہ تناول فرمایا اور چلتے وقت کمال کو خلعت اور ایک سو ایک روپیہ علاوہ زادراہ کے دے کر رخصت کیا -

چند دن رہنے کے بعد حکیم صاحب نے نواب صاحب سے اپني پیرانہ سالی کا عذر کیا اور کہا کہ " میرا وطن یہاں سے بہت دور ھے ' اب میں بار بار اتنی بڑي زحمت سفر برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں " - نواب صاحب نے پچاس روپیہ ماہوار مقرر کر دیا اور لکھنؤ میں رہنے کي اجازت دیدي -

ریاست رام‌پور سے دوبارہ وابستگی

کچھ دن بعد یہ دور بھي ختم ہوا - شیخ حسین میاں نے بھي اِنتقال فرمایا اور حکیم صاحب کا مشاہرہ موقوف ہو گیا - مگر اب وہ زمانہ تھا کہ رام پور کا دور انقلاب ختم ہو چکا تھا ' نواب سید حامد علي خاں بہادر نبیرہ نواب کلب علي خاں ولایت سے واپس آ کر تاج فرمانروائي پہن چکے تھے اور کسي خاص سبب سے نیج کے طور پر لکھنؤ تشریف لاکر حسین‌آباد کي تالاب والی کوٹھي میں جہاں شاہاں اودہ کي تصویریں لگي ہوئي ہیں قیام پذیر تھے - حکیم صاحب اپنے ولي نعمت کے جانشین سے ملنے گئے - نواب صاحب نے بلایا اور پوچھا " کہیے حکیم صاحب ' اب کن شعرا سے ہنگامہ آرائي رہتي ہے ؟ " حکیم صاحب نے کہا " حضور وہ دور گزر گیا ' نواب صاحب خلدآشیاں کے عہد تک اِس کا لطف تھا - جب اُن سا قدر شناس نہ رہا تو میں بھی گوشہ نشین ہو گیا " - نواب صاحب نے فرمایا " آپ رام پور

میں آکر مجھ سے ملے گا " مگر حکیم صاحب نہیں گئے - آخر وہاں سے پروانہ آیا اور طلبی ہوئی - اب حکیم صاحب گئے - نواب صاحب نے بہت عزت کی اور پوچھا کہ آپ کا کیا مشاہرہ تھا - حکیم صاحب نے بیان کیا ' اُنہوں نے وہی ساٹھ روپیہ مہینہ کر دیا اور حکیم صاحب وہاں رہنے لگے -

مگر اب حکیم صاحب کا جی کیا لگتا - نہ امیر تھے نہ داغ - نہ قلق تھے نہ بحر - نہ عروج تھے نہ مفتی سعداللہ - چند ہی روز میں اُکتا گئے اور نواب صاحب سے عرض کی کہ " میں نہ تو اہل و عیال کو بلا سکتا ہوں نہ تنہا رہ سکتا ہوں - نہ کسی کام کا ہوں - یہاں بھی حضور کے لیے دعا کرتا ہوں اور وطن میں رہ کر بھی دعا کرتا رہوں گا " - نواب صاحب نے فرمایا کہ " آپ کے یہاں رہنے سے میری ریاست کا نام ہے " - کچھ دنوں بعد پھر حکیم صاحب نے کہا کہ " اب میری جگہ پر بندہ زادے کو قبول فرمائیے - اگرچہ وہ ریاست ٹونک میں ملازم ہے مگر اُسے بلا لوں گا " - نواب صاحب نے قبول فرمایا - اور کہا کہ " اگر آپ کے بھتیجے آ جائینگے تو پھر میں جانے کی اجازت دیدونگا " - چنانچہ حکیم صاحب نے کمال کو خط لکھ کر بلا لیا - نواب صاحب نے پچھتر روپیہ ماہوار کمال کے مقرر کیے اور پچاس روپیہ ماہوار حیاتی پنشن کے طور پر حکیم صاحب کے کر دیے - حکیم صاحب وطن میں رہنے لگے -

لکھنؤ کے قیام کا زمانہ

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ریاست منگرول سے وابستگی کے زمانے میں بھی ایک مدت تک حضرت جلال لکھنؤ میں رہے اور رامپور سے دوبارہ

تعلقات قائم ہو جانیکے بعد بھی عمر کا آخری حصہ یہیں گزارا -
علاوہ اسکے دوران قیام رامپور و منگرول میں بھی اکثر لکھنؤ
تشریف لاتے تھے - قیام لکھنؤ کے اُن مختلف زمانوں کے چند مختصر
لیکن دلچسپ و مفید حالات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں -
جلال اسم با مسمیٰ تھے اور غصہ اُن کا مشہور
تھا - یہ غصہ جہالت کی وجہ سے نہ تھا - جلال کی
پاکباطنی اور انصاف پسندی
وہ علاوہ علوم رسمیہ کے فارسی و عربی میں کامل
دستگاہ رکھتے تھے - مذہبی بحثوں میں حدیث و قرآن سے
استدلال لایا کرتے تھے - اُن کی طبیعت حق پسند تھی - جو
اُن کا دل تھا وہی اُن کی زبان تھی - پھر اِس فریبی دنیا
میں اُن کے غصے کے لیے اسباب کی کیا کمی تھی - وہ اپنے
معاصرین امیر و داغ سے محبت رکھتے تھے اور اُن کی عزت اپنی
عزت جانتے تھے - ایک مرتبہ احسان علی خاں احسان شاہجہانپوری
نے ایک غزل کہہ کر بھیجی - وہ غزل داغ کی ہم طرح غزل
تھی - یہاں تک تو مضایقہ نہ تھا کہ ایک طرح میں سب
ہی طبع آزمائی کیا کرتے ہیں مگر احسان نے لکھ بھیجا کہ
میں نے داغ کی غزل کا جواب کہا ہے اور بعض اشعار پر
داد خواہ بھی ہوئے - یہ امر استاد کو ناگوار گزرا ' غزل کاٹ کر
رکھ دی اور جواب لکھا کہ " تمہارا بھی یہ منہ ہے کہ تم داغ
کی غزل کا جواب کہوگے - داغ کی غزل کا جواب ہم کہیں یا
ہماری غزل کا جواب داغ کہیں - تم جیسے ہمارے شاگرد ویسے
داغ کے شاگرد " - احسان خاں ' صاحب دیوان اور صاحب تلامذہ
تھے - مگر استاد کی ایک ڈانٹ نے چڑھے ہوئے پارے کو اُتار
دیا اور اُنھوں نے ایسی جرأت پھر کبھی نہیں کی -

داغ کے ایک مقطع سے پتا چلتا ہے کہ اُنھیں بھی اپنے حریفان سخن سے محبت تھی اور اُن کا فراق شاق تھا - کہتے ھیں :—

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ
ملتے امیر احمد و سید جلال سے

لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں یہاں کے شاگرد برابر حاضر ہوتے رہتے تھے - کبھی کسی اصلاح کی غرض سے کبھی کسي استفسار کے لیے ' کبھي صرف سلام کو - ایک مرتبہ حکیم مرزا فدا احمد صاحب دانش پہنچے اور نواب مہدي حسن خاں رفعت کي شکایت کی کہ اُنھوں نے میرے شعر پر اعتراض کر دیا - حکیم صاحب نے پوچھا کہ شعر کیا ہے اور اعتراض کیا ہے - دانش صاحب نے ذیل کا شعر پڑھا :—

اس قدر طول ' یہ بڑھنا ' یہ درازي ' توبہ
حشر میں تجھ سے خدا ' اے شب ماتم ' سمجھے

حکیم صاحب نے فرمایا کہ شب ماتم کیا چیز ہے - دانش صاحب نے کہا '' جیسے شب غم ویسے شب ماتم - مگر رفعت کہتے ھیں کہ شب ماتم ' شب غم کے معنی میں ' غلط ہے '' - حکیم صاحب نے فرمایا وہ ٹھیک کہتے ھیں آپ یہ شعر نکال ڈالیے یا لفظ بدل دیجیے - دانش صاحب اهل علم سے تھے اور مهدي حسن خاں رفعت معمولي استعداد کے آدمي - دانش کو حکیم صاحب کا یہ فیصلہ ناگوار معلوم ہوا - اُسی روز سے استاد کے خلاف ہو گئے ' شاگردي سے انکار کرنے لگے - ہمیشہ استاد پر اعتراض کرنے کی فکر میں رہا کرتے تھے اور اپنے کو مہر علي ضامن خلف جناب رشک کا شاگرد ظاهر کیا کرتے تھے - مگر جلال کي انصاف گستري اور حق گوئي ایسي باتوں سے متاثر ہونے والي نہ تھی -

جلال کے کمال کا مونس کی زبانی اعتراف

میرے والد مرحوم میر ذاکر حسین صاحب یاس شاعری میں میر نواب صاحب مونس کے شاگرد ہوئے - ایک مرتبہ والد مغفور نے میر مونس سے علم عروض پڑھنے کی خواہش کی - مونس نے کہا کہ اگر تمہیں عروض‌داں بننا ہے تو میرے بدلے جلال سے پڑھو کہ اُن سے بہتر عروضی کوئی نہیں ہے - اسی بنا پر میر مونس کے بعد والد مرحوم نے حکیم صاحب سے رجوع کی اور عمر بھر تحصیل فن کرتے رہے -

جلال کی مزلت گزینی اور ماہر و فاخر کے مشاعرے

اہل لکھنؤ کسی ہم وطن کے عروج کو نہ پہلے دیکھ سکتے تھے نہ اب دیکھ سکتے ہیں - جناب جلال نے یہاں کی فضا مکدر دیکھ کر مشاعروں کی شرکت ترک کی اور خانہ نشین ہو گئے - اِس احتیاط سے بھی پوری طور پر عافیت نصیب نہ ہوئی - کہیں نہ جانا تو اپنے اختیار کی بات تھی لیکن دوسروں کو آنے سے منع کرنا اور کسی سے نہ ملنا سراسر خلاف اخلاق ہونے سے اختیار کے باہر تھا - لوگ آتے تھے اور جو نکات سمجھ میں نہ آتے تھے پوچھ جاتے تھے -

اُسی زمانے میں مولوی[1] میر مہدی حسین صاحب ماہر اور مولوی[2] میر اصغر حسین صاحب فاخر کربلاے معلیٰ سے لکھنؤ

---

(۱) مولوی میر مہدی حسین صاحب ماہر غفرانماب مولوی دلدار علی صاحب کے پوتے تھے اور شاعری میں منشی اسیر کے شاگرد تھے ' کہنہ مشق اور خوش فکر شعرا میں ان کا شمار تھا اور نواب تاج محل کے داماد ہونے سے رؤسا میں گنے جاتے تھے -

(۲) مولوی میر اصغر حسین صاحب فاخر ' ماہر صاحب کے بھانجے بھی تھے اور شاگرد بھی اور نواب تاج محل کے نواسی داماد تھے ' اِن کا شمار بھی رؤسا میں تھا

نے - یہ لوگ حق دامادی سے نواب تاج[1] محل کے وارث جائز ہوچکے تھے - زر و جواہر سبھی کچھ تھا ' جو بعد میں بہت جلد اور بہت بری طرح برباد ہو گیا - ماہر صاحب کے یہاں تو گاہ گاہ مشاعرے ہوتے تھے مگر فاخر صاحب کے یہاں ہر پندرھویں روز مشاعرہ ہوتا تھا - قیام اُن کا نوھی میں تھا - یہ جگہ شہر کے مشرق جانب فاصلے پر ہے - شعرا کو گاڑی کا کرایہ بھی ملتا تھا اور سب کے لیے اِک پر تکلف دسترخوان بھی بچھتا تھا - جو شخص فاخر صاحب کا شاگرد ہوتا تھا اُس کا کچھ مشاہرہ بھی مقرر ہو جاتا تھا جو دس روپئے سے کم نہ ہوتا تھا - شعرائے نامی میں سوا جلال کے کوئی ایسا نہ تھا جو ان مشاعروں میں شریک نہ ہوتا ہو -

مشاعرے کا مثنی

اِس مشاعرے کا ایک مثنی بھی ہوتا تھا - یہ صحبت مختصر ہوتی تھی اور اِس میں صرف اساتذہ پڑھتے تھے - اِس مختصر صحبت میں بڑے اصرار پر ایک مرتبہ حکیم صاحب بھی شریک ہوئے تھے اور مجھے بھی اپنے همراہ لیتے گئے تھے - یہاں بھی جلال کا بزرگانہ اِمتیاز قائم رہا کہ آخر میں پڑھے اور اثناء خوانندگی میں لوگوں نے داد دیتے وقت اُن کو اپنے عہد کا مہر کہا -

ماہر کی کشیدگی

اِسی سلسلے میں ماہر و فاخر حکیم صاحب کے یہاں آتے تھے اور دو دو پہر نشست رہا کرتی

---

(۱) نواب تاج محل نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ کی بیگم تھیں - وہ بیوہ ہونے کے بعد کربلائے معلی چلی گئیں اور عمر بھر وھیں رھیں -

تھي - اپني طولاني غزليں پڑھتے تھے جس سے حکيم صاحب
بہت پريشان ہوتے تھے اور اُن کے جانے کے بعد لوگوں سے
شکايت کيا کرتے تھے - فتنه انگيزوں نے يه خبر ماہر و فاخر سے
بھي بيان کي - اُنھيں ناگوار ہوا - ايک روز حکيم صاحب
جناب ماہر سے ملنے گئے - وہاں کامل صاحب[1] بھي موجود
تھے - حکيم صاحب کی تعظيم تو ہوئي مگر دير تک
ايک سکوت کا عالم رہا - حکيم صاحب نے سکوت کا
سبب دريافت کيا - ماہر صاحب بھرے بيٹھے ہي تھے -
کہنے لگے '' آپ تو اپنے آگے کسی کو موجود نہيں جانتے ہيں '' -
حکيم صاحب نے کہا '' يه آپ نے کيوں کر جانا ؟ '' غرضکه
صحبت بڑھی ، آخر جلال کو جلال آہی گيا ، کہنے لگے '' اگر
در حقيقت ميں اپنے آگے کسي کو موجود نه جانوں تو يه بيجا
کيا ہے ؟ '' اِس جواب کا کوئی جواب نه ملا - اور حکيم
صاحب وہاں سے استغفرالله کہتے ہوئے اُٹھے اور پھر نه کبھی يه
گئے اور نه وہ آئے -

جلال کے خلاف پروپگنڈا اور جلال کي عالي ظرفي

اسي طرح حکيم صاحب ايک روز مہر جعفر
حسين قاصر کي ملاقات کو گئے - وہاں مياں عصمت
ريختي گو موجود تھے - جب حکيم صاحب اُٹھ
کے چلنے لگے تو مياں عصمت نے اپني بکواس کی
تان اس جملے پر توڑي - " حضور مجھ سے اور مياں جلال سے

---

(۱) علي مياں نام تھا ، کامل تخلص ، مولوي محمد علي صاحب کے بيٹے
تھے ، خود بھي صاحب علم و فضل تھے - مرثيه گوئی اور غزل گوئی ميں
کامل دستگاه رکھتے تھے اور اساتذه ميں شمار کيے جاتے تھے -

نہیں بنتی '' - حکیم صاحب نے اُن کی صورت دیکھی اور کہا
'' آپ جلال کو پہچانتے بھی ہیں ؟ '' کہنے لگے '' جی ہاں ' میرے
اُن کے خوب خوب بحثیں ہو چکی ہیں '' - حکیم صاحب جھلا
کر کہنے لگے '' جلال تو میں ہوں ! '' اور میر اصغر حسین کی
طرف دیکھ کر کہا '' دیکھیے لوگوں نے اِس طرح مجھے بدنام
کیا ہے '' - عصمت بھی بوڑھے آدمی تھے - بہت خفیف
ہوئے اور معافی مانگنے لگے - حکیم صاحب نے معاف کیا اور
فرمایا کہ '' اگر مجھے برا کہنے میں تمہارا کوئی فائدہ ہو تو
میں آئندہ کے لیے بھی معاف کرتا ہوں ''

انہیں میر اصغر حسین صاحب کے مشاعروں میں ایک مرتبہ
مولوی[1] لڈن صاحب خورشید اپنی غزل پڑھ رہے تھے جب یہ مصرع
پڑھے : —

'' اک شامیانہ اور تہِ شامیانہ ہو ''

تو نواب[2] بنّے صاحب مشتاق نے اعتراض کیاکہ شامیانہ فارسی نہیں
لہذا یہ اضافت غلط ہے - خورشید صاحب حکیم صاحب کے پاس
آئے اور کہا کہ اِس کا جواب بتائیے ورنہ میری بات جاتی ہے اور
اعتبار میں فرق آتا ہے - باوجودیکہ حکیم صاحب جانتے تھے

---

(۱) سید محمد اصطفا نام ' لڈن صاحب عرفیت اور خورشید تخلص تھا - یہ بھی
مولوی دلدار علی صاحب کے پوتے اور ماہر صاحب کے داماد تھے - شاعری میں ان کا
سلسلۂ تلمذ آغا ھجّو ھندی سے ملتا ہے — افادات کے نام سے علم عروض میں
ایک کتاب بھی لکھی ہے - صاحب تلامذہ تھے ' اساتذہ میں شمار ہوتے تھے -

(۲) میرزا باقر علی خاں نام ' بنّے صاحب عرفیت اور مشتاق تخلص تھا - رؤسائے لکھنؤ
میں سے تھے اور شعر گوئی میں بھی مشتاق تھے ان کا شمار بھی اساتذہ میں تھا -

که یه میرے دوست نہیں ہیں مگر وعدہ کر لیا اور کہا کہ " میں فارسي کلام سے مثال نکال دونگا ' مگر یه بھي سن رکھیے که شاعرانه فارسي ہے نہیں اور اعتراض بالکل صحیح ہے " - پھر حکیم صاحب نے فارسي گویوں میں سے خدا جانے کس کے کلام سے مثال نکال کر بھیجدي !

حکیم صاحب مشتاق کے متعلق اچھي راے رکھتے تھے اور رؤساے لکھنؤ میں مرزا[1] والا جاہ بہادر المتخلص به عاشق کو اور نواب مہدی[2] علي خاں صاحب مہدی نیشاپوري کو اساتذہ میں شمار کرتے تھے -

جاہل کي سادہ لوحي

ربیع‌الاول کي آٹھویں تاریخ ہے ' حکیم صاحب اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے ہیں که سامنے سے محلے کے ایک شخص مرزا رضا علي آتے ہوئے دکھائي دیے - یه حضرت بالکل جاہل مگر بہت شوخ طبع تھے - آئي پر چوکنا اُن کے مشرب میں وہ گناہ تھا جس کا کوئي کفارہ ہي نه تھا - حکیم صاحب نے پوچھا " آپ کہاں سے آرہے ہیں " کہنے لگے " چپ تعزیے کي زیارت کو گیا تھا ' ابکے تو ایسا مجمع تھا که اکہري دروازے کے نیچے ہاتھي کچل گیا " - حکیم صاحب نے فرمایا

---

(۱) مرزا والا جاہ بہادر لکھنؤ کے بڑے رؤسا میں سے تھے - ان کے والد مرزا حیدر صاحب ' شجاع‌الدولہ فرمانرواے اودھ کے نواسے تھے - یه شاعري میں ناسخ کے شاگرد تھے ' مطبوعہ دیوان موجود ہے - اِن کا شمار بھي اساتذہ میں ہے -

(۲) نواب مہدي علي خاں صاحب بھی مرزا والاجاہ بہادر کے عزیز تھے - شاعري میں ماہر فن اور استاد کامل سمجھے جاتے تھے -

" یہ آپ نے کس سے سنا ؟ " یہ حضرت ہر وقت تسبیح بھی لئے رھتے تھے - ھاتھ اُٹھا کر کہنے لگے " اِس تسبیح کی قسم میں نے ھاتھی کو کچلتے اپنی آنکھ سے دیکھا ھے " - اب حکیم صاحب کو ھاتھی کے کچل جانے کا یقین آگیا - یہ قصہ اپنے ایک دوست میر حسین جان سے نقل کیا - اُنھوں نے کہا " حکیم صاحب ' بھلا یہ بھی کوئی عقل میں آنے کی بات ھے ؟ " حکیم صاحب نے کہا " عقل میں تو میری بھی نہیں آتا مگر راوی ثقہ ھے - اور اُس نے قسم کھا کے کہا ھے " - وہ ھنس کے چپ ھو رھے اور حکیم صاحب کہکر پشیمان ھوئے - جب دوسرے روز مرزا رضا علی ملے تو اُن سے کہا " کیوں صاحب ' آپ جھوٹ بھی بولتے ھیں اور اُس پر قسم بھی کھاتے ھیں - بھلا ھاتھی اتنا بڑا جانور ' وہ آدمیوں کے مجمعے سے کیوں کر کچل سکتا ھے ؟ " مرزا نے کہا " ایک ھاتھی کیسا ' جتنے ھاتھی اُس کمھار کی دوکان پر رکھے تھے اگر سب گر پڑتے تو اتنا مجمع تھا کہ سب کچل جاتے ! " حکیم صاحب نے کہا " استغفراللہ ' تو آپ نے کل ھی کہ دیا ھوتا کہ وہ مٹی کا ھاتھی تھا " - مرزا نے کہا " یہ تو آپ کو خود سمجھ لینا چاھیے تھا کہ اصل ھاتھی جب آدمیوں سے خود بلند ھوتا ھے تو وہ پاؤں کے نیچے کیوں کر آسکتا ھے " یہ کہکر راھی ھو گئے !

جلال کے تصانیف

میں اپنے علم و یقین کے موافق حالات و واقعات بیان کرچکا - اب حضرت جلال کی مفید تصنیفات کی فہرست بھی دیے دیتا ھوں جس کے دیکھنے سے اچھی طرح معلوم ھو جائیگا کہ دنیاے ادب پر اس محقق باکمال کے کیا کیا احسانات ھیں اور لوگوں نے اُن سے کس قدر فائدہ اُٹھایا -

حضرت جلال کي تصنيفات و تاليفات بارہ ھيں جن ميں سے دس مطبوعہ اور دو غير مطبوعہ ھيں ' مطبوعہ کتابوں ميں اکثر کے نام تاريخي ھيں -

مطبوعہ کتابيں : —

۱ - شاھد شوخ طبع - ديوان اول ھے ' سنہ ۱۲۹۷ھ ميں مرتب ھوا اور سنہ ۱۳۰۰ھ ميں چھپا -

۲ - کرشمہ گاہ سخن - ديوان دوم ھے ' سنہ ۱۳۰۱ھ ميں مرتب ھوا اور سنہ ۱۳۰۲ھ ميں چھپا -

۳ - افادۂ تاريخ - قواعد تاريخ‌گوئی کے متعلق ھے ' سنہ ۱۳۰۳ھ ميں طبع ھوئی -

۴ - منتخب القواعد - حروف کے خواص کے بيان ميں ھے - سنہ ۱۳۰۴ھ ميں طبع ھوئی -

۵ - گلشن فيض - فارسي زبان ميں اُردو لغت ھے ' مطبع نولکشور ميں چھپا تھا ' اب کوئي نسخہ دستياب نہيں ھوتا -

۶ - تحفۂ سخنوران ' يا ' سرمايۂ زبان اُردو - اُردو زبان ميں اُردو لغت ھے ' سنہ ۱۳۰۴ھ ميں طبع ھوا -

۷ - مفيد الشعرا - تذکير و تانيث کے بيان ميں ھے ' سنہ ۱۳۱۱ھ ميں طبع ھوئي -

۸ - مضمون ھاے دلکش - ديوان سوم ھے - سنہ ۱۳۱۹ھ ميں چھپا -

۹ - نظم نگاريں - ديوان چھارم ھے - سنہ ۱۳۲۱ھ ميں چھپا -

۱۰ - تنقيح اللغات - صحت‌لغات ميں ھے - مطبوعہ نسخہ دستياب نہيں ھوا - ميرے پاس قلمي نسخہ ھے جس ميں سنہ تاليف يا سنہ طباعت درج نہيں ھے -

غیر مطبوعہ کتابیں :—

۱ - دیوان پلنجم -

۲ - رسالۂ عروض و قوافي -

ان تصانیف کے مطالعے کے بعد ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ جس بزرگ نے ایسی ادب آموز کتابیں اپنی یادگار میں چھوڑي ہیں وہ دنیاے ادب میں کبھی گمنام نہیں رہ سکتا -

---

اردو کا ایک قدیم رسالہ

(از محمد اظہارالحسن بی ' اے ایل ایل ' بی ' علیگ)

" اردو میں صحافت کي ابتدا کب سے ہوئی ؟ " یہ سوال ہر اُس شخص کے لیے جو زباں و ادب کی تاریخ سے آگاھي حاصل کرنا چاھتا ھے نہایت اھمیت رکھتا ھے - افسوس ھے کہ اکثر تذکرے اور تاریخیں اس کا جواب دینے سے قاصر ھیں - یوں تو ھمارے مولفین اور مصنفین نے سرے سے نثر اردو ھی کی جانب سے بےاعتنائی برتي ھے - شعرا کے تذکروں کے مقابلے میں نثر نگاروں کے تذکروں کي تعداد کچھ بھي نہیں - اردو نثر کي تاریخ پر جتني کتابیں لکھي گئی ھیں آج بھي انگلیوں پر گني جا سکتي ھیں ' اور پھر وہ بھي زیادہ تر تشنۂ تکمیل ھیں - مولانا احسن مارھروی نے البتہ اپني گراں‌بہا تالیف " تاریخ نثر اردو " میں پہلي مرتبہ صحافت کے لیے دو مستقل باب وقف کیے - اخبارات کا ذکر پہلی جلد میں ھو چکا ھے - ماھوار رسایل سے جلد دوم میں بحث کي جائیگي جس کے لیے یقیناً شایقین ادب چشم براہ ھیں -

اخبارات کے متعلق شمس‌العلما مولوی محمد حسین آزاد کا ارشاد ھے کہ سب سے پہلا اردو اخبار سنہ ۱۸۳۶ع میں دھلي سے اُن کے والد بزرگوار مولوي محمد باقر کے قلم سے نکلا - کسي جدید تحقیقات کی عدم موجودگي میں اس قول کو تسلیم کرنے

کے سوائے کوئی چارہ نہیں - افسوس ہے کہ اخبارات کے ابتدائی عہد کے نمونے اب دستیاب نہیں ہوتے ؛ چنانچہ احسن صاحب کی تالیف میں پہلا نمونہ سنہ ۱۸۰۷ع کا ہے - رسایل کے متعلق قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی ابتدا کب سے ہوئی - احسن صاحب پہلا دور سنہ ۱۸۳۹ع سے قایم فرماتے ہیں -

اِس سلسلے میں قارئین کرام اردو کے ایک قدیم ماہانہ رسالے '' خیر خواہ ہند '' کی جلد دوم کے ایک نمبر کی دستیابی کی خبر شاید دلچسپی سے پڑھینگے - یہ نمبر اکتوبر سنہ ۱۸۳۷ع میں شایع ہوا تھا - اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے جن قدیم ماہوار رسایل کا علم اب تک حاصل ہو سکا ہے اُن میں یہ نمبر قدیم ترین ہے - اور اس لیے رسایل کے دور اول کو سنہ ۱۸۳۹ع سے ہٹا کر کم از کم سنہ ۱۸۳۶ع سے قایم کرنا ہوگا - اگر کسی صاحب کے پاس '' خیر خواہ ہند '' یا کسی اور رسالے کے اِس سے بھی قدیم نمبر موجود ہوں تو اُن کو چاہیے کہ اس کے متعلق معلومات کسی ادبی رسالے کے ذریعے پبلک کو مہیا کردیں تاکہ آیندہ مولفین اور مصنفین استفادہ کرسکیں - میں بھی یہ چند سطور اِسی نظر سے حوالۂ قلم کر رہا ہوں -

اس رسالے کے ایڈیٹر ، ماسٹر رامچندر ، وہ صاحب فضل بزرگ تھے جن کے آغوش کمال کے پروردہ یافتہ ایک چھوڑ تین تین شمس العلما (آزاد ، ذکاء اللہ ، نذیر احمد) تھے - اُن کے حالات اگرچہ پردۂ خفا میں مستور ہیں ، لیکن اُن کی علم دوستی اور اردو نوازی مشہور ہے - انہوں نے کئی کتابیں مثلاً ' تذکرۃالکاملین ' ' اصول علم ہئیت ' اور عجایب ' روزگار ' تصنیف کیں اور

خالص علمی مسایل سے اردو کو مالامال کیا[1] -

اس نمبر کا حجم ۵۰ صفحے ہے - تقطیع کتابی ہے - سر ورق کی عبارت حسب ذیل ہے -

اول اکتوبر	جلد دوم	سنه ۱۸۴۷ع

قیمت رسالہ ایک روپیہ اور جاری ہوتا ہے ہرماہ میں ایک بار اور محصول‌ڈاک ذمہ خریدار

خیرخواہ ہند

رامچندر مدرس مدرسہ دھلی کے اہتمام سے مطبع دھلی اردو اخبار میں منطبع ہوا

پنڈت موتی لعل پرنٹر	PRICE ONE RUPEE	مکان مولوی محمد باقر

یہ رسالہ مصور شایع ہوتا تھا - چنانچہ پہلے ہی صفحے پر " نقشہ شہر دھلی از طرف دریاے جمن " ہے - نواب

(۱) غالباً شمس‌العلما مولوی ذکاءاللہ کی طبع سلیم میں ٹھوس اور علمی مباحث پر خیال آرائی کا ذوق اِنہیں کے فیض کرم کا منت گزار تھا -

شجاع‌الدولہ و نواب آصف‌الدولہ فرماں روایان اودھ کی تصاویر سے
بھی رسالے کو زینت دی گئی ہے ۔ معیار خاصا بلند ہے او
آجکل کے اکثر ادبی رسایل کے لیے قابل رشک ہو سکتا ہے ۔
مضامین علمی و ادبی ہیں - نظم کی کمی شیخ محمد ابراهیم
ذوق کے اُس مشہور قصیدے سے پوری کی گئی ہے جس ک
مطلع ہے :—

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہو
قمر دستور اعظم ' صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو

شروع میں کوئی فہرست مضامین نہیں ہے - یہ بھی نہیں
معلوم ہوتا کہ مضامین اڈیٹر کے قلم کے رهین منت ہیں ی
دیگر مضمون نگار حضرات کے نتائج فکر سے ہیں - مضامین میں
خاصا تنوع ہے - چنانچہ پہلا مضون " تاریخ ملک اودھ " ہے
جو تیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے - دوسرا مضمون " تربیت
اہل هند کے بیان میں " ہے ۔ صفحہ ۳۸ سے " بیان سادھوؤں کے
طریقے کا " شروع ہو کر بیالیسویں صفحے پر ختم ہوتا ہے ۔
اُس کے بعد " هئیت - بیان ستاروں کا " ہے ' جو نقشوں او
شکلوں وغیرہ سے مزین ہے ۔ سب سے آخر میں ذوق کا قصید
درج ہے -

" تاریخ ملک اودھ " میں پہلے مختصر جغرافیہ ملک
اودھ کا لکھا گیا ہے - اُس کے بعد شجاع‌الدولہ سے لے ک
واجد علی شاہ تک فرمانروایان اودھ کے مختصر حالات قلم بند
کیے ہیں - جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اِس مضمون میں
کوئی خاص بات نہیں - هاں یہ ضرور ہے کہ لایق مضمون نگا
حکومت اودھ کے سخت خلاف معلوم ہوتے ہیں - وهاں کو

بد انتظامیوں پر جي بھر کے اعتراضات کیے گئے هیں اور فرمانروائے وقت کو اُن سب بد اعمالیوں کا منبع قرار دیا گیا هے - شاید هي کوئي نواب ایسا هو جو سبّ و شتم سے بچا هو - نواب آصف‌الدوله کو یاد کرکے آج تک لکھنؤ والے روتے هیں ' لیکن مضمون نگار نے اُن کے حق میں بھي ایک کلمهٔ خیر نہیں کہا هے - فرمانروایان اودھ کے متعلق جو انداز بیان اختیار کیا گیا هے وہ بھي ایک همسایه سلطنت کے لیے مناسب نہیں - طرفه تر یه که انگریزوں کي عدم مداخلت کو قابل گرفت سمجھا هے اور دست اندازي کي دعوت دي هے - یه وہ زمانه تھا جب نواح دهلی میں انگریزوں کي حکومت نئي نئي تھی اور نظام سلطنت بھي مغلیه حکومت سے مختلف تھا - رعایا کے دل و دماغ اس جدید کیفیت سے معمور تھے - اسي لیے ایسي تحریرات کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں - هاں یه دیکھکر ضرور کسي قدر حیرت هوتي که اُس زمانے میں بھي حکومت وقت پر اعتراض کرنے کا جذبه پیدا هوگیا تھا - چنانچه نواب سعادت علی خاں کے حالات میں ریزیڈنت کے طرزعمل پر نکته‌چیني کي گئی هے اور بعض گورنر جنرلوں کي مداخلت بیجا پر بھی دبي زبان سے اعتراضات کیے گئے هیں - ایک علمي رسالے میں کسي تاریخی مضمون کو دیکھ کر یه توقع هوتي هے که علاوہ لڑائیوں اور سیاسي حالات کے کچھ معلومات ملکي معاشرت ' تعلیم ' تمدن ' زبان اور مختلف تحریرات کے متعلق اُس میں هوں گي - زیرنظر مضمون اِن تمام مباحث سے خالی هے - مگر یه ملحوظ رکھنے کي بات هے که اِس کا مصنف غدر سے دس سال قبل یه مضمون لکھ رہا تھا جبکه اردو نثر کي عمر کچھ زیادہ نه تھي

اور تاریخ نویسي کے موجودہ نظریے لوگوں کے ذہن میں بھي نہ آئے تھے -

دوسرا مضمون شایقین اُردو کے لیے کئي لحاظ سے اہم ہے اس میں اُردو کي فوقیت دوسري زبانوں پر ثابت کر کے اُس کي ترویج کے لیے قابل قدر مشورے دیے گئے ہیں - اس سلسلے میں گورنمنٹ کو اُردو کي " دستگیري " پر آمادہ کرنے کی کوشش کي گئي ہے - فاضل مضمون نگار کی تجویز ہے کہ جس طرح اکثر بڑے بڑے شہروں میں انگریزی ' عربي ' فارسی ' اور شاستري (سنسکرت) کے مدرسے ہیں اُسي طرح اُردو کے مدرسے بھي قائم کیے جائیں جہاں " زبان اُردو سکھائی جائے اور اُسي کی وساطت سے ہر علم ' خواہ حساب ' خواہ تاریخ ' خواہ ہیئت ' خواہ ہندسہ ' سکھائے جاویں " کیونکہ " اگر علم اور عقل زبان انگریزي کی تحصیل سے چھ برس میں آتی ہے تو وہ سب عقل اور علم اُردو کے طالب علموں کو دو برس میں آجائے گي " - اُس وقت کے مدارس میں اُردو کي تعلیم کا جو انتظام تھا اُس سے مضمون نگار مطمئن نہیں تھے - اُن کا خیال تھا کہ اُن مدارس میں اُردو ایک بے حقیقت شے تصور کي جاتي تھي -

" یہ سچ ہے کہ ہر مدرسہ میں ایک دو مدرس اُردو کے مقرر ہیں لیکن یہ سوائے چند کتابوں قصہ اور نظم وغیرہ کے کچھ نہیں سکھاتے ہیں اور سرکار کی بھی غرض یہ نہیں ہے کہ اُس سے زیادہ سکھاویں اُنھیں صرف یہ غرض ہے کہ طالب علم کچھ واقفیت اپني زبان سے بھي حاصل کر لیں اور نہ یہ کہ علوم کو بوساطت زبان اُردو کے حاصل کریں - یہ تو جب ہوتا ہے کہ وہ زبان انگریزي کو تحصیل کرتے ہیں - پس اس صورت میں زبان

اردو بہ نسبت زبان انگریزی اور فارسی اور عربی وغیرہ کے حقیر رہی -
حقیقت میں دیکھو تو کوئی مدرسہ اردو کا ہندوستان میں نہیں
ہے - یہ زبان فقط اور زبانوں کے ضمن میں سکھائی جاتی ہے '' -

قارئین کرام غور فرمائیں کہ کیا یہی خیالات آج بھی ہماری
گورنمنٹ اور اکثر یونیورسٹیوں پر صادق نہیں آتے - اِس امر
میں تقریباً سارے ماہرین تعلیم متفق ہو گئے ہیں کہ ذریعۂ
تعلیم غیر زبان ہونے کے باعث طالب علم کو محنت بھی زیادہ
کرنی پڑتی ہے اور پورے طور پر استفادہ بھی نہیں کیا جا سکتا
مگر برطانی ہند کی کسی یونیورسٹی کو ابھی تک یہ ہمت نہیں
ہوئی کہ اِس رائے پر عمل پیرا ہو - اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی
یہ برمحل آواز ' جو آج سے پچاسی سال قبل بلند کی گئی
تھی اور جس کی بازگشت عثمانیہ یونیورسٹی کی صورت
میں ہوئی ' افسوس ہے کہ اُس وقت صدا بہ صحرا ثابت
ہوئی - قابل مضمون نگار کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ
'' بالفعل زبان اردو میں ہر فن اور ہر علم کی کتابیں موجود
ہیں اور ہو سکتی ہیں لیکن اِن کا صرف اور رواج نہیں -
پس اس صورت میں کس کو غرض ہے کہ محنت اٹھاوے اور
علوم کی کتابیں زبان انگریزی سے یا عربی میں سے ترجمہ کرکے
اردو میں تیار کرے '' -

اس مضمون کے ذریعے سے ایک اور یوروپین محسن اردو سے
تعارف ہوتا ہے جن کا اسم گرامی ڈاکٹر اشپرنگر ہے - یہ صاحب
دہلی کالج کے پرنسپل تھے - یوں تو بنگال میں گورنمنٹ کی
سرپرستی اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کی - نگرانی میں ایک محکمہ اردو
تصنیف و تالیف کا قایم ہو چکا تھا جس کے ذریعے سے بعض

انگریزي اور فارسي کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا تھا - مگر گورنمنٹ کي کوششوں کے علاوہ بھی

" چند صاحبان انگریز اور بعض رئیسان ہندوستاني نے کئي ہزار روپیہ بطور چندہ جمع کرکے اوس روپیہ میں سے کتابوں علوم اور فنون کو زبان انگریزي اور فارسي وغیرہ میں سے ترجمہ کرائیں " -

ڈاکٹر اشپرنگر اس ادارے کے سکریٹری تھے - مضمون نگار کا بیان ہے کہ اِن عالي حوصلہ بزرگوں کي سعي سے کئي ہزار جلدیں مختلف علوم اور فنون مفیدہ مثلاً مساحت اور حساب اور علم ہئیت اور جبر و مقابلہ اور تاریخ ہند اور روم اور یونان اور انگلستان اور علم طبیعی اور جغرافیہ اور تاریخ ایران اور انتظام مدن اور اصول قوانین وغیرہ انگریزی اور فارسي وغیرہ سے ترجمہ ہوئیں - یہ کارنامہ یقیناً بجائے خود قابل فخر ہے - اگر سنہ ۱۸۴۷ع میں اردو کي وسعت کا یہ حال تھا تو اس زبان کو کیونکر کم مایہ کہا جا سکتا ہے - اگر اردو اُس زمانے میں ذریعۂ تعلیم قرار دے لی جاتي تو آج ڈاکٹر اشپرنگر اور اُن کے رفقائے کار کي کاوشوں کي بہت سي یادگاریں موجود ہوتیں -

اس مضمون کے ذریعے سے ایک یہ خیال بھي ظاہر کیا گیا تھا کہ دیسي ریاستوں کي ابتری کا باعث زیادہ تر جہالت ہوتی تھي - یہ بد نظمیاں " ریزیڈنٹ اور افسر اور فوج انگریزی رکھنے سے " دور نہیں ہو سکتي تھیں - ان کا واحد علاج تعلیم کا رواج تھا -

" سرکار انگریزي بہت سے خرچ رئیسوں ہندوستان پر کبھی فوج کنٹنجنٹ اور کبھی تیاری سڑک وغیرہ کے مقرر کرتی رہتي

هے - لیکن ان سب سے مفید خرچ مدرسوں کا هے اگر یه رئیس لوگ اور ان کي رعایا علم حاصل کریں تو وہ بے انتظامي جو ان کي ریاستوں میں اوقوع میں آتی هیں کیوں عمل میں آویں " -

یه مضمون خیالات اور مفاد کے لحاظ سے اس قابل هے که پورا نقل کر دیا جائے لیکن شاید مدیر " هندستاني " اتني جگه نه نکال سکیں - زبان کي کیفیت اقتباسات بالا سے معلوم هو سکتي هے - سیدهی سادهي سلیس زبان استعمال کي گئي هے جو علمي مباحث کے لیے موزوں هے - اس زمانے کے اخبـاروں اور رسالوں کي طرح شاندار لفظوں کی بهرمار اور مقفیٰ و مسجع عبارت اور افسانوي رنگ نهیں هے -

تیسرا مضمون هندؤں کے ایک فرقے " سنت نامی " کے بعض حالات کے متعلق هے - چوتهے مضمون میں نظام شمسی کے متعلق ابتدائي باتیں بتائي گئی هیں - جیسا که سطور بالا سے ظاهر هو گیا هوگا رساله بحیثیت مجموعی اچها اور کامیاب هے اور اگر واقعی یه اردو کا پہلا رساله تها تو کها جا سکتا هے که ابتدا کچھ بری نه تهي -

---

تتمّه

[مضمون بالا میں بعض اضافوں یا تشریحوں کی ضرورت تهي - اِس لیے یه تتمه شامل کیا جاتا هے - اداره -]

۱ - اردو زبان اور ادب کا مشهور فرانسیسي محقق گارساں دتاسي[1] غالباً پہلا شخص هے جس نے اپنی تصنیفات میں ' علاوه شاعروں

---

(1) GARCIN de TASSY - اردو کا پہلا فرانسیسي اُستاد ' جسے هندستان کی خاک پاک پر قدم رکهنا کبهي نصیب نه هوا ' پاریس میں بیٹھ کر کتابوں اور اخباروں وغیره سے معلومات حاصل کرتا رهتا اور جب کوئي هندستاني

کے ' نثرنویسوں کا بھی تذکرہ لکھا ہے - اس فاضل مصنف نے اردو اخباروں اور رسالوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے - چنانچہ اپنے ایک خطبہ میں ' جو اُس نے ۱۸۵۴ع میں پڑھا تھا ' کہتا ہے :—

" سنہ ۱۸۵۱ سے نئے ' پتھر کے چھاپہ‌خانے قائم ہو گئے ہیں جہاں سے دلچسپ تصنیفیں شائع ہوتی ہیں - نئے رسالے اور اخبار بھی جاری ہوئے ہیں اور پرانے تقریباً سب کے سب زندہ ہیں " [۱] -

دتاسی کے اِن لفظوں کو پڑھ کے کسی کے خیال میں بھی نہیں آتا کہ غدر سے پہلے جو جریدے شائع ہوتے تھے اُن کا ایک پرچہ بھی ضائع ہونے سے بچ گیا ہوگا ' خصوصاً اِس سبب سے کہ اردو مطبوعات کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کا کبھی کوئی خاطرخواہ انتظام نہیں ہوا - یہ معلوم کرکے تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی ہوتی ہے کہ بعض لوگوں کو کچھ ایسے نوادر اِس زمانے میں ہاتھ آئے ہیں - پچھلے ہی سال پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی نے دہلی کے ایک پرانے ماہانہ رسالے " محب ہند " کا حال شائع کیا ہے[۲] ' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس رسالے

اُدھر جا نکلتا تو اُس سے مل کر اردو زبان اور ادب پر ضرور گفتگو کرتا - جو مواد وہ اِس طرح پر جمع کر سکا وہ بہت وافر تھا اور اُسے وہ اپنی تصنیفوں میں نہایت خوبی سے کام میں لایا - ہر سال اپنے درس کے آغاز پر وہ ایک خطبہ اردو زبان اور ادب پر دیا کرتا تھا - یہ سلسلہ بیس برس جاری رہا اور یہ سالانہ خطبے *La Langue et la Litterature Hindoustanies de 1850 a 1869* (ہندستانی زبان اور ادب ' ۱۸۵۰ع سے لے کر ۱۸۶۹ع تک) کے نام سے الگ شایع ہوئے — اس کے بعد سنہ ۱۸۷۰ع سے لے کر ۱۸۷۷ع تک وہ ہر سال ایک تبصرہ شائع کرتا رہا اِن خطبوں اور تبصروں کے اردو ترجمے کا انتظام انجمن ترقی اردو نے کر لیا ہے اور ۱۹۲۳ع سے لے کر اِس وقت تک چودہ خطبوں کا ترجمہ رسالہ " اردو " میں نکل چکا ہے -

(۱) چوتھا خطبہ ' اصل فرانسیسی صفحہ ۲۱ (ترجمہ ' " اردو " ج ۴ ص ۱۳۰) - مگر پتھر کا چھاپا سنہ ۱۸۵۱ع سے بہت پہلے رائج ہو چکا تھا -

(۲) " ادبی دنیا " لاہور " نوروز نمبر ۱۹۳۲ع " ص ۹۸ -

کے کم سے کم سات شمارے جناب کیمپی کو ملے ھیں (۳ بابت ۱۸۴۹ء اور ۴ بابت ۱۸۵۰ء) - غالباً جلد کے شمار سلسلہ کسی دو سے پلنکت صاحب کا خیال ھے کہ '' یہ رسالہ جون ۱۸۴۷ء سے نکلنا شروع ھوا تھا اور کئی برس چلتا رہا '' - پرانے '' دھلی کالج '' کے ریاضی کے استاد ' اور انگریزی زبان میں بھی ریاضی کی بعض معرکۃالآرا تصنیفوں کے مصنف ماسٹر رام چندر اِس کے مہتمم تھے - دتاسی اپنے تیسرے خطبے (دسمبر ۱۸۵۲ء)[1] میں کہتا ھے :—

'' یہ [پروفیسر ' یعنی رام چندر[2]] دو رسالوں کا ایڈیٹر بھی ھے - اِن میں سے ایک خاص طور سے ذکر کے قابل ھے ' جس کا نام '' محب ھند ''[3] ھے - یہ ایک ماھانہ پرچہ ھے جس میں اھم ملکی معاملات پر ' دیسیوں کی تعلیمی حالت پر اور ھندستانی زبان کی ترقی پر مضامین ھوتے ھیں '' -

دوسرے رسالے کا ' جو ماسٹر رام چندر کی اِدارت میں نکلتا تھا ' دتاسی نے نام نہیں لیا ھے - مگر اُس کا پتا اُس رسالے سے چلتا ھے جس کا ایک پرچہ جناب اظہارالحسن صاحب کو ھاتھ آیا ھے کہ وہ بھی دھلی ھی سے ماھانہ شائع ھوتا تھا اور ایڈیٹر اُس کے بھی ماسٹر رام چندر ھی تھے مگر اس کا نام '' محب ھند '' نہیں بلکہ '' خیرخواہ ھند '' ھے - مضمون

---

(۱) '' خطبات '' ص ۱۳ ('' اردو '' ج ۳ ' ص ۳۹۵) -

(۲) دتاسی نے بجائے '' چندر '' کے '' چند '' لکھا ھے اور اِسی کے مطابق ترجمہ میں بھی ھے ' مگر اِس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ صحیح '' چندر '' ھے -

(۳) '' خطبات '' ص ۱۵ (ترجمہ ' ص ۳۹۷) - ترجمے میں غلطی سے '' محبوب ھند '' لکھا ھے -

اِن دونوں رسالوں میں ایک ہی قسم کے معلوم ہوتے ہیں ۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماسٹر رام چندر ایک ہی طرح کے دو رسالے کیوں نکالتے تھے ۔ دتاسی نے جو " خیرخواہ ہند " کا نام نہیں لیا اُس کی وجہ شائد یہ ہو کہ یہ رسالہ اُس تک نہ پہنچا ہو ۔ بخلاف اِس کے اُس نے ایک اور رسالے " خیر خواہ ہند " کا ذکر اپنے دسمبر سنہ ۱۸۵۲ع کے خطبے میں کیا ہے :۔

" مرزا پور سے ایک رسالہ ' خیر خواہ ہند ' امریکی پروٹسٹنٹ مشنریوں کی ادارت میں نکلتا ہے اور اُس کا مقصد [عیسائی] مذہب کی تبلیغ ہے "[1] ۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب ماسٹر رام چندر نے سنہ ۱۸۴۶ع میں اپنا " خیر خواہ ہند " نکالنا شروع کیا تو مشنریوں کے اس رسالے کا وجود نہ تھا یا پہلے کچھ خیال نہ ہوا ہو اور بعد کو اِس مرزاپور والے رسالے کی ہمنامی کے خیال سے اُسے بند کرکے جون سنہ ۱۸۴۷ سے اُس کی جگہ پر " محب ہند " نکالنا شروع کیا ہو ۔ مگر یہ معمّا تب ہی حل ہو سکتا ہے جب اِن رسالوں کے کچھ اور شمارے ہاتھ آئیں ۔

۲ ۔ ڈاکٹر اشپرنگر[2] کوئی گمنام شخص نہیں بلکہ مستشرقوں

---

(۱) ایضاً (چوتھا خطبہ) ، ص ۲۴ (" اردو " ج ۳ ، ص ۳۰۳) ۔ اِس مرزاپور والے رسالے کا ذکر پندرھویں خطبے (ص ۲۸۱ ، حاشیہ ۱) میں بھی کیا ہے ۔ اِس سے ثابت ہے کہ یہ رسالہ ۱۸۶۵ع تک ضرور جاری تھا ۔

(۲) پورا نام Alois Sprenger (تلفظ = الوئس اشپرنگر) ۔ جرمانی میں جب p یا t سے پہلے s آتا ہے تو اُس کا تلفظ بجائے س کے ش کیا جاتا ہے اور g کا تلفظ ہمیشہ گ ہی ہوتا ہے ۔

میں نہایت سر برآوردہ تھا[1] ' قومیت کے لحاظ سے جرمانی تھا - آسٹریا کے صوبے ترول کے ایک قصبے میں ۳ ستمبر سنہ ۱۸۱۳ع کو پیدا ہوا ' ویئن (پایۂ تخت آسٹریا) کی یونیورسٹی میں طب ' عبرانی اور عربی کی تحصیل کی ' بعد کو لائڈن (ولندیز) کی یونیورسٹی سے ایم - ڈی - کی سند حاصل کی - سنہ ۱۸۳۶ع میں انگلستان آیا اور انگریزی رعایا کے حقوق حاصل کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت بہ حیثیت طبیب کے اختیار کی - اِس طرح پر ستمبر سنہ ۱۸۴۳ع میں ہندستان پہنچا اور ایک ہی برس بعد " دھلی کالج " کا پرنسپل مقرر کیا گیا - سنہ ۱۸۴۷ع تک دھلی میں رھا - اُسی سال لکھنؤ میں " نائب رزیڈنٹ " کی

---

(۱) یورپ کے مختلف علمی رسالوں کی پرانی جلدوں میں اشپرنگر کے بہت سے گراں‌مایہ مقالے محفوظ ھیں - اُن کے علاوہ اُس نے کلکتے سے سعدی کی " گلستاں " کا ایک نہایت عمدہ ایڈیشن شائع کیا اور جلال‌الدین سیوطی کی بیش‌بہا تصنیف " کتاب‌الاتقان فی علوم‌القرآن " پہلے پہل اُسی نے شائع کی (کلکتہ سنہ ۱۸۵۲ - ۵۴ع) - جناب رسالت مآب کی سیرت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس کا صرف پہلا حصہ شائع ہوا (الہ‌آباد سنہ ۱۸۵۱ع) - ہندستان سے واپس جاکر اُس نے پوری کتاب جرمانی زبان میں تین ضخیم جلدوں میں شائع کی (برلین سنہ ۱۸۶۱ ' سنہ ۱۸۶۲ ' سنہ ۱۸۶۵ ، دوسری اشاعت سنہ ۱۸۶۹ع) - انگریزی میں " محمود غزنوی کی تاریخ " اور جرمانی میں " عرب کی قدیم جغرافیا " (برن سنہ ۱۸۷۵ع) اور ایک انتخاب عربی نظم و نثر کا بھی اشپرنگر سے یادگار ھیں - ہندستان میں قیام کے زمانے میں اُس نے یہاں کے چند باخبر عالموں کو اپنے ساتھ شریک کرکے ایک لغت علوم و فنون کی اصطلاحات کا عربی زبان میں تالیف کرنا شروع کیا اور " کشاف اصطلاحات‌الفنون " کے نام سے یہ کتاب کلکتہ سے شائع بھی ہوئی مگر اب نایاب ھے -

جگہ کچھ مدت کے لیے خالي هوئي اور اُس کے لیے گورنمنٹ نے اشپرنگر کو انتخاب کیا - وہ جنوری سنہ ۱۸۴۸ع میں لکھنؤ پہنچا اور کم و بیش دو برس لکھنؤ میں رہنے کے بعد پھر دلي واپس آیا ؛ مگر زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ سنہ ۱۸۵۰ع میں اُس کا تقرر کلکتے کے " مدرسۂ عالیہ " کی پرنسپلی پر ہوا ' ساتھ هي ساتھ هوگلی کے مدرسے کی صدارت اور فارسی کاغذات کے ترجمے کا کام بھی اُس کے سپرد هوا -

لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لارڈ هارڈنگ کے اشارے سے اشپرنگر نے شاہ اودھ کے کتب خانوں کی ایک تفصیلی فہرست ترتیب دینا شروع کي اور تیرہ برس میں دس هزار عربي ' فارسي ' ترکي ' پشتو اور اردو کتابوں کي فہرست تیار کي جس میں هر کتاب اور اُس کے مصنف کا مختصر حال درج تھا ؛ صرف اردو هي کے چودہ سو شاعروں کا حال اور اُن کے کلام پر مختصر تبصرہ تھا - اِس فہرست کي پہلی هی جلد کے چھپنے کي نوبت آئی[1] - معلوم هوتا هے کہ باقي مواد تلف هوگیا - انگریزي میں ایک " هندستاني گرامر " بھی اشپرنگر نے لکھی تھي جو اب کمیاب هے - سنہ ۱۸۵۸ع میں اشپرنگر خدمت سے دستکش هوکر یورپ واپس چلا گیا - یہاں سے جاکر برن (سویس) اور هائڈل برگ (جرمانیا) میں پروفیسر رہا اور ۱۹ دسمبر ۱۸۹۳ع کو هائڈل برگ میں انتقال کیا -

---

(۱) دیکھو اشپرنگر کي فہرست ' کلکتہ ۱۸۵۴ع ' ج ۱ ' دیباچہ ؛ اور سید مسعود حسن صاحب رضوي کا مضمون " غدر سے پہلے لکھنؤ کے شاهي کتب خانے اور مطابع " ' " ادبي دنیا " کے نو روز نمبر سنہ ۱۹۳۲ع میں (ص ۸۱ - ۸۳) -

۴ ـ اخباروں کے متعلق اشپرنگر کا بیان ہے کہ ہندستان کے شمالی صوبوں میں شاذ ہی کوئی ایسا شہر ہو جہاں سے کوئی اخبار نہ نکلتے ہوں[1] - یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سنہ ۱۸۳۰ع کے لگ بھگ پتھر کے چھاپےخانوں کے قائم ہوتے ہی اخبار بھی جاری ہو گئے تھے - اظہارالحسن صاحب ' شمس‌العلما آزاد کے اس بیان کو کسی قدر شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلا اردو اخبار سنہ ۱۸۳۶ع میں دہلی سے ان کے والد مولوی محمد باقر کے قلم سے نکلا[2] - اس شبہہ کرنے کی کوئی وجہ تو ہے نہیں - یہ اور بات ہے کہ شاید اس سے بھی برس چھ مہینے پہلے کوئی اخبار نکلا ہو ' جس کا علم آزاد کو نہ ہوا ہو - اظہارالحسن صاحب نے خود ہی جو نقل " خیر خواہ ہند " کے سرنامے کی اپنے مضمون میں دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ " مطبع دہلی اردو اخبار " میں چھپتا تھا اور " مولوی محمد باقر " کے مکان سے اس کی اشاعت ہوتی تھی - بہت ممکن ہے کہ یہ وہی مولوی محمد باقر

---

(۱) سید مسعود حسن صاحب اس بیان کو مبالغہ آمیز تصور کرتے ہیں ' اس بنا پر کہ " یہ حالت تو آج اسّی بیاسی برس گزر جانے کے بعد بھی نہیں " - سید صاحب نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ اردو صحافت برابر ترقی کرتی رہی اور آج عروج پر ہے ' مگر واقعہ اس کے برعکس ہے - حقیقت یہ ہے کہ رفتار نشیب کی طرف ہے - دتاسی سنہ ۱۸۵۳ع اور سنہ ۱۸۵۴ع میں آگرے ' دہلی اور میرٹھ سے علی‌الترتیب سات ' چھ اور دو اخباروں کا شائع ہونا بتاتا ہے - میں پوچھتا ہوں کہ آج ان شہروں سے کے اردو اخبار نکلتے ہیں ؟

(۲) دیکھو " آب حیات " ' لاہور سنہ ۱۹۱۷ م ' ص ۲۶ -

هوں اور اُن کا " اردو اخبار " سنہ ۱۸۳۷ع اور اُس کے بعد تک
بھی جاری رہا ہو - دتاسی نے بھی دھلی کے " اُردو اخبار "
کا ذکر کیا ہے گوکہ کہتا ہے کہ دھلی کا سب سے پرانا اخبار
" سراج‌الاخبار " تھا - شمس‌العلما آزاد کی ایک اور تحریر سے
معلوم ہوتا ہے کہ دلی کا " اردو اخبار " سنہ ۱۸۵۵ع کے اواخر تک
ضرور جاری تھا[1] -

اشپرنگر کے مرنے پر ایک انگریزی اخبار[2] نے اُس کی زندگی
کے مختصر حالات چھاپے جن کو رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے
نے نقل کیا[3] - اِس اخبار کا بیان ہے :—

" هندستان کو ڈاکٹر اشپرنگر کا شکر گزار ہونا چاهیے کہ اُسی
نے سب سے پہلا پرچہ (paper) دیسی زبان میں چھاپا جو
ایک ہفتہ وار پرچہ (periodical) تھا اور جو اُس کے [ڈاکٹر
اشپرنگر کے] سنگی چھاپے خانے میں (هندستانی زبان میں)
چھپتا تھا " -

ظاہر ہے کہ یہ پرچہ کوئی " اخبار " نہ ہوگا بلکہ ایک رسالہ ہوگا
جس میں علمی مضمون ہوتے ہوں گے - یہ بات زیادہ قرین قیاس
نہیں کہ اشپرنگر نے خود اپنا ذاتی چھاپہ‌خانہ جاری کیا ہو -
البتہ یہ ممکن ہے کہ اُس کی تحریک اور سرپرستی سے کوئی
چھاپہ‌خانہ قائم ہوا ہو - پہلے جو اخبار چھپتے تھے اُن میں
خبریں ہی ہوتی تھیں - ممکن ہے کہ اشپرنگر نے ایک ایسا

---

(۱) دیکھو دیوان ذوق مرتبۂ آزاد ' لاهور سنہ ۱۹۲۲م (دیباچہ) ص ۱۸ -

(۲) *Homeward Mail* -

(۳) جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی بابت ۱۸۹۳م ' ص ۳۹۳ -

ہفتہوار رسالہ[1] جاری کیا ہو ' جس میں علمی اور ادبی
مسئلوں پر مستقل مضمون ہوتے ہوں اور اُسی کی تقلید
" خیر خواہ ہند " اور " محب ہند " نے کی ہو - اِس
طرح پر کہا جا سکتا ہے کہ پہلا اردو رسالہ دہلی سے سنہ ۱۸۴۴ع
سے سنہ ۱۸۴۹ع تک کسی وقت جاری ہوا - لیکن یہ سمجھ
میں آنے والی بات نہیں کہ اشپرنگر کا رسالہ دتاسی تک نہ پہنچا
ہو - وہ اشپرنگر کا " دہلی کالج " کا پرنسپل ہونا تو بیان کرتا
ہے مگر اُس سے کسی اخبار یا رسالے کو منسوب نہیں کرتا -

اِن سب باتوں پر نظر کرکے اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ " خیرخواہ
ہند " ہی وہ رسالہ تھا جو سب سے پہلے (یعنی سنہ ۱۸۴۹ع
میں) ڈاکٹر اشپرنگر کی تحریک سے جاری ہوا اور جو
شاید پہلے کچھ دن ہفتہوار نکلتا رہا ہو اور بعد کو ماہانہ کر
دیا گیا ہو - (ص) -

---

(۱) سب سے پہلے اخبار کلکتے سے نکلے : — ۱۷۸۰ع میں پہلا انگریزی اخبار
جاری ہوا - غالباً تھوڑے ہی دن بعد فارسی اخباروں کی ابتدا ہو گئی تھی '
مگر سب سے پرانا فارسی اخبار ' جس کا نام معلوم ہے ' " جام جہاں نما "
(ہفتہ وار) تھا جو ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ع کو جاری ہوا - ایک برس بعد اِس میں
ایک حصہ اُردو کا بھی شامل ہوا مگر اِس کی مانگ نہ تھی اِس لیے تھوڑے
دن بعد حذف کیا گیا - مرآۃالاخبار بھی ۱۸۲۲ع میں نکلا مگر ایک سال بعد
بند ہو گیا - اِن کے علاوہ :— شمس الاخبار (۱۸۲۳ع - فارسی اور اُردو) '
بنگال ہیرلڈ (۱۸۲۹ع - انگریزی ' فارسی ' بنگالی اور ناگری) ' سماچار سُبھ
راجندر (۱۸۳۰ع - فارسی اور بنگالی) اور صرف فارسی میں آئینۂ سکندر
(۱۸۳۱ع) ' ماہ عالم افروز (۱۸۳۳ع) ' سلطان الاخبار (۱۸۳۵ع) اور مہر
منیر (۱۸۳۱ع) - شمالی ہند میں پہلا فارسی اخبار ' اخبار لدھیانہ ' کے نام سے
۱۸۳۵ع میں لدھیانے سے نکلا -

عمرانیت کے نظریے

از ڈاکٹر جعفر حسن، پی ایچ ڈی -

(ا) عمرانیات کی مختصر تشریح

باوجود گوناگوں تصورات اور غلطفہمیوں کے جو عمرانیات کے متعلق تعلیم یافتہ طبقوں میں پائی جاتی ہیں یہ کہنا صحیح ہے کہ دیگر عمرانی علوم مثلاً معاشیات، سیاسیات اور نفسیات کی طرح عمرانیات بھی ایک مستقل اور جداگانہ علم ہے، اور جس طرح معاشیات کا موضوع دولت اور سیاسیات کا سلطنت ہے اسی طرح عمرانیات کا موضوع معاشرہ یعنی سوسائٹی ہے -

انسان کس قسم کی اجتماعی زندگی اختیار کرتا ہے؟ اگر وہ واقعی "معاشی انسان" (Homo œconomicus) یعنی ہمیشہ اپنا مالی فائدہ پیش نظر رکھنے والا اور ہمیشہ زیادہ سے زیادہ دولت کے لیے جد و جہد کرنے والا ہے تو وہ سوسائٹی کے مفاد کی خاطر قربانیوں پر آمادہ ہو کر بسا اوقات کیوں ذاتی نقصان بھی خندہ پیشانی سے اختیار کرتا ہے؟ انسان خاص خاص رسوم و عادات کو جو عقلاً مضر تصوّر کیے جاتے ہوں بغیر چون و چرا کے کیوں تسلیم کر لیتا ہے؟ جماعتوں، مجمعوں اور طبقوں میں ہر آدمی کی انفرادی فطرت و جبلت پر اجتماعی ذہنیت کا کیونکر تسلط ہو جاتا ہے؟ بچوں اور نوواردوں پر نئی تہذیب و شایستگی یعنی نئے تمدنی ماحول کا

کیا اور کس طرح اثر ہوتا ہے ؟ اور ہر ملک کی تہذیب و
شایستگی خود کس طرح اُس ملک کے معاشی ' جغرافی اور طبعی
خصوصیات کا نتیجہ ہوتی ہے ؟ یہ اور اِسی قسم کے بیسیوں
سوالات ایسے ہیں جنکی خاطر خواہ تحلیل کی کوشش میں
عمرانئین عالم مصروف ہیں ۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ
اُنہیں کامل کامیابی نصیب ہوئی ہے تاہم اُس قدر ضرور ماننا
پڑے گا کہ اِن مسائل کے حل میں اُنہیں بڑی حد تک کامیابی
نصیب ہوئی ہے اور وہ اس فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ جہاں
کہیں ابھی تک علم کی روشنی نہیں پہنچی وہاں بھی حقیقت
کا انکشاف کریں اور جہاں تک ہو سکے تحقیق کے ذریعے
ناواقفیت کی تاریکی کو دور کریں -

(۲) نفس انفرادی اور نفس اجتماعی

عمرانی ماحول کے اثرت کو بخوبی سمجھنے کے لیے خود نفس
انفرادی اور نفس اجتماعی کی تشریح و تفریق ضروری ہے کیونکہ
عمرانیت کا یہ پہلا نظریہ ہے کہ فرد نہیں بلکہ جماعت '
حکومت نہیں بلکہ معاشرہ ' سلطنت نہیں بلکہ سوسائٹی دنیا
کی سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ طاقتور ہستی ہے -
عمرانیات نے معاشرت کی فطرت دریافت کرنے کی خاطر جو
تحقیقات کی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ نفس انفرادی اور نفس
اجتماعی میں بہت بڑا فرق ہے - اگر یہ دونوں ایک ہی ہوتے
تو ہم تمام اقوام عالم کی ذہنیتوں میں مطابقت اور یکسانی
پاتے مگر واقعہ یہ ہے کہ مختلف اقوام کی ذہنیتوں میں
مطابقت و یکسانیت تو درکنار ایک ہی قوم کے مختلف فرقوں
اور طبقوں میں یکسانیت نہیں پائی جاتی - نفس انفرادی سے

مُراد جانداروں کي وہ فطری خصوصیات ھیں جو فطرت کی طرف سے انسان کي طبیعت میں ودیعت کي گئی ھیں اور جو ھر انسان میں پائی جاتي ھیں - بھوک پیاس کو دور کرنے کے لیے کھانے پینے کی رغبت ' چین آرام سے بسر کرنے کے لیے معاشي دولت کي تمنا ' زیادہ سے زیادہ آرام کے لیے کم سے کم محنت کرنے کی آرزو ' تحفظ ذات کا جذبہ اور جنسي جبلت ' نفس انفرادي کو ظاھر کرنے والی خصوصیتیں ھیں - اگر کسی دور افتادہ جزیرے میں جہاں تمدن کا اثر مطلق نہ پہنچا ھو ' چند وحشي آدمي رھتے ھوں تو اُن میں بھي یہ خصوصیات موجود ھونگي - بھوک اور پیاس کي تڑپن ' جنسي تعلقات کے لیے بیچیني ' خود کو بچانے کی تمنا اُن میں بھی اُسي شدت اور وسعت کے ساتھ موجود ھو گي جیسے کسي مُتمدن ملک کے باشندے میں ھوتی ھے - چنانچہ وسطي افریقہ ' آسٹریلیا اور جنوبي امریکا کے صحراؤں ' وادیوں اور جنگلوں میں ایسے نیم وحشي نیم‌جنگلی قبائل پائے جاتے ھیں جو دور ترقی کے بالکل ابتدائي مدارج پر ھیں - برھنگی وھاں عیب نہیں ' بیپردگي گناہ نہیں ' عیوب و جرائم کا اُنھیں احساس نہیں ' افلاس و ناداري کي اُنھیں پروا نہیں - بےزبان جانوروں کي طرح وہ زندگي کے دن کاٹ رھے ھیں اور اُنکي اجتماعی زندگي صرف اُس ایک قانون کے تحت ھے جس کا احترام متمدن ممالک کي مہذب حکومتیں بھي کرتي ھیں - وہ قانون قوت بازو ھے - بہر طور نفس‌انفرادي میں صرف چند بشري رحجانات داخل ھیں جو فطری ' جبلی اور پیدائشی ھوتے ھیں -

برخلاف نفس‌انفرادی کے نفس‌اجتماعي سے مراد وہ کیفیات

و خصوصیات هیں جو کسي فرد میں بحیثیت فرد کے موجود نہیں ہوتے بلکہ خانداني تربیت ' معاشرتي اثرات ' قومي ذہنیت ' مذہبي تعلیم ' ملکي روایات اور جماعتي تاثرات کے ذریعے سے پیدا ہوتے بلکہ پیدا کیے جاتے ہیں ' عمراني فضا میں نشو و نما پاتے ہیں ' معاشرتی ماحول میں تقویت پاتے اور بالآخر قلب انساني میں اس طرح جاگزیں ہوجاتے ہیں کہ بالکل فطري اور پیدائشي معلوم ہونے لگتے ہیں ' حالانکہ حقیقتاً وہ اکتسابي ہوتے ہیں - چھوٹوں کا لحاظ ' بڑوں کا ادب ' بزرگوں کي تعظیم ' آداب نشست و برخاست کي پابندي ' وجدانات اور تعصبات ' پیدائشی نہیں ہوتے بلکہ معاشرتي عادات کے وسیلے سے نشو و نما پاتے ہیں -

(۳) نفس اجتماعي کي اہمیت اور لُڈوِک گمپلووِتس[۱] کے تخیلات

نفس اجتماعي کي تعریف و تشریح سے واقف ہونے کے بعد اُسکي اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اُس کے مقابلے کي ' دنیا میں صرف دو قوتیں اور ہیں :- (۱) معاشي اغراض اور (۲) اقتصادي مصلحتیں - جو اقتدار اِن دو میں پایا جاتا ہے وہ اُسي درجے کا ہے جس درجے کا اقتدار نفس اجتماعي میں موجود ہے بلکہ بعضوں کا خیال ہے کہ نفس اجتماعي کے مقابلے میں معاشی اغراض ' سیاسي اقتدار ' حتیٰ کہ نفس انفرادی کو بھي مساوي اہمیت حاصل نہیں - دنیا کي تاریخ میں اور عہد حاضر میں ہمیں بے شمار مثالیں اس

---

(۱) لُڈوِک گمپلووِتس -

مراد جانداروں کی وہ فطری خصوصیات ہیں جو فطرت کی طرف سے انسان کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہیں اور جو ہر انسان میں پائی جاتی ہیں - بھوک پیاس کو دور کرنے کے لیے کھانے پینے کی رغبت، چین آرام سے بسر کرنے کے لیے معاشی دولت کی تمنا، زیادہ سے زیادہ آرام کے لیے کم سے کم محنت کرنے کی آرزو، تحفظ ذات کا جذبہ اور جنسی جبلت، نفس انفرادی کو ظاہر کرنے والی خصوصیتیں ہیں - اگر کسی دور افتادہ جزیرے میں جہاں تمدن کا اثر مطلق نہ پہنچا ہو، چند وحشی آدمی رہتے ہوں تو اُن میں بھی یہ خصوصیات موجود ہونگی - بھوک اور پیاس کی تڑپن، جنسی تعلقات کے لیے بیچینی، خود کو بچانے کی تمنا اُن میں بھی اُسی شدت اور وسعت کے ساتھ موجود ہو گی جیسے کسی مُتمدن ملک کے باشندے میں ہوتی ہے - چنانچہ وسطی افریقہ، آسٹریلیا اور جنوبی امریکا کے صحراؤں، وادیوں اور جنگلوں میں ایسے نیم وحشی نیم‌جنگلی قبائل پائے جاتے ہیں جو دور ترقی کے بالکل ابتدائی مدارج پر ہیں - برھنگی وہاں عیب نہیں، بےپردگی گناہ نہیں، عیوب و جرائم کا اُنھیں احساس نہیں، افلاس و ناداری کی اُنھیں پروا نہیں - بےزبان جانوروں کی طرح وہ زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور اُنکی اجتماعی زندگی صرف اُس ایک قانون کے تحت ہے جس کا احترام متمدن ممالک کی مہذب حکومتیں بھی کرتی ہیں - وہ قانون قوت بازو ہے - بہر طور نفس‌انفرادی میں صرف چند بشری رحجانات داخل ہیں جو فطری، جبلی اور پیدائشی ہوتے ہیں -

برخلاف نفس‌انفرادی کے نفس‌اجتماعی سے مراد وہ کیفیات

و خصوصیات ھیں جو کسي فرد میں بحیثیت فرد کے موجود
نہیں ہوتے بلکہ خانداني تربیت ' معاشرتي اثرات ' قومي
ذہنیت ' مذہبي تعلیم ' ملکي روایات اور جماعتي تاثرات کے
ذریعے سے پیدا ہوتے بلکہ پیدا کیے جاتے ہیں ' عمراني فضا
میں نشو و نما پاتے ہیں ' معاشرتی ماحول میں تقویت پاتے
اور بالآخر قلب انساني میں اس طرح جاگزیں ہوجاتے ہیں کہ
بالکل فطري اور پیدائشي معلوم ہونے لگتے ہیں' حالانکہ حقیقتاً
وہ اکتسابي ہوتے ہیں - چھوٹوں کا لحاظ ' بڑوں کا ادب '
بزرگوں کي تعظیم ' آداب نشست و برخاست کي پابندي '
وجدانات اور تعصبات ' پیدائشی نہیں ہوتے بلکہ معاشرتي عادات
کے وسیلے سے نشو و نما پاتے ہیں -

(۴) نفس اجتماعي کي اہمیت اور لُدوِگ
گمپلووِتس[1] کے تخیلات

نفس اجتماعي کي تعریف و تشریح سے واقف ہونے کے بعد
اُسکي اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ
اُس کے مقابلے کي ' دنیا میں صرف دو قوتیں اور ہیں :- (۱)
معاشي اغراض اور (۲) اقتصادي مصلحتیں -- جو اقتدار اِن دو
میں پایا جاتا ہے وہ اُسي درجے کا ہے جس درجے کا اقتدار نفس
اجتماعي میں موجود ہے بلکہ بعضوں کا خیال ہے کہ نفس
اجتماعي کے مقابلے میں معاشی اغراض ' سیاسي اقتدار ' حتیٰ
کہ نفس انفرادی کو بھي مساوي اہمیت حاصل نہیں - دنیا کي
تاریخ میں اور عہد حاضر میں ہمیں بے شمار مثالیں اس

(۱) لُدوِگ گُمپلووِتس -

حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ملتی ھیں کہ انسان سب سے زیادہ نفس اجتماعی یا بہ الفاظ دیگر اُس کو پیدا کرنے والی سوسائٹی کا احترام کرتا ھے - بقول لڈوگ گمپلووتس کے " انفرادی نفسیات کی سب سے بڑی غلطی یہ ھے کہ اُس نے تسلیم کر لیا کہ فرد سوچتا ھے - حالانکہ حقیقت میں فرد نہیں سوچتا بلکہ جماعت سوچتی ھے - اُس کے خیالات کا اصلی سرچشمہ خود اُس میں نہیں بلکہ اُس عمرانی ماحول میں ھے جس میں وہ رھتا ھے - اُس کے خیالات کا ماخذ اُس کی عمرانی فضا ھے - ھمارے خیالات و خواھشات ' احساسات و کیفیات ' وجدانات و رحجانات اُن اثرات کا نتیجہ ھیں جو ھمارے بچپن سے ھم پر پڑ رھے ھیں[۱] " -

ھمارا ادبی مذاق ' ھمارا طریق گفتگو اور ھمارا لباس ' ھماری غذا ' ھمارا طرز زندگی اور ھماری ذھنیت ' ھمارے معیار اخلاق ' ھمارے شوق اور ھمارے جمالیاتی احساسات وھی ھوتے ھیں جو ھماری جماعت کے ھیں - ھماری سیاسی ' عمرانی ' معاشی اور مذھبی جد و جہد پر ھماری سوسائٹی کا گہرا اثر پڑتا ھے اور یہ ایک عالمگیر قانون ھے جس کی تردید چند مستثنیات سے یا کسی اصلاحی دور کے تاریخی شواھد سے نہیں ھوسکتی - جس طرح حبشیوں کا بچہ حبشی ' چینیوں کا چینی ' امریکیوں کا امریکی ' ھندستانیوں کا ھندستانی ھوتا ھے اور ھر ایک کی جسمانی تشکیل ' عضویاتی خصوصیات اور رنگ روپ سے اُس کا علی الترتیب حبشی ' چینی ' امریکی

---

(۱) دیکھو Ludwig Gumplowicz کی تصنیف *Grundriss der Soziologie* مطبوعۂ Wien ۱۸۸۵ء ' ص۱۶۳ -

یا ہندستانی ہونا ظاہر کرتا ہے اُسی طرح خاندانی تربیت ' قومی ذہنیت ' مذہبی تعلیم اور عمرانی فضا کے اثرات کی بدولت انسان بعینہ اپنی معاشرت کا نقش ہوتا ہے اور بجز اُن لوگوں کے جن میں غیر معمولی انفرادیت یا کسی خاص قسم کی انتہائی قابلیت ہوتی ہے یعنی بجز اُن لوگوں کے جو یگانۂ روزگار (Genius) یا پیدائشی طور پر مصلح معاشرت ہوتے ہیں تقریباً ہر شخص میں اثرپذیری کا انتہائی مادہ ہوتا ہے - اگر تعدادی اندازہ کرنے کی اجازت دی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر لاکھ انسانوں میں سے ۹۹ہزار ۹ سو ۹۹ کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اُن پر جو جماعتی اثرات پڑتے ہیں اُنہیں کے سانچے میں وہ ڈھل جاتے ہیں - رہے مستثنیات سو اُن سے کسی نظریے کی تردید نہیں کی جاسکتی - اصول و قوانین کے مرتب کرتے وقت عام صورت حالات کا لحاظ کیا جاتا ہے علوم عمرانی ' مثلاً معاشیات ' اخلاقیات ' نفسیات اور سیاسیات کے قوانین کی تردید اگر مستثنیات سے کی جانے لگے تو میرا یہ دعویٰ ہے کہ ایک قانون بھی ایسا پیش نہ کیا جاسکے گا جس میں ریاضی کی سی قطعیت پائی جائے -

ہمارے عادات و اطوار ' خیالات و تصورات ' افعال و افکار ' فعلیت و ذہنیت حد و انتہا یہ کہ جذبات و وجدانات پر نفس اجتماعی کا جس قدر گہرا اثر پڑتا ہے اُسکی اہمیت ' تشریح و توضیح سے زیادہ مثالوں سے ظاہر کی جاسکتی ہے - بعض قدامت پرست ہندو گھرانوں میں اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو تعلیم نسواں کے سخت مخالف اور پردے کے بڑے پُرجوش حامی ہیں - اِن کا یہ مقولہ کہ " ودیا کا ایک اکشر بھی

کلیا کے کان میں جانا مہاپاپ ہے " اب بھی اِن دقیانوسی حلقوں میں نظر استحسان سے دیکھا جاتا ہے اور بہتیرں اس قول پر عمل بھی کرتے ھیں - اگر یہی لوگ کسی مغرب پرست تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے ہوتے تو ناممکن تھا کہ اِن میں اس قسم کی ذھنیت پیدا ہوتی - اِس امر کو تسلیم کرنا لازمی ہے کہ ہر قوم و مذہب کے لاکھوں اور کروڑوں انسان جو اپنے مذہب کو سچا ' اپنی قوم کو سب سے بہتر اور اپنی زبان کو سب سے زیادہ شیریں سمجھتے ھیں تو اس کی وجہ علم یا عقل نہیں بلکہ محض نفس اجتماعی کا اثر ہے - یہ ایک بالکل لایعنی بات ہو گی اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ہر مولوی یا ہر پنڈت یا ہر پادری خلوص اور بےتعصبی ' نیک‌دلی اور سچائی ' شوق اور انہماک سے دنیا کے مختلف مذاہب کا مطالعہ اور مقابلہ کرنے کے بعد اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اُس کا مذہب برحق اور دوسروں کا باطل یا ناقص ہے - یہ محض نفس اجتماعی کا اثر ہے جسکی وجہ سے تقریباً ہر مولوی اسلام کو ' ہر پنڈت ہندو مت کو یا ہر پادری عیسائی مت کو سچا مانتا ہے - برہمن ذات کے بہت سے حضرات جو دل و جان سے قومی آزادی اور سوراجی حکومت کے لیے لڑ رہے ھیں ہندستانی بھائیوں میں سے پانچ کروڑ اچھوت ذات والوں کی علانیہ انتہائی تحقیر و تذلیل کرتے ھیں .. اُنھیں انسانی حقوق دینے کے روادار نہیں ہوتے ' اُن سے ہمدردی اور مساوات کا برتاؤ نہیں کرتے ' اُنھیں دیوتاؤں کے مندروں میں پوجا پاٹ کے لیے بھی نہیں آنے دیتے ' غرض کہ اُن کے حقوق کو پامال کرتے ھیں اور پھر بھی اپنے کو

ملک کی آزادی کا وکیل سمجھتے ہیں[1]

ہم جانتے ہیں کہ اسلام ہی پہلا مذہب ہے جس نے مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو بھی حقوق عطا کیے - انہیں نہ صرف اپنے ذاتی معاملات مثلاً شادی بیاہ ' طلاق و خلع کی حد تک کامل آزادی دی بلکہ ذاتی جائداد اور آبائی حصے کا حق دے کر انکی ذاتی اور آبائی جائداد کو ان کے کامل تصرف میں دیا - شوہر پر مہر کی ذمہ داری عائد کرکے عورت کی حیثیت بڑھا دی - مگر آج بھی نسوانی حقوق کس بیدردی سے پامال کیے جارہے ہیں - انکی ذاتی جائداد ' ان کے آبائی حصے اور ان کے زیورات پر مردوں نے کس طرح قبضہ کر لیا ہے اور انہیں تعلیم و تدریس سے محروم رکھ کر کس درجہ اپنا مطیع اور فرماں بردار بنا رکھا ہے[2] نظری حقوق اور چیز ہے ' حقیقی برتاؤ جداگانہ شے ہے - اگر دریافت کیا جائے کہ یہ سب کیوں گوارا کیا جاتا ہے تو جواب یہی ہوگا کہ نفس اجتماعی نے ہماری ذہنیت اس قدر بدل دی ہے کہ ہم شرعی اصول اور مذہبی آئین کی واقفیت کے باوجود سوسائٹی کے طریقے پر چلتے ہیں -

---

(۱) یہ سطور گاندھی جی کے فاقے سے قبل لکھے گئے تھے - اگرچہ انکے فاقے کے بدولت ایک اہم ذہنی انقلاب ہوا مگر گاندھی جی کی اس تحریک کی مخالفت کرنے والے اب بھی ہزاروں ہیں -

(۲) جرمانیا کے مشہور مستشرق پروفیسر بیکر نے سچ کہا ہے کہ " جہاں تک جائداد کا تعلق ہے مسلمان عورتوں کے حقوق جرمانی عورتوں کے حقوق سے جو انہیں جرمانی قانون کی رو سے حاصل ہیں زیادہ اور بہتر ہیں " - '*Islamstudien*' از C. H. Becker مطبوعۂ Leipzig سنہ ۱۹۲۴ء ص ۶۱ -

دنیا کے تمام نظامہاے اخلاق میں صداقت اور صاف‌گوئي کي بہت تاکید کي گئي ہے مگر سوسائٹی کا حکم ہے کہ کچھ نہیں تو تہذیب و شائستگي هي کي خاطر کسي قدر غلط بیاني کرو - چنانچہ بالعموم جب کسي سے تعارف ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ " آپ سے ملکر بڑي مسرت ہوئي " - عین کام کے وقت میں اور انتہائی مصروفیت کے عالم میں بھي کوئي کرم‌فرما آن کر مخل ہوں اور جاتے وقت تضیع اوقات کي عذرخواهي کریں تو ہم اُن کی دلجوئي کي خاطر اُس کي ملاقات کو عزت افزائي ' ذرہ‌نوازي اور دوست‌پروري سے تعبیر کرتے ہیں - خلاصہ یہ کہ اخلاقیات اور معاشرے کے دستور میں جب کبھي اختلاف پڑ جاتا ہے تو همارا حقیقي عمل معاشرے هي کے دستور سے مطابقت کرتا ہے -

ہر حکومت کے سیاسی آئین اُس ملک کے معاشرتی خیالات سے بڑي حد تک مطابقت کرتے ہیں - برطانوی حکومت هند هندؤوں اور مسلمانوں کے معاشرتی رسوم و رواج میں حتي‌المقدور مداخلت نہیں کرتي[۱] - اگر بیجا مداخلت وسیع پیمانے پر ہو تو اُس کا وهي حشر ہوگا جو غازی شاہ امان‌الله خاں کي حکومت کا ہوا - شہنشاہ اکبر کي اصلاحي کوششوں اور تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے ونسنٹ

---

(۱) اگر مداخلت ہوتي بھي ہے تو زیادہ تر هندستانیوں کي خواهش اور اُن کے قائدین کے اصرار اور اُنھیں کے برتے پر - راجہ رام‌موهن راے کي کوشش کی بدولت ستي کي ممانعت ہوئي اور راے هربلاس ساردا کي اصلاحي جد و جهد کا نتیجہ بچوں کي شادي کي ممانعت میں نمودار ہوا - حکومت نے متعلقین معاشرت کا هاتھ بٹایا کہ اپنی طرف سے ابتدا نہیں کي -
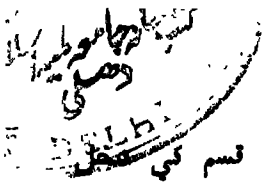
اسمتھ کہتا ھے :— " اگر برطانوی حکومت اس قسم کی دھی کرے تو وہ ایک ھفتے بھی نہ تک سکے[1] " -

فرض کہ سلطنت کا دار مدار معاشرت پر اور معاشرت کا انحصار نفس اجتماعي پر ھے جسکي قوت سب سے زیادہ اُس وقت ظاھر ھوتي ھے جبکہ ھم نفس اجتماعي کا تقابل نفس انفرادي سے کرتے ھیں - سب جانتے ھیں کہ حواس خمسہ کیسي زبردست طاقتیں ھیں مگر نفس اجتماعي کے مقابلے میں بسا اوقات وہ بھي بےبس ھو جاتي ھیں -

ماھرین نفسیات... ..کي دانست میں انسانوں کے دو جذبات سب سے زیادہ قوي ھوتے ھیں - ایک تو تحفظ ذات کا جذبہ دوسرے اولاد کی محبت ؛ مگر یہ دونوں جذبات بھي نفس اجتماعی کے مقابلے میں کوئي اھمیت نہیں رکھتے - میں آپ سے پوچھتا ھوں کہ گذشتہ صدي کے اوائل تک اور اب بھی کبھي کبھي جب قدیم ھندواني تہذیب کے بموجب ھندو عورت اپنے مردہ شوھر کے ساتھ ستي ھو جانے پر آمادہ ھوتي ھے تو کیا اُس میں یہ تحفظ ذات کا جذبہ نہیں ھوتا ؟ زمانۂ جاھلیت کي عرب عورتیں جب اپني معصوم لڑکیوں کو زندہ دفن کروادیتي تہیں تو کیا اُن میں اولاد کی محبت نہیں ھوتي تھی[2] - چین میں

---

(۱) دیکھو *History of India* از V. Smith مطبوعۂ ۱۹۲۳ع ص ۳۶۰ -

(۲) دو امریکي علماے نفسیات Krueger اور Reckless متعدد اقوام اور قبائل میں طفل‌کشي کے عام رسوم کا تذکرہ کرنے کے بعد اپني تصنیف *Social Psychology* (مطبوعۂ لندن سنہ ۱۹۳۱ع ص ۱۶۲) میں لکھتے ھیں :— " یہ خیال کرنا نري حماقت ھوگا کہ اولاد کي محبت کا جذبہ تمام بني‌نوع انسان میں یکساں طور پر موجود ھے " -

اِس جملے کي اھمیت کا اندازہ اُسي وقت بخوبي ھو سکیگا جبکہ اِس کے قبل کےدس بارہ صفحات کا مطالعہ کیا جائے -

ابھی تک یہ ہوتا تھا (اور غالباً آج کل بھی دیہات کے شریف قدامت‌پرست گھرانوں میں یہی ہوتا ہوگا) کہ جب لڑکی پیدا ہوتی تھی تو چینی تہذیب کے مطابق اُس کے اچھے خاصے پیر انتہائی بیرحمی سے تنگ سانچوں میں ڈالکر مجروح کیے جاتے تھے - اِس طرح لڑکی چلنے پھرنے سے معذور کی جاتی تھی - ہندستان یا انگلستان میں کوئی شخص اس کو گوارا نہ کریگا مگر چینی مائیں بخوشی اپنی تندرست اولاد کی ایذا رسانی قبول کرتی تھیں - کیا اُن میں اولاد کی محبت نہیں ہوتی تھی ؟ کیا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اُن کی اولاد دکھ درد سے محفوظ رہے ؟ گذشتہ جنگ عظیم میں ہزاروں انگریزوں نے جبری بھرتی کے قانون کے نافذ ہونے سے قبل ہی بخوشی قوم پر جان قربان کرنا گوارا کیا - تحفظ ذات کی جبلت اُنھیں جنگ کے میدان سے دور رکھنے میں کیوں نہ کامیاب ہوئی ؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ قومی ذہنیت اور خاندانی تربیت نے اُن کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ خود کو بچانے سے قوم کی خاطر خود کو قربان کرنا بہتر ہے - اسی طرح بعض مواقع پر بھوک‌ہڑتال ' خودکشی ' تپسیا ' سنیاس ' بیراگ اور خودفراموشی نہ صرف ضروری بلکہ مفید بھی ہیں اور اس امر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ خواہش زیست یا تحفظ ذات کی جبلت سے زیادہ طاقتور نفس اجتماعی کی قوت ہے جس سے مجبور ہو کر انسان اپنی دولت قربان کرتا ہے ' اپنے ارمانوں کا خون کرتا ہے ' اپنی اولاد کو اور خود کو بھینٹ چڑھاتا ہے -

مزید تمثیلات کی ضرورت نہیں - ہم انھیں مثالوں سے

بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر یہی لوگ بجائے ہندستان کے یورپ یا امریکہ میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان میں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہونا ناممکن ہوتا - یہ نفس اجتماعی کی طاقت ' سوسائٹی کا دباو ' معاشرے کی قوت ہے جس سے انسان کی فطری جبلتیں بھی بے بس ہو جاتی ہیں - جب نفس اجتماعی انسان کی ذہنیت کو گھیر لیتا ہے تو عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے ' آنکھوں کے آگے تاریکی چھا جاتی ہے ' اور نفس انفرادی کی جبلتیں نفس اجتماعی کے دام میں پھنس کر پھڑ پھڑاتی رہتی ہیں -

(۳) عمرانیت کے اسباب

قبل اس کے کہ عمرانیت کے ذرائع یا وسائل کا ذکر کیا جائے عمرانیت کے اسباب پر مختصراً تبصرہ کرنا ضروری ہے - یہ امر ہمیشہ سے محققین علم تمدن کے لیے موجب حیرت رہا ہے کہ ہر قوم کی ذہنیت ایک مخصوص قسم کی کیوں ہوتی ہے اور ہر قوم کی قومی ذہنیت کی تشکیل میں کن حالات کا اثر پڑتا ہے اور اس کے کیا اسباب ہوتے ہیں - جہاں تک مورخین ' معاشیین اور عمرانیین نے غور کیا عمرانیت کے چار یا پانچ ہی اسباب دریافت ہوئے - سب سے پہلے تو عمرانیت کا سبب جغرافی ماحول ہوا کرتا ہے یعنی ملک کا محل وقوع ' گرمی اور سردی ' بارش کی قلت و کثرت ' زراعتی زرخیزی ' معدنی کانیں - یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ قومی سیرت اور قومی خصوصیات کی تشکیل پر موسم کا اور ملک کے جغرافی ماحول کا زبردست اثر پڑتا ہے - ہم جانتے ہیں کہ موسمی اثرات و اسباب قومی ترقی میں حائل یا معاون ہوتے ہیں - یہ

واقعی اصلی سیرت یا فی نفسہ سیرت کا اثر نہیں ہے کہ وسط افریقہ کے حبشی انتہا کے لاپروا ' کاهل ' پست همت ' کمزور ' بزدل ' متلون المزاج اور آرام طلب ہوتے ہیں اور سوئٹزرلینڈ کے کسان چست ' چالاک ' محنتی ' جفاکش ' باهمت ' مستقل مزاج اور مستعد ہوتے ہیں بلکہ وسطی افریقہ کی کڑاکے کی گرمی اور سوئٹزرلینڈ کی خوشگوار آب و ہوا افریقیوں اور سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کی سیرت کا سبب ہیں کیونکہ یہ حبشی وسطی افریقہ کے جہنم میں اور سویس لوگ یورپ کی جنت میں رہتے ہیں -

هندستان کے تہذیب و تمدن ' شائستگی اور اخلاق پر آریاؤں اور مسلمانوں کا بڑا اثر پڑا - قدیم هند میں آریائی اقوام اور قرون وسطی میں مسلمان زیادہ تر شمال مغربی دروں کی راہ هندستان میں داخل ہوئے - اگر یہ درے بجائے شمال مغرب میں ہونے کے شمال مشرق میں ہوتے اور شمال مغربی سرحد مثل موجودہ شمال مشرقی سرحد کے سر بفلک پہاڑوں اور دشوار گذار جنگلوں کی وجہ سے محفوظ ہوتی تو ہم هندستان میں آج آریائی اور اسلامی اثرات و خصوصیات نہ پاتے بلکہ ہمارے تہذیب و تمدن پر ' ہمارے عادات و اطوار پر ' ہماری زبان اور لباس پر تبتی ' برمی یا چینی اثرات پڑے ہوتے -

نہ صرف موسم بلکہ دیگر جغرافی اور معاشی خصوصیات یعنی پہاڑوں اور میدانوں ' ندیوں اور تالابوں ' آبشاروں اور جنگلوں کا گہرا اثر قومی سیرت اور عمرانی حیات کی تشکیل پر ہوتا ہے - سرحدی پٹھان انسانی فطرت ہی کی وجہ سے نڈر اور بہادر نہیں ہوتے بلکہ پہاڑوں میں غذا کی کمیابی بھی

اُنھیں نڈر اور بہادر بناتی ہے - یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ شمالی میدان ' ہند کے براعظم کے لیے سر چشمۂ تہذیب و تمدن رہا ہے اور گنگا ' جمنا ' گھاگرا ' گومتی کے کناروں پر بڑے بڑے شہر مرکز علم و شائستگی ہوئے ہیں - فلسفۂ تاریخ کے جاننے والے اس سے بخوبی واقف ہیں کہ عمرانیت پر جغرافی اور معاشی ' زراعتی اور صنعتی ماحول کا کس قدر اثر پڑتا ہے - جغرافی اور معاشی ماحول کے بعد مگر اُن سے کمتر شدت و وسعت سے قومی عمرانیت پر لباس ' غذا اور پیشے کا اثر ہوتا ہے - سپاہیوں اور فوجی افسروں میں جو چستی پائی جاتی ہے وہ اُن کی چست وردیوں کا بھی نتیجہ ہے - کسی پولس یا فوجی رجمنٹ کو قواعد کرتے ہوئے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ لباس کس طرح اُن میں بہادری اور مردانگی کے احساسات پیدا کرتا ہے - برخلاف اس کے ڈھیلا پائجامہ ' نفیس ململ کا کرتہ ' چلی ہوئی آستینیں ' پھولدار انگرکھا نفاست ' لطافت اور نزاکت پیدا کرتے ہیں -

غذا کا مسئلہ عمرانیت کے لیے مدتوں سے نزاع پرور رہا ہے - گوشت اور سبزیات کے موافقین اور مخالفین میں عرصہ سے علمی بحث جاری ہے - اُن علمی تحقیقات اور صدیوں کے مناقشات کا کیا نتیجہ نکلا ' اس کا علم تو غذائیات کے ماہروں کو ہوگا - مگر اس قدر ہم بھی جانتے ہیں کہ غذا کا اثر خصائل پر ضرور ہوتا ہے - ایک موقر بنگالی برہمن کا قول تھا کہ بنگالی برہمنوں کی ذہانت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ مچھلی اور تازہ میووں کا استعمال بکثرت کرتے ہیں - یہ تحقیق تو معلوم نہیں مگر سنا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دکنی

بالعموم کند ذہن ہوتے ہیں اور اس کی وجہ اُن کی غذا ہے یعنی چاول اور کھٹائی - غذا عمرانیت پر بہت اثر ڈالتی ہے خصوصاً جبکہ مسکرات بھی غذا میں شامل ہوں - یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ جن طبقوں میں نسلہا نسل سے شراب یا افیون کا استعمال عام طور پر بکثرت ہوتا ہے اُن کے اخلاق کے معیار بدل جاتے ہیں ؛ اور سلجھدائی کم ہو جاتی ہے اور بالخصوص جنسی اخلاق اور نسوانی حیاداری پر گہرا اثر پڑتا ہے -

سب سے آخر مگر کسی طرح سب سے کم نہیں ' پیشوں کا اثر اجتماعی ذہنیت پر پڑتا ہے - پیشوں کے اثرات کو غالباً سب سے اچھی طرح جرمانیا کے نامور محقق معاشیات فریدرش لسٹ Friedrich List نے بیان کیا ہے - زراعت اور صنعت و حرفت کا تقابل کرتے ہوئے اُس نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ جس قوم کی اکثریت زراعت پیشہ ہے اس قوم میں قدامت پرستی ' بیجا توکل ' ناجائز قناعت ' توہم اور اعتقادیت پائی جاتی ہے ؛ زراعت قوم کو قنوطیت پسند اور الم پرست بناتی ہے ' مزاجوں میں تعطل ' سہل انگاری ' پست ہمتی ' کم حوصلگی ' تنگ نظری ' جہالت اور سب سے بڑھکر غلامانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے - برخلاف زراعت کے صنعت لوگوں میں جدت پسندی ' حوصلہ مندی ' محنت پسندی اور جفا کشی پیدا کرتی ہے اور تحقیق و تجسس ' ایجاد و اختراع کی ترغیب دلا کر وسعت نظر اور وسعت معلومات کا باعث ہوتی ہے ؛ قوم میں خودداری اور قومی سطوت پیدا ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ آزادہ روی ' عالی خیالی اور وسیع النظری ہے - جس طرح زراعت و صنعت کا تقابل کیا گیا

اُسی طرح ملازمت اور تجارت کا بھي کہا جا سکتا ھے اور ھمیں اس حقیقت کا بخوبی احساس ھو سکتا ھے کہ ملازمت‌پیشہ یا زراعت‌پیشہ طبقوں کے اجتماعي تخیلات اور اجتماعی ذھنیت ' صناعوں یا تاجروں سے کیوں مختلف ھوتی ھے اور ھر طبقے پر اُس طبقے کے پیشے کا کیا اور کسقدر اثر پڑتا ھے - اس تشریح کا لب لباب یہ ھے کہ عمرانیت کے مختلف اسباب ھیں جن میں جغرافي خصوصیات بالخصوص موقع محل اور موسم ' معاشی خصوصیات بالخصوص زرخیزي اور معدنیات ' لباس ' غذا اور پیشے کو بہت اھمیت حاصل ھے - عمرانیت کے اسباب پر مختلف حکما نے تحقیق کی ھے - کوتلیا کے معروف ارتھ شاستر اور ابن خلدون کے مشہور فلسفۂ تاریخ میں ھمیں اِن کے متعلق کافي مسالا ملتا ھے - عمرانیت میں اس دبستان کو ایک مستقل حیثیت حاصل ھے اور صرف اسباب عمرانیت پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئي ھیں - اصطلاحاً اس دبستان کے حامیوں کو (Determinist) کہتے ھیں ' چنانچہ وہ لوگ جو جغرافی ماحول پر بہت زور دیتے ھیں (Geographical Determinist) یعني " مشیت جغرافي کے قائل " کہلاتے ھیں - ھانکنس (Hankins) نامي امریکی ماھر عمرانیات نے اپنی تصنیف[1] میں اس قسم کے عمرانیاتي نظریوں کی تقسیم بہت اچھي طرح کی ھے اور تقریباً ۵۰۰ مختلف مصنفین کی تحقیقات کو ترتیب دیا ھے - اس موضوع پر تحقیقات کرنے والے

---

(۱) The History and Prospects of the Social Sciences مطبوعۂ نیویارک سنۂ ۱۹۲۵ء -

علما میں سب سے زیادہ مشہور ٹامس بکل (T. Buckle) '
ھُمبولٹ (Humboldt) ' گویو (Guyot) ' میچن‌کوف (Metchinkoff)
اور ھنٹنگٹن (Huntington) ھیں - انجمن ترقی اردو کی
جانب سے ٹامس بکل کی کتاب کی پہلی جلد کا اردو ترجمہ
' تاریخ تمدن ' کے نام سے دو حصوں میں شایع ہوچکا ھے[1] -

(۵) عمرانیت کے ذرائع

عمرانیات میں غالباً سب سے پہلے لدوگ گمپلووِتس اور
گستاو لیبوں نے موثر طور پر نفس اجتماعی کی اھمیت و اصلیت
دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اگرچہ اس میں شک
نہیں کہ اُن کے خیالات اور بیانات بنی‌نوع انسان کے لیے بالکل
نئے نہ تھے لیکن قدیم نظریوں کی تقویت اور تعمیم میں بلا شبہہ
اِن دونوں مصنفوں کی تحریروں نے بہت بڑا حصہ لیا اور یہ
کہنا سرا سر نا انصافی ہوگا کہ اُنھوں نے قدیم نظریوں کو صرف
ترتیب دے دیا - عمرانیاتی نظریوں کو ترتیب دینے کے علاوہ اُن
محققین نے کئی باتیں بطور خود دریافت کیں - نئے نظریے
انکشاف کیے ' سب کو پایۂ ثبوت پر پہنچایا اور بعض کو
عمرانیاتی قوانین کا رتبہ بخشا - مجمعوں کی اصلیت اور ذھنیت
کے متعلق گستاو لیبوں نے جو گراں‌بہا تحقیق کی ھے اُس کا

---

(۱) اس کتاب کے مترجم منشی احمد علی کاکوروی مرحوم تھے جو
صرف ۲ بابوں کا ترجمہ کر پائے تھے - ساتویں باب کا ترجمہ مولانا عبدالماجد
دریابادی نے کیا ' جنھوں نے بعد میں جماعتی ذھنیت کے متعلق دو نہایت قابل
قدر کتابیں ' فلسفۂ جذبات ' ' اور ' فلسفۂ اجتماع ' تصنیف کیں - یہ بھی انجمن
ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہوئی ھیں -

اندازہ کچھ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب اِس مبحث پر اُس کی کتاب[1] پڑھیے - اُسی زمانے میں جب کہ نفسِ اجتماعی کی اصلیت و اہمیت پر یہ دونوں محقق تحقیق کر رہے تھے دو اور فرانسیسی علما گیبریل تارد (Gebriele Tarde) اور ایمل درکہائم (Emile Durkheim) عمرانیت کے ذرائع دریافت کرنے میں منہمک تھے -

عمرانیت کا پہلا ذریعہ تقلیدپسندی : تارد کا نظریہ

تارد کا خیال ہے کہ انسانوں کی اہم ترین خصوصیت جس کے باعث تہذیب و تمدن کی یہ عالی شان عمارت قائم ہے تقلید پسندی یا تتبع کی جبلت ہے - وہ کہتا ہے کہ اسی تقلیدپسندی کی وجہ سے ہر بچے پر بتدریج اُس کے خاندان کی فضا کا اثر ہوتا ہے اور ہر نووارد پردیسی ملک کی عمرانی فضا سے متاثر ہوکر (Socialize) ہوتا ہے - اگرچہ تارد نے تقلید پسندی یا تتبع کی جبلت پر بہت زور دیا ہے اور اُس کی اہمیت ظاہر کرنے میں کسی قدر مبالغے سے بھی کام لیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ عمرانیت کے لیے تتبع کی جبلت بہت اہم ہے - خود ہم اپنے گرد و پیش میں روزانہ پیش آنے والے بیسیوں واقعات سے بلکہ اپنی ذاتی زندگی کی سیکڑوں مثالوں سے تارد کے نظریے کی تصدیق کرسکتے ہیں - ہمارے بہت سے

---

(1) *The Psychology of the Crowd* (اُردو ترجمہ " روح الاجتماع " از محمد یونس انصاری فرنگی محلی ، دارالمصنفین اعظم گڑھ) یہ رہی گستاو لی بون ہیں جن کی دو اور کتابیں اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں - یعنی " تمدن ہند " اور " تمدن عرب " مترجمہ سید علی بلگرامی -

عادات و اعمال ، اخلاق و احساسات اسي جبلت کا نتیجہ هیں -
ایک معصوم بچے کي ابتدائي ذهني زندگی اسي جبلت سے
متاثر هوتی هے اور جب اُس میں شعور پیدا هونے لگتا هے تو
وہ هر مخصوص آواز کو هر مخصوص شے سے تعبیر کرنے لگتا
هے اور اس طرح لسانی اثرات کے ذریعے اُس پر خاندانی تربیت
کا پہلا اثر پڑتا هے - اُس کیمیائي ترکیب کو جسے (H_2O)
سے تعبیر کیا جاتا هے اردو میں پاني ، هندی میں جل ،
فارسی میں آب اور جرمانی میں واسر ؐ کہتے هیں - کیا
ان الفاظ کی تائید میں کوئی منطقی استدلال پیش کیا جاسکتا
هے ؟ کیا کوئي ثابت کر سکتا هے کہ پانی کو پانی هي کہنا
صحیح هے ؟ اس کا جواب صرف یہی هوسکتا هے کہ چونکہ هم
نے بچپن سے پانی کو پاني کہتے سنا اسی لیے هم نے بھي پانی
کہنا شروع کیا - اسی طرح هم سیکڑوں هزاروں الفاظ سیکھتے
هیں جس کي حقیقی وجہ انسان کي یہي خاصیت هے کہ وہ
دوسروں کي تقلید کرتا هے - جس طرح هم لساني امور میں دوسروں
کي پیروی کرتے هیں اُسي طرح تمام تمدنی معاملات میں دوسروں
کي تقلید ، نقالي یا تتبع کرتے هیں - یہ جبلت کس قدر
قوي هے اس کا اندازہ اس حقیقت سے هو سکتا هے کہ بہت
سے لوگ جن کي عقل و فراست محدود هوتي هے اپنے کردار
کے متعلق استفسار هونے پر یہي کہتے هیں کہ " همیں کیا
معلوم ! بزرگوں کا یہي طور طریق تھا اس لیے هم نے بھي نبھایا " -

انتہائي معصومیت اور بھولے پن کا یہ منظر کس قدر دلفریب
هوتا هے جب دو ڈھائي سال کا بچہ اپني ماں کو نماز پڑھتے
دیکھکر خود بھي " نماز پڑھنے " کھڑا هو جاتا هے - ماں

رکوع میں جاتي هے تو خود بهي رکوع میں جاتا هے ' ماں سجدہ کرتي هے تو خود بهي سجدہ کرتا هے فرض کہ جہاں تک اُس سے هو سکتا هے نماز کے حرکات وسکنات کي بعینه نقل کرتا هے - همارے دیندار حضرات کہیں تو کہیں کہ بچہ بهي خالق کون و مکاں کي دائم و قائم هستی سے مرعوب هوکر اُس کي حمدوثنا میں مصروف هے اور اس کی بارگاہ میں نماز کے ذریعے اپني عبدیت کا اعتراف اور اظہار احسانمندي کرتا هے مگر تارڈ اور اُس کے حامیوں کے نزدیک یہ انسان کي محض فطري جبلت تقلید کا ادنیٰ کرشمہ هے -

هم هر گهرانے میں دیکھ سکتے هیں کہ چهوتي چهوتي لڑکیاں ساڑي پہننے یا دوپتا اوڑهنے کے شوق کو ظاهر کرتی هیں - اُنهیں ساڑي یا دوپتا نہ بهي ملے تو وہ تولیے کو مثل ساڑي کے لپیتنے کي کوشش کرتي هیں اور کوئي لانبا کپڑا ملجاے تو مثل دوپتے کے استعمال کرتي هیں - مغربي تہذیب و آداب سے جو نوجوان ناواقف هوتے هیں اور یورپ جاتے هیں تو اُنهیں بهسیوں معمولي معمولي باتوں کي وجہ سے دشواري هوتي هے جس کو وہ محض تقلید کے ذریعے رفع کرتے اور کر سکتے هیں - اسي قسم کے ایک صاحب جہاز پر سفر کر رهے تهے اور جیسا کہ اُنهوں نے بعد میں کہا مغربي معاشرت سے اُنهیں یہ پہلا سابقہ هوا تها - کهانے کے وقت اُنهیں یہ دیکھکر بڑي حیرت هوئی کہ پلیت کي سیدهی جانب چار چهریاں اور بائیں جانب چار کانتے اور سامنے دو بڑے چمچے دهرے هوئے هیں اور لطف یہ کہ میز پر کهانا ندارد ! میز پر جب سب بیتھ چکے تو سوپ آیا اور اُنهوں نے بکمال متانت چاے کا

چمچہ اُٹھایا مگر یہ دیکھکر کہ سب لوگ بڑے چمچے سے سوپ پی رہے ھیں جھٹ چھوٹا چمچہ چھوڑ بڑا چمچہ اُٹھا لیا ۔ یورپ کی تہذیب کا یہ منظر دیکھکر اُنھیں بڑی حیرت ھوئی کہ ھر کورس کے بعد رکابی بدلی جاتی ھے ۔ مچھلی کھانیکے کے لیے دوسری قسم کے کانٹے چھری استعمال کیے جاتے ھیں اور سب سے بڑھکر آفت یہ کہ جب ایک چیز کھا چکتے ھیں تو دوسری کا انتظار کرنا پڑتا ھے ۔

مشرقی اور مغربی تہذیب کی ٹکر سے جب ایسی متضاد صورتیں پیدا ھوتی ھیں تو ھر شخص کی رھبری کرنیوالی یہی تقلیدی جبلت ھوتی ھے جس کے باعث افراد پر ھمرانیت کا اثر پڑتا ھے ۔ ھندی اردو کی مشہور کہاوت "خربوزے کو دیکھ خربوزہ رنگ پکڑے ، آدمی کو دیکھ آدمی ڈھنگ پکڑے" اسی اثر کی طرف اشارہ ھے ا

ھیئت اجتماعیہ کی یہ ممتاز خصوصیت ھے کہ ھم دوسروں کی تقلید اور نقالی کرتے ھیں ، خود کوئی نئی بات دریافت کرتے ھیں یا کوئی تجدید یا اصلاح کرتے ھیں تو وہ اُسی وقت کامیاب ھوتی ھے جبکہ دوسرے اُس کی تقلید اور نقل کریں ۔ بغیر تقلید اور نقل کے کیسی ھی اچھی ایجاد ھو ، کتنی ھی مفید اصلاح ، کیسا ھی کارآمد اصول ، سب ھیچ رہ جاتے ھیں ۔ ھر مصور نقشہ کشی اور رنگوں کی آمیزش میں ، ھر شاعر اور ادیب شاعری اور ادب میں دوسروں کی تقلید کرتا ھے ۔ اور یہی وجہ ھے کہ چینی یا جاپانی ، مغلیہ یا راجپوتی ، مصری یا یورپی مصور کی کسی تصویر کو دیکھکر ماھرین فن اور مستند نقاد ھی نہیں بلکہ مصوری سے زرا سا لگاو رکھنے والے حضرات

بھی فوراً حکم لگا سکتے ھیں کہ فلاں تصویر کس فنی مدرسے یا کس ملک کی ھے ۔ جو حال مصوری ' نقاشی ' بت‌گری اور فن تعمیر کا ھے وھی شاعری اور ادب کا ہے جس میں ھمیشہ دوسروں کی نقل اور تقلید کی جاتی ھے اور اگر تجدید ھو بھی تو وہ کامیاب اور موثر نہیں ھوتی تاوقتیکہ اُس کی عام طور پر تقلید نہ کی جائے اور جب کبھی تجدید ھوتی ھے تو وہ بالعموم موجودہ نظام‌ھائے علوم و فنون میں ترمیمات ھوتی ھیں ۔ دنیا کی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی نہیں دیکھا سکتی جب کہ انسانی زندگی کے ھر شعبہ میں یک‌لخت اھم انقلابات ھوئے ھوں ۔

فرض کہ ھم اپنے عمرانی معاشرے کی حتی‌المقدور پیروی کرتے ھیں اور سراسر اُسکی ذھنیت کے مطابق عمل‌پیرا ھوتے ھیں ۔ اور ھماری تجدید جس پر مصلحین معاشرت بسا اوقات حد سے زیادہ ناز کرتے ھیں وہ حقیقت میں عمرانی حالات میں ایک ترمیم ھوتی ھے جسے ضرورت وقت نے ممکن کر دیا ھو ۔

تقلید اور نقل میں جن قوانین کا وجود پایا جاتا ھے اُنکی اھمیت معاشرتی دنیا میں وھی ھے جو علوم طبعیہ میں قوانین قدرت کی ھے ۔ اِس میں شک نہیں کہ اُن میں انتہائی قطعیت اور مطلقیت نہیں پائی جاتی مگر اُن کا دائرہ اسقدر وسیع اور اُن کا طریق انطباق اسقدر باقاعدہ ھے کہ ھم اُن قوانین کو شبہ فطری (Quasi-natural) کہہ سکتے ھیں ۔ یہ قوانین گیبریل تارد کے دریافت کردہ ھیں مگر مختلف عمرانئین نے الفاظ کے ردو بدل ' ترمیم اور اضافے سے اُنکی اھمیت بڑھادی اور اُنھیں حقیقی معنی میں قانون کا رتبہ بخشا ۔

پہلا قانون :— " بالعموم اقلیت اکثریت کی ' محکوم حاکموں کی ' چھوٹے بڑوں کی ' ماتحت عہدہداروں کی اور نیم‌تربیت‌یافتہ مہذب لوگوں کی تقلید کرتے ھیں " - یہی وجہ ہے کہ جب تک مسلمان بر سر حکومت تھے ھندو ' پارسی ' سکھ ' عیسائی جو اسلامی ریاست میں رہتے بستے تھے اسلامی تہذیب کی تقلید کرتے تھے ' عربی فارسی سیکھتے تھے ' اسلامی لباس اور اسلامی تمدن اختیار کرتے تھے جسکا اثر شمالی ھند میں آجتک پایا جاتا ہے - صوبۂ متحدہ میں بیسیوں ھندو اب بھی عربی اور فارسی شوق سے سیکھتے اور بولتے ھیں اور ان میں اکثر فارسی اور عربی ادب سے بخوبی واقف ھیں ' بہت سے قدیم تہذیب کے ھندو جب گھر سے باھر نکلتے ھیں تو ھندوانی لباس نہیں بلکہ مسلمانی لباس پہنتے ھیں - اسی قانون کی عالمگیر تاثیر ہے کہ آج ہم ھندوؤں ' مسلمانوں ' سکھوں ' پارسیوں کو مغربیت کے سانچے میں ڈھلتا ہوا دیکھ رہے ھیں اور کتنے ھندو اور مسلمان ایسے ھیں جو وقت اور بے وقت ' موقع اور بےموقع ھندستانی تہذیب پر مغربی تہذیب کو ترجیح دیتے ھیں -

دوسرا قانون :— " نفس کو لبھانے والی جس قدر باتیں ھوں گی اُن کی تقلید زیادہ اور بہ آسانی ھو گی " - یہی وجہ ہے کہ برائیوں کی بآسانی اور خوبیوں کی بمشکل تقلید ہوتی ہے -

تیسرا قانون :—" جن لوگوں میں احساس پستی ہوتا ہے وہ خواہ مخواہ اپنے سے مفروضہ و متصورہ بلند تر انسانوں کی نقالی کرتے ھیں " -

چوتھا قانون :— حقیقی اور عملی تقلید سے قبل ذہنی اور دلی تقلید ہوتی ہے یعنی یہ کہ حقیقتاً عمل کرنے سے قبل انسانوں کے دل میں عمل کرنے کی اُمنگ یا ہوس پیدا ہوتی

ھے'' - ھر شخص اپنے اپنے حوصلے اور جرات کے مطابق کچھ نہ کچھ عرصے تک کُن یا مکن کے اضطراب میں رھتا ھے - یہي وجہ ھے کہ موچھ داڑھی والے مولویانہ نوجوان خدا کے نور کا صفایا کرنے سے قبل موچھ داڑھي ملڈانے والوں کو حسرت بھري نظر استحسان سے دیکھتے ھیں -

اختیاری اور فاعلي تقلیدپسندی کے علاوہ عمرانیت کا ذریعہ جبر و تشدد ھے - برخلاف گیبریل تارد کے ایمل درک‌ھائم جبر و تشدد کو

عمرانیت کا دوسرا ذریعہ: جبر و تشدد

عمرانیت کا اھم ترین ذریعہ قرار دیتا ھے - وہ کہتا ھے کہ انسان شوق سے اور اپنی مرضي کے مطابق دوسروں کي تقلید نہیں کرتا بلکہ ھر خاندان یا معاشرت اپنے متعلقین کو مجبور کرتي ھے کہ وہ خانداني طور طریق اور معاشرتي تہذیب کو اختیار کرے - چنانچہ اُنھیں مثالوں سے ' جن سے تارد نظریۂ تقلیدپسندي کی اھمیت ثابت کرنے کي کوشش کرتا ھے ' اُس کا استدلال یہ ھے کہ شریر اور ضدی بچوں کي جبلت تقلیدپسندی پر خاندانی تربیت کا دار و مدار نہیں رکھا جاتا بلکہ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت اُن کي تنبیہہ کی جاتي ھے : ایک مدت تک یعني بالکل چتھنے میں بچوں اور بچیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ھے مگر جب وہ سیانے ھونے لگتے ھیں تو اُنھیں متعدد طریقوں سے باضابطہ طور پر تہذیب سکھلائی جاتي ھے - اُن کی گفتگو میں جو غلطیاں ھیں وہ دور کي جاتي ھیں : مشکل حروف کا تلفظ سکھایا جاتا ھے آداب کرنے کي تاکید کي جاتی ھے ' ضد سے باز رکھے جاتے ھیں : مدرسے بھیجے جاتے ھیں : گھر پر تعلیم ھوتي ھے - اور یہ سب ظاھر ھے کہ لڑکوں اور

لڑکیوں کي اختیاري جبلت تقلید کي وجہ سے نہیں ہوتا :
بلکہ جبر و تشدّد سے جس کي ایک صورت تو جسماني سزا ہے
دوسري محض روحانی مثلاً ماں خفا ہوکر ناراض ہو جاتي
ہے - اس کی ناراضگی سے بچوں کو کوفت ہوتی ہے اور اس
روحاني کوفت کي تاب نہ لاکر بچے طوعاً و کرهاً اپنے رویے کو بدل
دیتے ہیں - بہت سے مغربیت پسند ہندستاني ایسے ہیں جنہیں
ہندستان کے بہت سے رسوم و رواج ' عادات و اطوار سے دلي تنفر
ہے مگر وہ محض بزرگوں کے خیال سے ' عزیزوں کے اصرار سے مجبور
ہوکر قدیم رسوم کي پابندي کرتے ہیں - مغربي تعلیم کے تمام
تاثرات بالعموم ماں بہنوں کي حسرت بھری نگاہوں کے سامنے
ہوا ہ جاتے ہیں اور مشرقی وجدانیت کے مقابلے میں انتسابي
مغربي عقلیت معذور اور لاچار ہو جاتي ہے - اِس میں کوئي
شک نہیں کہ اگر یہ معاشرتي دباو نہ ہوتا تو ہماری قوم
کبھي کي مغربي سانچے میں ڈھل گئي ہوتی - لہذا یہ کہنا
بالکل درست ہے کہ عمرانیت یعني Socialization کا ایک
ذریعہ جبر و تشدّد بھي ہے جس کي بہترین مثال سیاسي
قوانین ہیں جن کے ہوتے ہوئے لوگ جماعتوں کے مقررہ و معینہ
اصول کي صریحي خلاف ورزي نہیں کر سکتے -

یورپ کي اصلاحي تحریکات میں مشرقیوں کے نزدیک غالباً
سب سے زیادہ مذموم تحریک برهنگي ہے 'ور جرمانیا اس امر
میں خاص طور پر بدنام بھي ہے مگر واقعیت اور اصلیت پر
غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قوانین سلطنت ہر شخص کو جرمانیا
میں بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ عام شاہراہوں یا عام حماموں
یا کسی اور مقام پر جہاں عوام کا گذر ہو برهنہ نہ ہوں - اگر

کوئي خاطي اس قسم کي حرکت کرے تو یقیناً اُسے سزا دي جائے گي اور معمولي سزاؤں پر بھي باز نہ آئے تو اُسے طویل عرصے کے لیے قید بامشقت بھگتني پڑیگي - عام سیاحوں اور تنگ نظر مخالفوں نے جو کچھ جرمانیا میں برھنگي کے متعلق کہا یا لکھا ھے اُس سے سراسر غلط خیالي اور غلطفہمي ھوتي ھے - واقعہ یہ ھے کہ قوانین سلطنت وھاں اور یہاں یکساں طور پر موجودہ نظام سیاست و معاشرت کو برقرار رکھ رہے ھیں اور جس طرح بھي ھو معاشرتي دباو یا سزا کے ذریعے لوگوں کو عمراني تہذیب کے دائرے سے باھر نہیں جانے دیتے -

اگرچہ تارد اور درکھائم نے عمرانیت کي بالکل متضاد صورتیں بیان کي ھیں اور ھرایک نے اپنے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کی کوشش کي ھے مگر علم عمرانیات کا آخري فیصلہ یہي ھے کہ دونوں نے اگرچہ اپنے نظریوں کو ثابت کرنے میں مبالغہ کیا ھے مگر دونوں کے نظریے صحیح ھیں - سیکڑوں مرتبہ انسان قدرتي جبلت تقلید کی وجہ سے Socialize ھوتا ھے تو سیکڑوں مرتبہ اخلاقي دباو اور معاشرتي زور یا جسمانی یا روحانی سزا کے خوف سے وہ اجتماعي اثرات کو قبول کرتا ھے اور اجتماعیت یا عمرانیت کے دائرے سے باھر نہیں جانے پاتا -

عمرانیت کا تیسرا ذریعہ: ھمدردي

تقلیدپسندي اور جبر کے علاوہ عمرانیت کا تیسرا ذریعہ ھمدردی ھے جس کي اھمیت امریکا کے مشہور و معروف عالم عمرانیت فرانک‌گڈنگس کے نزدیک سب سے زیادہ ھے - گڈنگس کا کہنا اس حد تک درست ھے کہ بہت سے لوگ محض ھمدردي کي وجہ سے Socialize ھوتے ھیں - اسکی بہترین مثال وہ لوگ ھیں جو ایک مذھب

کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرتے ھیں - اس امر کو تو غالباً ہر شخص تسلیم کریگا کہ کسی شخص کے لباس سے اور اُس کے مذھبی اعتقادات سے براہ راست کوئي تعلق نہیں یعنی یہ کہ اُس شخص کے لیے جو عیسائي ھو جائے یا مسلمان ہو جائے یہ ضروري نہیں کہ وہ اپنا آبائي لباس چھوڑ دے یا اُس میں ترمیم کرے مگر اکثر مذھب کي تبدیلي کے ساتھ ساتھ لباس میں اور عام طرز زندگی میں تبدیلي ھوتي ھے - اِس کی وجہ صرف ھمدردي ھے -

عمرانیت کا چوتھا ذریعہ: مشیخت

عمرانیت کا چوتھا ذریعہ مشیخت یا Vanity ھے جسے عمرانیات میں بہت زیادہ اھمیت دی جاتی ھے - مشیخت وہ حیواني جذبہ ھے جس کا وجود ھر انسان میں اور اکثر جانداروں میں پایا جاتا ھے اور جو انسان کو خود نمائي پر مجبور کرتا ھے - ناز ' تبختر ' خودپسندی ' خودنمائي ' غرور ' تکبّر مشیخت کی مختلف صورتیں ھیں - خود کو ظاھر کرنے کي خواھش ، اپني قابلیت کو مشتہر کروانے کی ھوس ' عوام کي توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کي آرزو اسي جبلت کي وجہ سے پیدا ھوتي ھیں - یہي جذبہ ھے جس کی خاطر انسان نمود پر فریفتہ اور بقاے نام کا آرزومند ھوتا ھے - واقعہ یہ ھے کہ ھر انسان میں یہ جبلت پائي جاتي ھے اور ھر شخص اسي جبلت سے مجبور ھو کر شہرت اور ناموري کا امیدوار اور ذلت اور بدنامي سے خائف رھتا ھے - ھر شخص یہ چاھتا ھے کہ اُسے صحت ' دولت اور شہرت نصیب ھو - صحت کی آرزو اور دولت کي تمنا اگر انسان کي خود غرضي کے باعث پیدا ھوتي ھے تو شہرت کي ھوس مشیخت کي وجہ

ہے ۔ ہر شخص اپنی دانست میں خود کو حقیقت سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہے اور اپنے ہم نفسوں اور ہم جنسوں میں خود کو سیکڑوں سے افضل و برتر گردانتا ہے - اگر انانیت کے ساتھ ساتھ وحشت ' مشیخت کے ساتھ خبط بھی ہو تو پھر کیا ہے - انسان خود کو بلکہ نوع انسان میں سب سے بہتر و اشرف ' یکتائے عالم ' مقصد آفرینش اور نہ جانے کیا کیا کچھ سمجھتا ہے - دماغ کے اعتراضات کو ' ضمیر کے تنقیدات کو بھول بھلیوں میں ڈالنے کے لیے وہ اپنے حقیقی اور تصوری ' دائمی اور عارضی کارناموں ' شہ پاروں اور شہکاروں کی یاد دم بدم تازہ کرتا ہے - اِن کی اہمیت دوسروں پر واضح کرنے کے لیے دوست دشمن ' یار آشنا ' عالم و جاہل ' مومن و غافل سب کے سامنے وقت بے وقت ' موقع بے موقع لن‌ترانیاں کرتا پھرتا ہے - کوئی معمولی شعر کہہ جائے تو گھنٹوں اُس کے مزے لے لے کر وجد کے عالم میں رہتا ہے - کوئی معمولی تقریر کر جائے تو خود کو سحربیان تصور کرتا ہے کوئی معمولی سا مضمون لکھ لے تو خود کو ادیب اور نثرنویس سمجھنے لگتا ہے - جو حال شعرا ' ادبا ' علما و فضلا کا ہے اُسی قدر خودپسندی میں معمولی پڑھے لکھے لوگ اور جہلا بھی مبتلا ہیں - نوجوان مرد عورتیں ہی نہیں بلکہ ادھیڑ عمر والے اور بوڑھے بھی جذبۂ مشیخت کی وجہ سے مجبور و معذور ہیں - اور ہر شخص شہرت کا شیدائی ' تعریف کا متمنی ' نیک‌نامی کا امیدوار ' نام کا طلبگار نظر آتا ہے - یہ جبلت اس قدر قوت کے ساتھ اپنا اثر دکھاتی ہے کہ محض ظاہرا نیک نامی و ناموری کے لیے انسان کی خصلت و فطرت بھی بدل جاتی ہے - چنانچہ سیکڑوں بزدلوں

کو میدان جنگ پر محض تمغوں کی تمنا اور رنگین سوتی ٹکڑوں کی اُمید نے نڈر اور بہادر بنا دیا ۔ محض نام کی ہوس نے سینکڑوں کو علم دوست ' ہزاروں کو جفا کش اور متحملتی ' لاکھوں کو معاشرت کا مطیع اور کروڑوں کو ذہنیت اجتماعیہ کا فرمانبردار بنایا - یہ عظیم دباو ' جس کی وجہ سے بیشتر اشخاص کی شخصیت ' افراد کی انفرادیت اور انسانوں کی انانیت مثل تنک ریزوں کے ہوائے معاشرت میں گھل مل کر نیست و نابود ہوجاتی ہے ' زیادہ تر مشیخت کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ تعریف کی تمنا ' انسانوں کو سرکشی نہیں بلکہ اطاعت ' غداری نہیں بلکہ مصلحت ' دشمنی نہیں بلکہ درستی ' نافرمانی نہیں بلکہ فرمانبرداری کے طریقے سکھاتی ہے اور انسانوں سے ایسے افعال کراتی ہے اور اُن کے خیالات اس طرح بدلتی ہے جو سماج کی نظروں میں پسندیدہ ہوں - ظاہر ہے کہ عوام کی مخالفت کرکے ' سماج سے لڑائی مول لے کے ' معاشرے سے جنگ چھیڑ کے کوئی شخص اپنی مشیخت کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتا - جو ہر جگہ اپنی تعریف و توصیف سننے کا متمنی ہوگا وہ کس طرح اور کیونکر سماج کی ذہنیت کے خلاف عمل پیرا ہوگا ؟ جو اِس بات کا شیدائی ہوگا کہ لوگ اُسے اچھا کہیں ' اُس کی قدر کریں وہ کیوں خواہ مخواہ یا محض اصولاً معاشرتی اصولوں کی تحقیر و تکذیب کریگا - کون ایسا شخص ہے جو اپنے گرد و نواح کے ہر شخص سے اپنی تعریف و تحسین سننا نہیں چاہتا ؟ بجز معدودے چند قائدین عظام ' اولوالعزم مفکرین ' مخلص بہی خواہان قوم اور مصلحین معاشرت کے جنکی تعداد ہزاروں لاکھوں تو کیا ' سینکڑوں یا بیسیوں تک بھی نہیں

پہنچتی بلکہ بہ آسانی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے ' کوئی شخص تعریف و توصیف سے بے نیاز یا تحقیر و مذلت سے لاپروا نہیں ہوتا - یہی تعریف کی تمنا اور بدنامی کا خوف جو جذبۂ مشیخت کا لازمی نتیجہ ہے انسان کو حتی المقدور عمرانیت کے دائرے کے باہر نہیں جانے دیتا - اور اگر انسان کا عمرانی ماحول بدل جائے تو جلد سے جلد نئے عمرانی اثرات کو قبول کر لینے کی ترغیب دلاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ جو شخص اپنا آبائی وطن ترک کرکے کسی غیر ملک میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرتا ہے اُس پر لحظہ بہ لحظہ قدم قدم پر نئے اثرات پڑتے ہیں اور وہ بہت جلد اس نئی فضا سے Socialize ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نیکنامی اور عزت کا واحد راستہ رود عمرانی ہی کے کنارے کنارے گیا ہے - یہ مشہور کہاوت کہ " جیسا دیس ویسا بھیس " اِسی مفید مصلحت آمیز رویہ کے اختیار کرنے کی نصیحت ہے - کسی متوسط درجے کے عالم یا معمولی قابلیت کے محقق نے نہیں بلکہ دنیائے فلسفہ کے منور آفتاب اِمانوئل کانٹ نے کہا ہے کہ " اگر انسانوں کو سزا اور بدنامی کا ڈر نہ ہوتا تو وہ وحشی درندوں اور خوفناک جانوروں سے زیادہ بدنفس اور بدطینت ہوتے " امانوئل کانٹ کے اِس مختصر جملے میں عمرانیاتی نظریوں جبر اور مشیخت کی تصدیق و توثیق ہو رہی ہے -

عمرانیت کے چار ذرائع یعنی تقلید ' جبر ' ہمدردی اور مشیخت کے علاوہ غالباً تعلیم کا بھی اجتماعی یا معاشری ذہنیت ' معیاری اخلاق اور معینہ اصول زندگی پر اثر پڑتا ہے اور جس قدر زیادہ تعلیم عام ہوتی ہے اُسی قدر تعلیم کی اہمیت بحیثیت

ایک ذریعۂ عمرانیت کے بڑھتی جاتی ہے - خصوصاً موجودہ زمانے کی کسی مخصوص معیاری تعلیم سے افراد کی ذہنیت پر یکساں اثر پڑتا ہے اور طلبہ کے خیالات و تصورات ، افعال و عادات میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے - یہی وجہ ہے کہ تعلیمی عمرانیات میں تعلیم " اعتدال بخش جز " (Levelling Factor) تصور کی جاتی ہے - چونکہ ہر ملک کے تمام مدارس اور کالجوں کی تعلیم بالعموم ایک ہی نوعیت کی ، ایک ہی قسم کی ، ایک ہی نہج کی ہوتی ہے تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات و عادات پر اس کا ایسا اثر پڑتا ہے کہ ان میں خود بخود یکسانیت اور ذہنی ہمواری پیدا ہو جاتی ہے -

(۵) اختتام

عمرانیات کے مختلف اسباب و ذرایع بیان کرنے کے بعد ہم اختتام پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمدنی ، اخلاقی ، معاشرتی اور عمرانی زندگی کے صرف ایک رخ کو ہم نے واضح کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے کہ اگر واقعی نفس اجتماعی کی یہ اہمیت ہے اور معاشرے کا افراد پر اس قدر دباؤ پڑتا ہے تو پھر تمدنی انقلابات اور تجدیدی تحریکات اور اصلاح معاشرت کیونکر ممکن ہے ؟ ان مسائل کا تعلق عمرانی تفرید سے ہے جو ہمارے موضوع بحث سے باہر ہے -

مشرقی معاشرتوں اور ہندستانی سوسائٹی کا کیا ذکر - دنیا کی سب سے زیادہ مکمل ، سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ تعلیم یافتہ سوسائٹی میں بھی متعدد خرابیاں پائی جاتی ہیں اور ہر سوسائٹی کو وقتاً فوقتاً تجدید اور نئی تعمیر

کی احتیاج ہوتی ہے - اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم نہ صرف معاشرے کی اصلیت اور نوعیت سے واقف ہوں بلکہ معاشری اصلاح اور تمدنی تجدید کے لیے عمرانی اصول و قوانین سے واقف ہوں - ہر عمرانیتی دور کا لازمی اور فطری خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کے خلاف رد عمل ہو - اگر اس مخالفت کا باعث عقل و فراست ' دانشمندی اور فہم عامہ ہے تو نتیجہ ترقی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ورنہ خود غرضانہ مخالفت سے پھوٹ اور نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے - بہر طور نتیجہ ترقی ہو کہ تفریق ' پھوٹ ہو کہ اتفاق ' بلندی ہو کہ پستی ' اس امر پر تو تمام محققین عمرانیات اور ماہرین اجتماعیات کو اتفاق ہے کہ ترقی کا صحیح راستہ اصلاح معاشرت ہے کیونکہ مذہبی تحریکات سے اہم تر ' سیاسی قوانین سے بہتر اور علمی نظریوں سے زیادہ موثر ' مصلحین معاشرت کی عملی زندگی ' رہنمایان دین کے حقیقی نمونے ' مدبرین سلطنت کا اصلی طرز عمل اور معلموں کے مثالی اور معیاری اخلاق و آداب ہیں - اگر ہم وقتاً فوقتاً حسب ضرورت معاشرتی آداب و اخلاق میں ترمیم و تبدیل کریں اور اس غرض کے لیے صرف علمی نظریے اور تخیلی تصویریں ہی نہیں بلکہ حقیقی نمونے پیش کرتے رہیں تو لوگوں کو ہماری تقلید کی ترغیب ہو گی - اگر ہم ساتھ ہی ساتھ اُن سے ہمدردی کا برتاؤ کریں تو وہ صرف عقل کی مجبوری ہی سے نہیں بلکہ دل سے ہماری پیروی کریں گے - اُن کا دماغ ہی نہیں بلکہ دل بھی ' اُن کی ذہنیت ہی نہیں بلکہ اُن کے جذبات بھی ہمارے محکوم و تابع ہو جائیں گے - اگر عام تعلیم اور اعلیٰ تعلیم مفت کر دی جائے اور معقول طریقے سے اور محدود پیمانے پر

سلطنتی قوانین سے امداد لی جاے تو ترقی کی رفتار تیز ہو جاے گی -

لوگوں کو خواب غفلت سے چونکانے کے لیے ' کم ہمتوں کو مستعد بکار اور مستقل مزاج بنانے کے لیے ' کم شوق طلبہ کو علم کا حریص اور تحقیق کا شوقین بنانے کے لیے نہ صرف تعلیم گاہوں میں بلکہ بازی گاہوں پر بھی مقابلے اور مسابقت کے کارگر طریقے سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جاے جس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ تمغوں ' خطابوں ' سندوں اور اعزازی عہدوں کے ذریعے یعنی شہرت پسندی کو خلق کے لیے اُکسا کر اور نیک نامی کی تمنا کو معاشرت کے مفاد کی خاطر بھڑکا کر جذبۂ مشیخت کو معاشرتی ترقی کا آلہ بنایا جاے - جس طرح انسان کی انفرادی زندگی پر حواس خمسہ کا تسلط ہوتا ہے اُسی طرح معاشرتی زندگی پر تقلید ' جبر ' ہمدردی ' مشیخت اور تعلیم کے پانچ عمرانیتی اثرات پڑتے ہیں - اگر ہم اُن کو قومی مرفہ الحالی اور بین الاقوامی خوشحالی کے لیے وسیع ترین پیمانہ پر منطبق کریں گے تو جماعتوں کے ساتھ افراد ' افراد کے ساتھ سوسائٹی ' سوسائٹی کے ساتھ اقوام ' اقوام کے ساتھ سارا عالم ارتقاے منازل تیز رفتار سے طے کرے گا اور اِس طرح دنیا کے ساتھ ہم اور ہمارے ساتھ دنیا ترقی کریگی -

---

شاعر —— فلسفی سے

(از مولوی علی اختر ' حیدرآباد دکن)

دری نگاہ ہے وابستۂ فریب نمود
بہ ایں رعونت پندار و ناز بینائی

جگا سکی نہ تجھے اے رہین خواب گراں
بہار کی چمن افروز نغمہ پیرائی

مٹا سکی نہ تری روح کی جبیں سے شکن
فروغ ماہ میں لیلائے شب کی رعنائی

گرا سکی نہ کبھی بجلیاں ترے دل پر
سواد شب میں عروس سحر کی انگڑائی

تجھے نہ کیف کے رازوں سے کر سکا آگاہ
تبسم لب شیریں ' جمال برنائی

یہاں کہ ذرۂ خاکی ہے آفتاب فروش
یہاں کہ ریزۂ مینا ہے جام صہبائی

یہاں کہ سینۂ خس میں دواں ہے روح بہار
یہاں کہ رقص شرر میں ہے نور سینائی

تجھے خبر بھی ہے نا واقف سر شت حیات
کہ راز بیخبری ہے کمال دانائی

———

ہوا نہ صرف یقین رنگ احتمال ترا
تغیرات کی زد میں رہا کمال ترا

اگرچہ میں بھی ہوں گم کردۂ طلسم جہات
مجھے ہے کھیل مگر اس جہاں کی بوالعجبی
یہ جانتا ہوں کہ ہے اک ادائے پرتوِ رنگ
تلاطمِ سحری ہو کہ خوابِ نیم شبی
ملا ہے فیض سے فطرت کے وہ دلِ آگاہ
کہ موج بادۂ عرفاں ہے میری تشنہ لبی
غلط نہیں ہے ' اگر ہو زواہِ کیف جمال
خس ذلیل کو بھی دعوئے چمن نسبی
کشش ہے کس کی کہ از ماہ تابہ ماہی آب
ہر ایک ذرہ ہے آسودۂ فدا طلبی
ملے جو ساغر زہرآب مسکراتا ہوں
کہ اس میں پاتا ہوں میں روح آتش عنبی
کسی کا عکس ہے ' نبض حیات کی جنبش
یہ کائنات ہے ہم رنگ شیشۂ حلبی
مجھے تلاش ہے جس کی وہ مل چکا ہے مجھے
بہ ایں جسارتِ رندی و شان بے ادبی

ہجوم دھر میں سرگرم اهتمام ہوں میں
فنا پذیر ہے تو طالب دوام ہوں میں

تبصرے

جدید اردو شاعری

(مرتبۂ عبدالقادر سروری ' ایم ' اے - ایل ایل ' بی مددگار پروفیسر اردو)
کلیۂ جامعۂ عثمانیہ ' حیدرآباد دکن ' قیمت تین روپیہ -

عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر ' عبدالقادر سروری نے جدید اردو شاعری کی ایک تاریخ ' یا موجودہ شعراء کا ایک مستقل تذکرہ ترتیب دیا ہے ' اس میں جدید اردو شاعری کے ارتقائے تدریجی اور اس کے اسباب و علل سے بھی بحث کی گئی ہے ' حصہ اول میں شعر کی ماہیت ' شعر کی تعریف ' شعر کی تقسیم اور اردو شاعری کے اصناف بتائے گئے ہیں - حصۂ دوم میں انقلاب سے پہلے کی شاعری ' تنزل کے اسباب ' انقلاب کے اثرات ' جدید شاعری کے معمار اور جدید شاعری کے زمانۂ پیدائش سے بحث کی گئی ہے اور حصہ سوم میں عصراصلاح ' درمیانی زمانہ ' عصر حاضر اور شعرائے مستقبل کے بارے میں بحثیں ہیں -

مذکورہ مباحث بہت ہی پر مغز و گرانقدر ہیں ' ہر بحث بجائے خود ایک سائنٹفک مقالہ ہے فرضکہ پوری کتاب اہم و دلچسپ ' اور اس طرح ایک بہت ہی '' خاصے کی چیز '' ہو گئی ہے ' شعراء پر جو تنقیدیں ہیں وہ بھی اکثر

بے لوث و ملحقات ہیں اور ان کی اسپرٹ صالح ' سلجھدہ اور تعمیری معلوم ہوتی ہے ' اس موضوع پر آج کل دیگر ارباب فکر بھی طبع آزمائی کر رہے ہیں ' ہمیں امید ہے کہ " جدیداردو شاعری " مختلف اعتبارات سے ان کے لئے دلیل راہ بن سکے گی -

ہمیں دو ایک باتوں کے متعلق فاضل مرتب سے کچھ عرض کرنا ہے ' اول یہ کہ جدید اردو شاعری کی پیدائش سے بحث کرتے ہوئے اس کتاب میں آزاد کو جدید اردو شاعری کا بانی قرار دیا گیا ہے - جیسی تحقیقی بحثیں اس کتاب میں نظر آتی ہیں اور عموماً جس صحت مذاق کا اس میں ثبوت دیا گیا ہے اس کے اعتبار سے یہ بیان کسی قدر سطحی اور عامیانہ ہے - ہم اس سے بے خبر نہیں کہ آزاد کے بارے میں بعض لوگ اس قسم کی رائیں رکھتے ہیں اس کی وجہ یا تو بیجا جوش عقیدت یا پھر اجتہاد فکر و دقّت نظر کا فقدان ہے -

اصل یہ ہے کہ ہر نیا دور چند در چند اسباب و علل کے ماتحت تیار ہوتا ہے ' اول تو خود انسانی فطرت صلاح و فلاح صفائی و بہتری کے لیے طبعاً سرگرم کار رہتی ہے ' اس کے بعد کچھ خاص شخصیتیں ہوتی ہیں جن کی دور رس نگاہیں آنے والے موسم کو سمجھ کر اس کی تائید و حمایت میں مصروف عمل ہو جاتی ہیں - اس لحاظ سے اصولی طور پر تو تنہا کسی ایک شخص کو کسی دور کا بانی نہیں کہہ سکتے لیکن جد و جہد میں جس کی شرکت غالب ہو اور جس نے عملاً اُس دور کی تحریک کو کامیاب بنانے میں زیادہ حصہ لیا ہو اس کو اس دور کا بانی کہہ سکتے ہیں ' تاہم فرداً فرداً دوسروں کے مساعی اور شرکت عمل کا بھی ذکر و اعتراف کیا جا سکتا ہے اگر ہماری

یہ رائے صحیح ہے تو آزاد کو جدید اردو شاعری کا بانی کہنا کسی
طرح صحیح نہیں ہو سکتا - بلکہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس
کا سہرا صرف مولانا حالی کے سر ہے - اگر علمی تحقیق '
حرف اولیت کے لیے آزاد کے اُس ایک لکچر پر اکتفا کرتی ہے جو
سنہ ۱۸۶۷ع میں اُنہوں نے انجمن پنجاب میں جدید نظریۂ
شاعری پر دیا تھا تو پھر اُس کے زیادہ مستحق مولوی
محمد اسمعیل میرٹھی کیوں نہیں ' جنہوں نے اسی سنہ میں
انگریزی سے پہلا ترجمہ کیا تھا ' بہر صورت ہمارے نزدیک اس
قسم کی چھوٹی چھوٹی اور بے اثر باتوں سے کسی کو ایک دور
کا بانی قرار دے دینا ایک طرح کی بیجا فیاضی بلکہ صاف
کہیے کہ " غلط بخشی " ہے - آزاد نے ممکن ہے کوئی چیز کبھی
ایسی بھی لکھ دی ہو جس میں جدید شاعری کے آثار و
امکانات پائے جاتے ہوں ' اِسی طرح میر انیس اور نظیر اکبرآبادی
کے یہاں بھی جابجا جو صفائی و سادگی نظر آتی ہے اُس سے
بھی جدید شاعری کا ہیولیٰ نکال کر پیش کیا جاسکتا ہے
لیکن پھر بھی جس طرح انیس اور نظیر اکبرآبادی کو جدید
اردو شاعری کا بانی نہیں کہا جاتا اُسی طرح آزاد کو بھی
جدید شاعری کا موجد کہنا صحیح نہ ہوگا - کسی ایسے ناقد
سے پوچھیے جس کی نظر اشعار کی تہ میں پہنچ کر شاعر کی
اُفتاد طبع اور اس کے ذہنی استعداد پر بھی پڑ سکتی ہو وہ
آزاد کی نظم و نثر دونوں کو بہ یک نظر دیکھ کر یہ کہہ دیگا کہ
تصنع ' غلو و مبالغہ اور غیر ذمہ دارانہ لطیفہ سنجی ان کی تحریر
و طبیعت کی نمایاں خصوصیات ہیں - ان کے اظہار و بیان
کی تمام عمارت تشبیہہ و تمثیل کے سہارے پر قائم ہے ' وہ

کا نام تو لیتے ہیں مگر فطرت سے قریب جاتے ہوئے ہمیشہ
اور لرزتے ہیں کہ مبادا ان کے استعارہ و کنایہ کا ماسع
نوک رہ نہ جائے ' غور کیجیے تو اُن کو ایسے دور کا قدرتی
بانی نہ ہونا چاہیے جس کی اصلی خصوصیت صداقت
' صحت خیال ' صحت اظہار اور صفائی و سادگی ہو -
وسری بات یہ ہے کہ تیسرے حصہ میں دور جدید کے
کا ذکر کرتے ہوئے ہرچند کہ ان کی خصوصیات پر نہایت
سے تبصرہ و محاکمہ کیا گیا ہے ' لیکن ضرورت تھی کہ
شعر کی بحث میں شعراء کی اُن خصوصیات کو نمایاں
دکھایا جاتا جن سے اِس دور کا مزاج ذہنی تیار ہوا ہے '
بتایا جاتا کہ ان شعراء نے شعر و ادب میں خیالات یا
ب کے اعتبار سے کیا کیا جدتیں پیدا کیں - ظاہر ہے کہ
شعرا میں سے صرف اُنہیں شعرا کا اس میں تذکرہ کیا
جو مرتب کے خیال میں صاحب طرز ہیں اور جن کے
خیالات نے جدید اردو شاعری میں کوئی خاص تبدیلی
کی ہے ' اس لیے یہ نہایت ضروری تھا کہ تاریخ شعر
ان کے خیالات ' عطیات و خصوصیات کو نمایاں کرکے
جاتا تاکہ عام ناظرین کو اُن اجزا و اخلاط کا بھی علم
جن سے جدید اُردو شاعری کا مزاج عقلی و ذہنی تیار ہوا ہے -
ہ چند باتیں بہت ہی خفیف و معمولی ہیں '
ت مجموعی " جدید اردو شاعری " اپنے موضوع اور اپنے
کے اعتبار سے " اختراع فائقہ " اور فاضل مرتب ہی کی
و زبان میں " ایک عہدآفریں کارنامہ " ہے - (۱)

غالب

مصنفۂ ڈاکٹر سید عبدالطیف پی ' ایچ ' ڈی پروفیسر انگریزی ادب ' جامعۂ عثمانیہ ' حیدرآباد دکن ' قیمت ایک روپیہ ۸ آنہ -

یہ کتاب ڈاکٹر عبدالطیف صاحب نے انگریزی میں لکھی تھی جسکا ترجمہ سید معین الدین قریشی ایم - اے نے کیا ہے - ایک مختصر سے دیباچہ کے علاوہ سات ابواب اور دو ضمیموں پر یہ کتاب مشتمل ہے ---- اُردو شعر و شاعری پر جو تنقیدیں عموماً نکلا کرتی ہیں اُن میں زیادہ تر اسلوب بیان اور طرز سخن کے حسن و قبح پر بحثیں ہوتی ہیں ' بعض بہت ہی قدیم طرز کے بزرگ ' زبان و محاورہ یا علم معانی و بیان کے فرسودہ اور دوراز کار مباحث میں بھی مبتلا نظر آتے ہیں ' لیکن شاعر کے احساس و تخیل کی خصوصیتوں کو جانچنے اور اُس کی شاعری کو اُس کی زندگی سے مطابقت دے کر شاعر کے حقیقی کمال کے قدر و اندازہ کی کوشش بہت ہی کم کی گئی ہے ' یہی وجہ ہے ' کہ شعر و شاعری کا عام مذاق ابھی تک بلند نہیں ہو سکا - اور عام حلقوں میں چند الفاظ کو کسی خاص وزن و بحر میں استعمال کر دینے کا نام شاعری سمجھا جاتا ہے - شعر کو شاعر سے اور شاعر کو شعر سے پہچاننا اگر اصلی سخن فہمی اور تنقیدی قابلیت ہے تو باوجود ہزارہا تنقیدوں اور شعر و شاعری کے بےشمار دفتروں کے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم نے ابھی تک شاعر اور ناقد دونوں بہت ہی کم پیدا کئے -

غالب کی شاعری کا آوازہ مولانا حالی اور اُن کے بعد

عبدالرحمن بجنوری نے بلند کیا ' اور یہ صور اس زور شور سے
پھونکا گیا کہ اِس کي آواز باز گشت آج بھی ہر طرف در و دیوار
سے سنائي دیتي ہے ' اس عام ہنگامۂ تقلید میں ڈاکٹر
عبداللطیف نے ٹھہر کر یہ بتانے کي کوشش کی ہے کہ بلند و
پر عظمت شاعري کے لئے ایک بلند شخصیت اور ایک عظیم
نفس کی بھي ضرورت ہے - شاعر کے تجربات اِس کي حقیقی
زندگي کے جس گوشے تک محدود ہوتے ہیں وہیں اُس کی اصلي
شاعري ہے ' اس کے علاوہ جو کچھ نظر آتا ہے اُس کي حیثیت
رسمي ' و تقلیدی اور اس لیے بے اصل و بے جان ہوتي ہے -
اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کے حالات
زندگي ' اور اُن کے دیوان کے متعدد نسخوں سے اُن کي غزلوں
کا زمانہ متعین کرکے یہ ثابت کرنے کي کوشش کي ہے کہ اُن
کي شاعري اُن کی زندگي سے پوري طرح ہم آہنگ نہیں ' شاید
مرحوم بجنوري کا یہ مشہور فقرہ کہ '' ہندستان کي دو الہامي
کتابیں ایک وید مقدس ایک دیوان غالب '' کچھ نہ کچھ
رد عمل بھي چاہتا تھا ! لیکن غالب کے مدح و ذم سے قطع نظر
اُردو شعر و شاعري کے باب میں نقد و نظر کي جو راہیں
اس سلسلے میں کُھل گئي ہیں وہ بیحد مفید اور اُمید
افزا ہیں یہ نقد و بحث ہمارے شعرا کے گروہ میں
بھي کسي طرح اگر پذیرا ہوسکی تو ہمیں قوی اُمید
ہے کہ بہت سے شاعر نہ سہي مگر بہت سے سچے اور اچھے انسان
ہمیں ضرور میسر آجائیں گے جو رسمي و مصنوعی شعرا سے
کہیں زیادہ قابل قدر اور ضروری ہیں - (ا)

داستان الم

مصنفہ محمد عمر حیات خاں - اورسیر الہ آباد - تقطیع اسکولی کتابوں کی - ضخامت ۱۵۴ صفحات - کتابت و طباعت معمولی - قیمت قسم اول ایک روپیہ - قسم دوم ۸ آنہ - ملنے کا پتہ :- حیات الہ بک ڈپو - حیات منزل - صمدآباد - الہ آباد -

شروع میں مختصر عرض حال ہے - اس کے بعد " کھیتی - بیوپار - نوکری اور بھیک " پر علیحدہ علیحدہ مختصر مضمون اور ہر مضمون کے تحت میں ایک ایک افسانہ ہے اس طرح کل چار مضامین اور چار افسانے ہیں - آخر میں جوزف میزینی اور مہاتما گاندھی کا مقابلہ ہے -

مسلمانان ہند کی قابل رحم حالت پر اس سے بہتر اسلوب سے بھی اظہار ہمدردی کیا جا سکتا تھا - حالانکہ یہ مضامین ادبی شان سے معرا اور افسانے فنّی حیثیت سے بالکل مبتذل اور بازاری ہیں بہر صورت " داستان الم " ایک عامیانہ مگر اشتعال انگیز تصنیف ہے ' خدا اِس کے زہریلے اثرات سے ہمارے نوجوانوں کو محفوظ رکھے - (ص)

آداب المسلمین

مولفہ مولوی محمد عثمان صاحب صدیقی الحنفی - الہ آباد - تقطیع بڑی - ضخامت ۱۹۲ صفحات - کتابت و طباعت عمدہ - ملنے کا پتہ - سلیمی پریس - بحھی پور - الہ آباد -

اس کتاب میں مولف نے اسلامی معاشرت کے آداب چھوٹی چھوٹی نصیحتوں اور مقولوں کے پیرائے میں مختلف سرخیوں کے

تحت میں جمع کر دیے ھیں مثلاً " والدین کے ساتھ برتاؤ " " اولاد کے ساتھ برتاؤ " - " دوستوں کے ساتھ برتاؤ " - وغیرہ - شروع کے سات صفحات میں مولف نے " سبب تالیف کتاب " کے زیر عنوان چند مفید باتیں بتائی ھیں مثلاً " اجزاےاسلام " - " فضائل اسلام " - " معاشرت اسلامي کی پابندي سے فائدے " - " موجودہ معاشرت کي خرابیاں " - ان امور کا مطالعہ ان نوجوان مسلمانوں کے لیے مفید ہوگا جو انگریزیت کی دھن میں اسلامي طرز معاشرت سے بیگانہ ہو رھے ھیں - ھمیں یقین ھے کہ " آداب‌المسلمین " نہ صرف عام مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہوگي بلکہ دیگر مذھب کے لوگ بھی اگر چاھیں تو اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کر سکتے ھیں - (ص)

آزادی

مترجمہ مولوي سعید انصاري صاحب بی - اے - (جامعہ) -
تقطیع بڑی - ضخامت ۱۹۶ صفحات - کتابت و طباعت پسندیدہ - ملنے کا پتہ - مکتبہ جامعہ اسلامیہ - قرول باغ دھلی -

یہ کتاب جان استوارٹ مل کي تصنیف " لبرٹي " کا اردو ترجمہ ھے - شروع میں ۳۶ صفحات کا مقدمہ پروفیسر محمد مجیب صاحب بي - اے کا لکھا ہوا ھے - جس میں موصوف نے آزادی کے اس مفہوم پر جس سے مل نے بحث کي ھے یعني سول یا جماعتي آزادي پر کافي روشني ڈالي ھے - نیز مل کی مکمل زندگی اور اس کی ادبی اور فلسفیانہ حیثیت کو بھي پوري صراحت سے واضح کیا ھے -

اس کے بعد ۲۵ صفحات کا دیباچہ ہے جس کے مطالعہ سے کتاب کے اصلی موضوع سے بہت کچھ واقفیت ہو جاتی ہے - اس کے بعد ترجمہ شروع ہوتا ہے جس کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس کی زبان صاف - سلیس اور ادبی ہے ہماری رائے میں " آزادی " ہر حیثیت سے ایک قابل قدر کتاب ہے - اور اردو علم و ادب میں ایک گراں قدر اضافہ - (ص)

پیام عمل

مصنفہ مولوی محمد عزیز صاحب اسرائیلی - علی گڈھی - تقطیع بڑی - ضخامت ۲۷۹ صفحات - کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۲ روپیہ - مصنف سے طلب کیجیے -

اس کتاب میں مصنف نے مسلمانان ہند کے گذشتہ اور موجودہ سیاسی - معاشرتی - اقتصادی اور مذہبی حالات کا صحیح مرقع پیش کیا ہے اور ان کی تنظیم اور فلاح و بہبود کی مفید تجاویز بتائی ہیں -

مضامین کی نوعیت کا اندازہ مندرجہ ذیل ابواب اور اُن کی ذیلی سرخیوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے - مثلاً باب اول " مسلمانان ہند کی موجودہ حیثیت "—باب دوم " مسلمانوں کے داخلی تعلقات " - یہ ابواب زیادہ تر تاریخی واقعات پر مشتمل ہیں - مثلاً " انگریزوں کی آمد " - " کانگریس " - " موجودہ تحریک اور مسلمان " - قومی انتشار " - وغیرہ باب سوم - " واہیات مراسم " - اس کے بعد چند مضامین مثلاً " شب برات " اور " محرم " - وغیرہ - باب چہارم " بعض مذہبی اعتقادات کی غلط تاویل " - باب پنجم " لائحہ عمل "

غرض " پیام عمل " نہایت دلچسپ کتاب ہے - ہر بات اور ہر تجویز سے مصنف کی نیک نیتی ' دور اندیشی اور خیر سگالی کا پتہ چلتا ہے - (ص)

گنجینۂ تحقیق

مصنفہ پروفیسر سید محمد احمد صاحب بیخود - موہانی - ایم - اے - پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ - تقطیع بڑی - ضخامت ۳۴۵ صفحات - کتابت و طباعت پسندیدہ - مصنف سے طلب کیجیے -

گنجینۂ تحقیق پانچ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت بیخود نے ان مضامین میں تحقیق اور تدقیق کا پورا پورا حق ادا کردیا ہے - کہیں کہیں معترضین کی طرح اعتراضات کے ہوائی سلسلے میں آپ نے بھی مزاح و ظرافت سے کام لیا ہے لیکن اعتراضات کے جواب میں آپ نے جس قدر کاوش اور جستجو سے کام لیا ہے وہ قابل تحسین ہے - تنقیدی معیار یوں تو ہر مضمون میں بلند نظر آتا ہے مگر آخری مضمون " آئینۂ تحقیق " خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس سے موصوف کی وسعت معلومات ' وقت نظر اور نکتہ سنجی کا پتہ چلتا ہے -

" گنجینۂ تحقیق " کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بیخود زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور آپ کا ذوق ادب بہت لطیف واقع ہوا ہے گو کہیں کہیں یہ ادبیت عربی و فارسی الفاظ کی کثرت سے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - تاہم یہ کتاب اُردو زبان کی تنقیدی اور تحقیقی ادب میں ایک اہم اور گرانقدر اضافہ ہے - (ص)

گلدستۂ محاورات اردو

مولفہ مولوی عابد حسین خانصاحب - هیڈ ماسٹر مٹھی گنج مڈل اسکول الہ‌آباد - تقطیع ڈبل کراؤن - کتابت و طباعت عمدہ ' ضخامت ۲۲۴ صفحات - قیمت ۱۲ آنہ ملنے کا پتہ :—
منیجر سلیمی پریس - یحیی پور - الہ‌آباد

کسی زبان کی وسعت اور افادیت کا راز ' اس امر میں مضمر هوتا ہے کہ اس کے محاورے اور روزمرے کسقدر تعداد اور تنوع رکھتے هیں پھر یہ کہ اس کے علمبردار اپنی تحریر و تقریر ' نظم و نثر میں اس کے کسقدر پابند هیں - لیکن اس کے لیے بڑی ضرورت اسکی ہے کہ محاورات کو صحت اور سلیقہ سے مدون اور مرتب کیا جاے اور طریق تفہیم میں افادۂ عام کا پہلو بیش از بیش نمایاں ہو -

اردو میں لغات سے علحدہ صرف محاورات پر شاید هی کوئی کتاب هو اور دو ایک جو هیں بھی وہ ان مذکورۂ بالا امور و اغراض کی حامل نہیں -

حال میں عابد حسین خانصاحب الہ‌آبادی نے ایک کتاب " گلدستۂ محاورات اردو " ترتیب دی ہے جس میں تقریباً تیرہ هزار مروج مگر شائستہ محاورات کا مطلب و مفہوم سمجھایا اور نظماً و نثراً ان کا محل استعمال بتایا ہے - انتخاب اشعار میں بھی استناد اور شائستگی کا بھی کافی لحاظ رکھا ہے -

همارے خیال میں یہ کتاب طلبہ - مدرسین اور عام مشتاقان فن کے لیے یکساں طور پر مفید اور ضروری ہے همیں امید اور وثوق ہے کہ پبلک اس کتاب کی پزیرائی اور مولف کی همت افزائی کریگی -

———

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماهی رساله

جلد ۳ | بابة ماه اپریل ۱۹۳۳ع | حصه ۲

ایک پرانی اردو مثنوی :

" ماه پیکر "

از پروفیسر محمد محفوظ الحق ' ایم - اے

" ماه پیکر " اردو کی ایک پرانی مثنوی هے - مولف کا نام " احمد جنیدي " اور سال تالیف ۱۰۶۴ھ هے - اس کا ایک نسخه تیپو سلطان کے کتاب خانے میں تھا[1] ' پتا نہیں چلتا کہ اب وہ نسخه کہاں هے - بد قسمتی سے کوئی دوسرا نسخه بھی نہیں ملا کہ همارے محققین اُس سے استفادہ کرتے - میں ۱۹۲۰ع میں امپیریل لائبریری (کلکته) کے " بوهار " سکشن

---

۱ - " فہرست کتاب خانۂ ٹیپو سلطان " از چارلس اسٹیوارٹ (۱۸۰۹م) ' ص ۱۷۹ -

کے قلمي نسخے دیکھ رہا تھا کہ اتفاق سے اِس مثنوي کا ایک نسخہ مل گیا - اس کا ذکر میں نے مخدومي نواب سید نصیر حسین خاں صاحب " خیال " سے کیا اور اُس کے چند شعر بھي نواب صاحب کو لاکر دیے - اُس زمانے میں وہ " داستان اُردو " کي ترتیب میں مصروف تھے ؛ دیکھکر خوش ہوئے اور جب اِس " داستان " کا ایک حصہ اُنھوں نے شایع فرمایا تو اِس مثنوي کا بھي ذکر کیا اور " خاتمہ کے دو شعر بھی نقل کیے[۱] - اِس اطلاع کو مولوی نصیر الدین ھاشمي صاحب نے اپني کتاب " دکن میں اُردو " (ص ۱۳) اور حکیم سید شمس اللہ صاحب قادري نے " اُردوے قدیم " (ص ۱۰) میں درج کیا ' لیکن جب ۱۹۲۹ع میں ڈاکٹر محي الدین صاحب قادري نے " اُردو شہپارے " کو شایع کیا تو اُنھوں نے یہ اعتراض کیا کہ :

" اُردوے قدیم کے مصنف کی نظروں سے جلیدي کي کتاب ماہ پیکر کا کوئي مخطوطہ نہیں گذرا ھے اُنھوں نے صرف استھوارٹ کي ذمہ داری پر جلیدی کا نام شیخ احمد بتلایا ھے - لیکن استیوارٹ نے نہ تو ماہ پیکر کے مصنف کا نام لکھا ھے اور نہ اُس کے کچھ حالات درج کیے ھیں ' اُس کے زمانہ کي لکھي ھوئي تاریخ یعني شاہ عبداللہ کي سوانح عمري (دیکھو ضمیمہ) سے اِس بات کا پتہ چلتا ھے کہ اُس کا نام علی اکبر جلیدی دکھني تھا ' اگرچہ مخطوطہ میں یہ نہیں لکھا ھے کہ عبداللہ قطب شاہ کا زیر بحث درباري جلیدي ماہ پیکر کا مصنف تھا لیکن اتنا ضرور ھے کہ ماہ پیکر کا مصنف جلیدي ' عبداللہ کے عہد حکومت

---

۱ - رسالۂ " لسان الملک " حیدرآباد دکن جلد ۱ ' نمبر ۳ -

شاعر تھا و نیز اس کے متعلق کوئی ثبوت اور سند نہیں ھے کہ اُس کا نام شیخ احمد تھا پس اس صورت میں ھمیں اُس کا نام علی اکبر تسلیم کرنے میں شبہے کی بہت کم گنجایش نظر آتی ھے -

" مثنوی ماہ پیکر کی نسبت بھی بہت کم معلومات اِس وقت حاصل ھیں اتنا ضرور علم ھے کہ وہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۶۳ھ میں لکھی گئی اور یہ کہ اُس کا ایک قلمی نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں محفوظ تھا " - (اُردو شہپارے ' صفحہ ۱۰۷) -

افسوس ھے کہ ڈاکٹر صاحب کی نظر نواب خیال صاحب اور نصیرالدین ھاشمی صاحب کی تحریروں پر نہیں پڑی ' جن میں صاف لکھا ہوا ھے کہ اِس مثنوی کا ایک نسخہ " امپیریل لائبریری " (کلکتہ) میں موجود ھے - ڈاکٹر صاحب نے مصنف " ماہ پیکر " کے نام کے متعلق فیصلہ کرنے میں بھی عجلت سے کام لیا ھے - چنانچہ اُن کے ایک " تنقید نگار " نے زرا درشت لہجے میں لکھا ھے[۱] :—

" شہپارے کا مصنف سب سے زیادہ مولوی عبدالحق کے مضامین سے خوشہ چینی کر رھا ھے اور اُس کے بعد اُردوے قدیم سے لیکن اُس نے اپنی زلہ‌ربائی کا اقرار قسم کھانے کو بھی نہیں کیا - البتہ اُس نے اپنے پیشروؤں کی لغزش اور فروگذاشت کا ذکر ضرور کیا ھے - مثلاً جنیدی کے ذکر میں اُس کو شاہ عبداللہ

---

۱ - اورینٹل کالج میگزین ' لاھور ' ج ۶ ' شمارہ ۳ ' ص ۹۵ -

نی سوانح‌عمری سے معلوم ہوا کہ اس عہد میں ایک شخص
علی‌اکبر جلیدی موجود تھا إدھر أردوے قدیم میں جلیدی مصنف
ماہ و پیکر کا نام احمد بتایا گیا تھا - ہمارے ڈاکٹر نے فیصلہ
دے دیا کہ شاعر کا نام علی‌اکبر تھا '' -

إس میں مطلق شبہہ نہیں کہ '' ماہ‌پیکر '' کے مصنف کا
نام '' علی‌اکبر (جلیدی) '' نہیں بلکہ '' احمد (جلیدی) ''
ہے ' إس لیے کہ أس نے خود مثنوی میں اپنا نام صاف صاف
بتا دیا ہے ' مثلاً :—

کہ احمد جلیدی پہ در یوں کرم
وھوے نانوں لب پر '' محمد '' جرم[1]

[ورق ۱ ' ب]

کہ احمد جلیدی گنہ‌گار ہے
سو دین رین کا او طلب گار ہے

[ورق ۳ ب]

کہ احمد جلیدی کو أن کا پناہ
عجب نے ' ہووے نظم یو عالی جاہ

[ورق ۴ الف]

کہ احمد جلیدی یو غم خانہ چھوڑ
کہ دُک ماہ‌پیکر کا دک سات جوڑ

[ورق ۹ ب]

---

۱ - یعنی " جلم ' (؟) - (ص) -

کہ احمد جنیدی توں ہو باغباں
نہیں باغ او ہے سو باغ جناں
[ورق ۱۰۳ ب]

---

(۲)

مندرجۂ بالا بیان سے معلوم ہوا ہوگا کہ مثنوی " ماہ‌پیکر " کے متعلق ہمارے جدید محققین کے معلومات نہایت محدود ہیں ' کیونکہ اُن کے پاس اِس کا کوئی نسخہ موجود نہیں - حسنِ اتفاق سے کلکتے میں اِس کے دو نسخے محفوظ ہیں - میں " دکنیات " کا ماہر نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اِس سے دور کا بھی لگاو نہیں - لیکن یہ سطریں محض اِس خیال سے لکھ رہا ہوں کہ اِس نایاب اور قابل قدر مثنوی کے متعلق جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ دور ہوجائے ' ممکن ہے کہ یہ سطریں دلچسپی کا باعث ہوں اور ہمارے کوئی ماہر " دکنیات " اِس موضوع پر قلم اُٹھائیں اور اپنے غائر مطالعے کے نتایج بہتر اور مکمل طور پر ملک کے سامنے پیش کریں -

جو دو قلمی نسخے کلکتے میں موجود ہیں ' اِس وقت وہ دونوں میرے سامنے ہیں :—

پہلا نسخہ امپیریل لائبریری (کلکتہ) کے " بوہار " سکشن کا ہے - یہ نسخہ مکمل اور خوش خط ہے - کاتب جس نے اپنا نام نہیں دیا ہے ' " نسخ " اچھا لکھتا تھا - کاغذ اور کتابت وغیرہ کے دیکھنے سے گمان ہوتا ہے کہ خود مولف کے زمانے میں یا اُس کے کچھ بعد لکھا گیا ہے ' تعداد اوراق " ۸۱ "

ہے اور ہر صفحے پر ۱۷ سطریں ہیں ، ہر باب کے شروع میں تھوڑی جگہہ "سرخي" کے لیے خالي ہے ۔ ۳۱ شعر حاشیے پر بھي درج ہیں ۔ میرے عزیز شاگرد ، مولوی خلیل الرحمن ، ایم - اے ، نے اشعار کے گننے کي زحمت گوارا کي ہے ، اُن کے حساب سے ۲۹۱۷ شعر ہوتے ہیں - اُس زمانے کے عام دستور کے مطابق کاتب نے "کاف ، گاف" "دال ، ڈال" اور "یاے معروف و یاے مجہول" میں فرق نہیں کیا ہے ، اکثر "کہ" کو "کی" لکھا ہے ، جیسے (ع) نجانیکی پختا کہ یا خام ہے - اِسي طرح اضافت کی جگہہ بھي اکثر "ي" استعمال کي ہے ، جیسے (ع) کہ سلطان محمود شاہِ جہاں - بعض مقامات پر "کے" کي جگہہ "کہ" لکھا ہے - "ہووے" کو اکثر 'ہوے' لکھا ہے - بعض جگہہ املا کي غلطیاں بھي ہیں ، مثلاً الحام (الہام) ، طلخ (تلخ) محیا (مہیا) حاطف (ہاتف) بطول (بتول) وغیرہ ، لیکن ہاتف کو دوسری جگہہ صحیح بھي لکھا ہے - ب اور پ ، ج اور چ ، ر اور ژ ، میں فرق کرنے کے لیے ایک نشان بنا دیا ہے ، جس کي شکل بگڑي ہوئي ح کي سي ہے -

دوسرا نسخہ "ایشیاٹک سوسائٹي بنگالہ" کا ہے ، پہلے یہ نسخہ "فورٹ ولیم کالج کلکتہ" میں تھا ، چنانچہ کالج کي مہر آخر صفحے پر ثبت ہے-[۱] یہ نسخہ ناقص ہے ، ابتدا کے چار ورق غائب ہیں ، جن میں ۹۰ شعر تھے ، ورق ۱۰ ب پر ایک

---

۱ - دتاسي کہتا ہے کہ غالباً یہي وہ نسخہ ہے جو ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں تھا - ('ہندستاني ادب کي تاریخ' ج ۳ ، ص ۲۶۹ -) - (ص) -

نئے باب کا آغاز ہونا چاہیے تھا لیکن وہ غائب ہے ' اس باب میں ۳۹ شعر ہیں - یہ عجب اتفاق ہے کہ اول الذکر نسخے میں بھی یہ اشعار درج نہیں بلکہ " حاشیے " پر بڑھائے گئے ہیں - اِس نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۱۵۹ ہے - کاغذ پرانا معلوم ہوتا ہے اور پہلے نسخے سے دبیز اور بہتر ہے ' خط نسخ ہے اور ہر باب کا آغاز ایک سرنامے سے ہوتا ہے جو سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے ' سرنامے کی زبان فارسی ہے - کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا اور نہ تاریخ کتابت ہی لکھی ہے ' لیکن یہ نسخہ بھی پرانا ہے ; گیارھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے - اوراق کی تعداد ۱۰۴ ہے اور ہر صفحے پر ۱۳ سطریں ہیں -

پہلا نسخہ مکمل ' صحیح اور معتبر معلوم ہوتا ہے اور میں نے زیادہ تر اُسی نسخے سے استفادہ کیا ہے -

(۳)

کتاب سے مصنف کے حالات پر مطلق روشنی نہیں پڑتی کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا اور کس جگہہ بیٹھہ کر اُس نے یہ مثنوی لکھی - " وجہ تالیف " کے متعلق کہتا ہے کہ ایک دن میں اپنے چند دوستوں کے ساتھہ بیٹھا تھا کہ اُنھوں نے " ماہ پیکر " کا قصہ سنانے (غالباً نظم کرنے) کی فرمایش کی ' لیکن میں نے عذر کیا کہ عرصے سے میں نے شعر شاعری کا مشغلہ چھوڑ دیا ہے ' اب مجھہ سے یہ کام نہیں ہو سکتا - چند دن کے بعد مجھے الہام ہوا کہ اب کاہلی چھوڑ اور اس قصے کو نظم کا جامہ پہنا ' چنانچہ میں نے اِس حکم کی تعمیل کی اور اِس طرح یہ مثنوی تمام ہوئی - مولف کے الفاظ یہ ہیں :—

دہ یک دن سو بیٹھا تھا یاراں سلگات

کرے ملکہ[1] سب انتظاری کی بات

کہ عاشق اور معشوق ' پیکر او ماہ

اونو کا[2] نوا قصہ ہم کوں سنا

.. ..

جواب اُن کوں دیتا میں ایسا پھرا

نہ شاعر کتا ہوں بھلا ہور بورا

کہ چھوڑیاں ہوں لی دنتی[3] میں کار یو

سٹیا ہوں اپس دل تے بستار یو

کہ کہہ بات اِتنی گلا میں کیا

اونوں کو جواب اِس وضا کا دیا

کتک دن او گذرے سو اِس بات کوں

یکا یک او الہام ہوا رات کوں

نکو کر گلا توں سو یوں بولنے

کہ در جگ جواہر کے تو کھولنے

غواص ہو اپن دل دریا کے بھتر

کہ لیا دُر شہوار توں خوب تر

نکو کاھلی توں سونہہ راز کوں[4]

کر اظہار توں اِس پرم ساز کوں

---

۱ - مل کے - (ص) -

۲ - اُنو کا (یعنی اُنھوں کا) - دکن میں ' اُنو ' یا ' اُنوں ' مجہول واو کے ساتھ ہے - (ص) -

۳ - کلا چھوڑیا ہوں کئی دن تے (ص) -

۴ - نلا کر (؟) کاھلی توں سنیا (؟) راز کوں - (ص) -

یو سن کر دریا دل میں ذبکي لیا
فکر کے سو گرداب میں منجھ دیا

..　　..　　..　　..　　..

تب اُس وقت موتي لے بھار آئیا
پوروبا لواں جوں کہ جگ بھائیا
کیا نظم بوتاں سو اِس گیاں سکل
کہ جوں تھال موتیاں کي مانند نچھل

[سنگات = ساتھ - نوا = نیا - کتا ھوں = کہتا ھوں - ستیا = پھینک دیا - کلا = مدر - نکو = نہیں - لیا = لا - پرم = پریم ' محبت - بھار = باھر - سکل = سب - نچھل = صاف ' -]

مندرجۂ بالا اقتباس کے تیسرے اور چوتھے شعر سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ مثنوي اُس زمانے کي تالیف ھے جب مصنف شعر و شاعری کا مشغلہ چھوڑ چکا تھا - شاید بڑھاپا آچکا تھا اور وہ اپني زندگی کے آخری دن آرام و اطمینان سے بسر کر رھا تھا ' وہ کسي دربار سے بھی اپنے تعلق کا ذکر نہیں کرتا اور اگر تعلق تھا بھي تو قرینۂ غالب ھے کہ وہ اِس زمانے میں منقطع ھو چکا تھا -

مثنوي کا نام اُس نے " ماہ پیکر " رکھا[1] ' چنانچہ کہتا ھے :

رکھیا " ماہ پیکر " سو اِس نیک نام
الٰھي توں کر اِس نظم کوں تمام

---

۱ - " ماہ پیکر " کے لفظ سے یہ دھوکا ھوتا ھے کہ مثنوی میں جس دوشیزہ کي داستان بیان ھوئي ھے اُسي کا نام " ماہ پیکر " ھوگا - حقیقت میں ایسا نہیں ' بلکہ " ماہ " اور " پیکر " دو نام ھیں - " پیکر " ایک

پھر دعا کرتا ہے :

الٰہی توں روشن کر اِس ماہ جوں   ہووے ارجمند یو نظم شاہ جوں

یہی دعا خاتمے میں بھی ہے :

الٰہی توں کر یو نظم جگ اُجال
کہ ہووے دو جگ میں جو محبوب مثال

پھر معذرت کرتا اور کہتا ہے کہ اگر کوئی خامی ہو تو مجھے الزام نہ دو بلکہ اُس کی اصلاح کر لو :

اگر چوک پاویں گے اِس میں ذرا
کرو راست تم خوب اِس کوں پھرا
نہ کچھ عیب اِس کا سو مجھ پر دھرو
اگر عیب اُچھیگا عفو سب کرو
نجانے کی پختا کہ یا خام ہے
کہ یا کام کا ہے یا بے کام ہے

نوجوان ہے اور " ماہ " اُس کی محبوبہ - اِنھیں دونوں کی محبت کی کہانی اِس مثنوی میں کہی گئی ہے - " پیکر " ایک ایسا نام ہے جو کبھی سنا نہیں گیا ' مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اِس نام کے اختیار کرنے میں ایک لطیف پہلو پر نظر رکھی ہے : محبوبہ سراپا نور تھی اِس لیے ماہ کہلائی ' حسن کے اِس جوہر کے لیے عشق سے زیادہ موزوں کوئی قالب نہ ملا ; اُسی کو جو ہمہ تن عشق تھا اُس کا " پیکر " گردانا - اِس سے دونوں کی وابستگی کا درجہ بھی معلوم ہو گیا کہ جوہر اور عرض ' جان اور قالب کا سا تعلق تھا اور ایک کا وجود بغیر دوسرے کے گویا ممکن ہی نہ تھا -

مثنوی کے نام " ماہ پیکر " کی ترکیب وہی ہے جو " نل دمن " ' " ہیر رانجھے " ' " لیلیٰ مجنوں " کی ہے - عطف کی یہ معنوی ترکیب ' جو اردو زبان کے لطیف نکتوں میں سے ہے ' یہاں سونے پر سہاگا ہو گئی - (ص)

مولف سنی مذہب ہے کیونکہ حمد و نعت کے بعد وہ خلفائے راشدین کی منقبت کرتا اور کہتا ہے :

"ابا بکر صدیق" جس نانوں ہے
بڑا مرتبہ اُس کوں حق تھانوں ہے
نبی بعد ازاں او امامت کیا
کہ اسلام کوں زور سر سوں دیا
"عمر" ہے سو عادل عدالت منیں
کہ بے مثل ہے او شجاعت منیں

...   .

نبی کا سو داماد "عثمان" ہے
کہ ہر دو جہاں میں اوسے مان ہے

..   ..

علم کے شہر میں "علی" باب ہے
جکوئی اُس کوں مانے اوسے لاب ہے

...   .

ہزاراں درود ہور ہزاراں سلام
نبی آل پر ہور یاراں تمام

دوران قصہ میں بھی خلفائے راشدین وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے :

مدد تجھ ابا بکر ہور ہے عمر
مدد تجھ ہے عثمان ہور شہر نر
خدیجہ و عایشہ و زہرا بتول
مناجات اُن کی ہے نسدن قبول

امامان شہیداں سو سب کربلا
کریں او دعا تجکوں ہووے بھلا

دوسری جگہ کہتا ہے :

کہ سوگند نبی ہور آل نبی
نہی بات میری او تھل قال کی
کہ سوگند ابا بکر ہور ملنج عمر
کہ ہے بات ملنج راست کی کہج وگرا[1]
کہ سو گند عثمان و شہر خدا
کہ اِس چار یاراں پو ملنج جاں فدا

لیکن " خاتمہ " کی " مناجات " میں " خلفاے راشدین " کا ذکر نہیں کرتا بلکہ رسول کے بعد " دوازدہ امام " میں سے صرف حضرت علی ، امام حسن ، امام حسین ، امام زین‌العابدین ، امام محمد باقر ، امام جعفر صادق [2]،

---

۱ - اگر (؟) - (ص) -

۲ - ناموں کی یہ ترتیب امپیریل لائبریری کے نسخے میں ہے ، لیکن امام موسیٰ کاظم کا نام اُس میں موجود نہیں - ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے میں امام محمد باقر (امام پنجم) کے نام کے بعد امام موسیٰ کاظم (امام ہفتم) کا نام اور اُن کے بعد امام جعفر صادق (امام ششم) کا نام آتا ہے - امپیریل لائبریری کے نسخے میں اشعار یوں ہیں :—

الٰہی بحرمت تجلاے نور | محمد باقر اوپر ہے ظہور
الٰہی بحرمت دنیا دین قرار | کلا ہے موسیٰ کاظم دونو جگ ادھار
الٰہی بحرمت ولیاں میں امام | امام جعفرے صادقِ نیک نام

امپیریل لائبریری کے نسخے میں دوسرا شعر یوں ہے :—

الٰہی بحرمت دنیا دین قرار | کلا ہے سب کوں اِس سے دو [نو] جگ ادھار

امام موسیٰ کاظم[1] اور امام علي بن موسیٰ رضا کا '' واسطہ '' دے کر مدد طلب کرتا ' پھر اولیاے کرام کا '' واسطہ '' دیتا اور اپني نظم کے مقبول ہونے کي دعا کرتا ھے - اُس نے جن اولیاے کرام کے نام گنائے ھیں یا جن کی طرف کنایۃً اشارہ کیا ھے ' وہ یہ ھیں :—

(۱) داؤد طائفي (۲) '' حبیب عجم ''[2] (۳) معروف کرخي (۴) سري السقطي (۵) جنید (بغدادی) (۶) '' قطبِ زماں ''[3] (قطب زماں) (۷) محمد سراج طوسي (۸) حسن سرخسي (۹) (ابو) سعید بن ابوالخیر (۱۰) محمد جعفر (۱۱) '' شمس العارفین ''[4] (۱۲) سید نجم الدین (۱۳) سید کبیر (رفاعي ؟) (۱۴) محمود حسیني (۱۵) سید خوندمیر (۱۶) محمد سراج '' غوث و قطب ''[5] (۱۷) شیخ ابوالفضل (۱۸) '' سراج

---

۱ - امپیریل لائبریري کے نسخے میں امام جعفر صادق (امام ششم) کے نام کے بعد ھی امام علي ابن موسیٰ رضا (امام ھشتم) کا نام آجاتا ھے - دونوں نسخوں میں امام رضا کا ذکر یوں ھے :—

الهي بحرمت ھے ثابت دیں علي ابن موسیٰ رضا کر یقین

۲ - الهي بحرمت ھو اِسلامدار حبیب عجمیں اوپر ھوا دیں قرار

۳ - الهي بحرمت آں قطبِ زماں کہ ھے مرتعش شمس روشن جہاں

۴ - الهي بحرمت شمس العارفین کہ ھادي مرید ھے دنیا و دیں

[بحرمت شمسِ عارفین ' یا ' بحرمت شمس عارفیں - س]

۵ - الهي بحرمت محمد سراج کہ غوث ھور قطب سب ولیاں کا ھے تاج

ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے میں اِن کا نام سید خوندمیر سے پہلے مذکور ھے ' اور امپیریل لائبریری کے نسخے میں سید خوند میر کا نام دو جگہ آیا ھے -

اولیا "[1] (۱۹) " شیخ‌اللہ "[2] (۲۰) شیخ معین‌الدین (۲۱) " قطبے جہاں " (قطب جہان) اور (۲۲) ناصر ولي -

مثنوی کے شروع میں بھي شاعر نے بعض اولیاے کرام کا ذکر کیا ھے :-

کہ " ناصر ولي " پیر دل سوز ھے
مدد اُس ولي کا شب و روز ھے

کہ " خواجہ جلید " مجھے ھے دستگیر
اوس واسطے جیو ھے میرا کنبھیر[3]

کہ " میران محی‌الدین " مجھ سر چھتر
جو کچھ میں کہوں کا سو ھے خوب تر

" محمد سراج " کا سو میں ھوں غلام
کہ ھوویگا مقبول میرا کلام

جب احمد جلیدي کو اُن کا پناہ
عجب نے ' ھووے نظم یو عالیجاہ

" خاتمہ " میں جو ' مناجات ' ھے اُس کا انداز یہ ھے :—

الہي بحرمت محمد رسول
شفاعت جلنکي[4] ھے دو جگ قبول

---

۱ - الهي بحرمت سراج اولیا ولیاں میں بڑا مرتبہ وس دیا
اِس شعر پر ایشیاٹک سوسائٹي کا نسخہ تمام ھو جاتا ھے اور آخر کے دس شعر اِس نسخے میں موجود نہیں -

۲ - الهی بحرمت ولی کار کا کہ ھے شیخ اللہ تجھ پیار کا

۳ - " اِسي واسطے جیو ھے میرا کنبھیر ' - کنبھیر یعني گمبھیر = " قائم ' مستقل ' ٹھوس ' گہرا " ؛ اِس موقع پر " مطمئن " (ص) -

۴ - جلنوں کي (؟) یعنی جنھوں کی - (ص) -

الہي بحرمت کہ شیرے خدا
کہ حضرت علي ھے سو برحق سدا
الہي بحرمت حسن شہ امام
کہ دین ہور دنیا ھے قایم مقام

...   .

الہي بحرمت کہ نورالبشر
کہ معروف کر خي صاحب خبر

..   ..

الہي بحرمت کہ جوں آفتاب
کہ ناصر ولي کا ھے دو جگ میں داب
الہي بحرمت ہمہ اولیا
کہ یو نظم کرنے کوں قوت دیا
الہي تو کر یو نظم جگ اُجال
کہ ہووے دوجگ میں جو محبوب مثال

اس کے بعد وہ تاریخ '' اِتمام '' مثنوي دیتا اور دعا پر ختم کرتا ھے :—

نبي کے سو ہجرت کا یو تھا قرار
چہار سال ، تین بیس ، بھی یک ہزار
کہ تاریخ دس‌ویں محرم انہی
ہوا ختم یو نظم جوں مہ پتي
کہ احمد جلیدی تو یلہ بات کوں
کہ کریو نہایت تو صلوات سوں
درود مصطفیٰ پر ، ہزاراں سلام
ہوا ختم الحمد سوں یو کلام

اِس سے معلوم ہوا کہ '' ماہ پیکر '' ۱۰ محرم ۱۰۶۴ھ (مطابق ۳۱ دسمبر ۱۶۵۳ع) کو تمام ہوئی -

'' ماہ پیکر '' اور اُس کے مصنف (احمد جنیدی) کے متعلق اِسی قدر اطلاع اِس مثنوی سے ملتی ہے - مزید حالات کے لیے اکثر مطبوعہ اور بعض غیر مطبوعہ تذکروں کو دیکھا لیکن اُن میں جنیدی کا نام تک نہ ملا - پروفیسر شیرانی کے پاس '' لیلیٰ مجنوں '' مولفہ احمد دکنی کا ایک نا مکمل نسخہ ہے ' یہ مثنوی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حکم سے لکھی گئی اِس لیے اِس کا زمانہ ۱۰۲۰ھ سے پہلے ہے - یہ احمد (مولف '' لیلیٰ مجنوں '') احمد جنیدی (مولف '' ماہ پیکر '') سے مختلف ہے کیونکہ اول الذکر اپنا نام صرف احمد لکھتا ہے ' مثلاً :

جو '' احمد '' کرے آس دھر بن سنگار
سو اب شہ[1] تھے پائے سیتن سنگار
بہو عجز سوں آس '' احمد '' دھرے
کہ سائیں دکھت عجز رحمت کرے[2]

لیکن احمد جنیدی نے ایک جگہہ بھی اپنا نام صرف '' احمد '' نہیں لکھا -

ابن نشاطی نے بھی اپنی مثنوی '' پھول بن '' میں ایک شاعر '' شیخ احمد '' کا ذکر کیا ہے ' وہ کہتا ہے کہ اگر فیروز

---

۱ - شاہ (؟) -

۲ - شیرانی ' '' پنجاب میں اردو '' ص ۱۷۳ و ۱۷۴ -

استاد ' سید محمود ' شیخ احمد ' حسن شوقی اور ملا خیالی وغیرہ شعرا زندہ ہوتے تو وہ میرے کمال کی داد دیتے :-[1]

نہیں وو کیا کروں " فیروز " استاد
کہ دیتا تھا عرب (؟) کا کچھ میرا داد
اہے صد حیف جو نیں " سید محمود "
کتے پانی کو پانی دود کو دود
نہیں اِس وقت پر وہ " شیخ احمد "
سخن کا دیکھتے باندیا سو میں سد
" حسن شوقی " اگر ہوتا تو الحال
ہزاراں بھیجتا رحمت مجھ اپرال
اچھے تو دیکھتا " ملا خیالی "
یو میں برتیا ہوں سب صاحب کمالی

ڈاکٹر محی الدین قادری کا خیال ہے کہ یہ " شیخ احمد " مولف " لیلی مجنوں " ہے (اُردو شہپارے ' ص ۹۸) - " پھول بن " ۱۰۶۶ یا ۱۰۷۶ ہجری کی تالیف ہے[2] - اگر اُس کا سال تالیف واقعی ۱۰۷۶ ہجری ہے تو ممکن ہے کہ شیخ احمد سے مراد احمد

---

۱ - یہ اشعار ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک نسخے سے نقل کیے گئے ہیں ' یہ نسخہ جدیدالخط اور بہت غلط ہے ' چونکہ دوسرا نسخہ مجھے ملا نہیں اِس لیے مجبوراً یہ اشعار اِسی نسخے سے لینا پڑے -

۲ - " انڈیا آفس " کے نسخے میں سال تالیف ۱۰۶۶ہ ہجری ہے چنانچہ " فہرست " (مرتبہ بلمہارٹ ' ص ۵۵) میں یہ شعر درج ہے :

اتھا تاریخ لایا یو تو گلزار
اگیارا سو کوں کم تھے تیس پرچار

(بلمہارٹ کی " فہرست " میں غلطی سے " تین پر چار " چھپ گیا ہے -) بخلاف

جدیدی ہو - موجودہ اطلاعات کی بنا پر میں ڈاکٹر محی الدین قادری کی راے سے اختلاف کرنے کے لیے تیار نہیں - بہر حال یہ نکتہ قابل غور ہے اور اِس بارے میں تحقیقات کی گنجایش نظر آتی ہے -

(۵)

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے " دکنیات " سے دور کا بھی واسطہ نہیں ' اِس لیے " ماہ پیکر " کی " لسانی " اور دیگر خصوصیات پر میرے لیے کچھ لکھنا بڑی جرأت کا کام ہے ' لیکن جب مخدومی مولوی عبدالحق صاحب کے مضمون " کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ " (رسالۂ اُردو ' جلد ۲ ' ص ۱۳ - ۳۹) کو دوبارہ پڑھا تو مجھے ہمت ہوئی اور یہ چند سطریں اُسی کو سامنے رکھکر لکھ رہا ہوں ' یہ حصہ نا مکمل اور " تشنۂ تحقیق " ضرور ہے لیکن بقول " احمد جنیدی " :

نہ کچھ عیب اِس کا سو منجھ پر دھرو
اگر عیب اچھیگا عفو سب کرو

اِس مثنوی کی زبان وہی ہے جو اُس زمانے کی مثنویوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے - " مقامی " الفاظ کثرت سے آتے ہیں اور وہ اُسی طرح لکھے بھی ہیں جس طرح اُس زمانے میں بولے جاتے تھے ' عربی اور فارسی کے الفاظ کے متعلق املا کی چنداں پروا نہیں کی گئی ہے بلکہ اُن کو اُسی طرح لکھا بھی

اِس کے کتب خانۂ آصفیہ ' حیدرآباد دکن ' کے نسخے سے سال تالیف ۱۰۷۹ نکلتا ہے ' (" اُردوے قدیم " صفحہ ۵۹) :

اتھا تاریخ لایو توں یو گلزار
ایکیارا سو کوں کم تھے بیس پوچار

ھے جس طرح لوگوں کی زبان پر رائج تھے : جیسے '' فہم '' کو '' فام '' لکھا ھے اور اُس کا قافیہ '' کام '' لایا ھے :

'' کلیالہ '' چپ رہ تجھے فام نہیں
عقل هور تج میں بھی کچھ کام نہیں

دوسری جگہہ '' بے فام '' یعنی '' بے فہم '' (بمعنی نافہم) استعمال کیا ھے :—

لوتھی بول مہ : نی ' تو '' بے فام '' ھے
تجے عشق بازی سوں کیا کام ھے

'' وضع '' کو تلفظ کے مطابق '' وضا '' لکھا ھے :—

کبھی یوں تجھے کس '' وضا '' پاؤنگی

'' نوشہ '' کو '' نوشوا '' (نوشا) اور '' عروس '' کو '' آروس '' [1] لکھا ھے :—

ملے ماہ پیکر جو یک تخت پر
کہ '' نوشوا '' و '' آروس '' تھے بخت ور

'' رحل '' کو '' ریحل '' استعمال کیا ھے :—

مُصحف کھول '' ریحل '' کے اُپراں دھر
کہ پڑنے لگے دونو او سر بسر

'' سِر '' کو '' سیر '' لکھا ھے :—

کہ لوٹن لگے '' سیر '' ھت مار مار

'' دوستی '' کو '' دُستی '' باندھا ھے :—

نہ '' دستی '' ھے محبوب نا بات ھے

---

۱ - آج کل دکن میں (خاص کر عورتوں کی) زبانوں پر '' آرس '' ھے اور آروس بھی سنا جاتا ھے - (ص) -

ایک جگہہ " وضع " کو " وزا " لکھا اور اُس کا قافیہ " سزا " لایا ہے :—

میں جاتا ہوں اُس ٹھاؤ پر اِس " وزا "
میرا کام اچھیگا تو ہوئیگا سزا

اِسی طرح عربی اور فارسی لفظوں کے " اعراب " کی بھی پروا نہیں کی ہے ، مثلاً :—خلَق (خَلق) ، صُبَح (صبح) ، عقَل (عقل) ، متّجد (مسجد) ، عذّاب (عذاب) ، ملتاں (ملّتاں) ، همَت (همّت) ، مصف (مصحف) ، حمام (حمّام) ، برَگ (برگ) ، آمان (آمان) ، إمان (ایمان) وغیرہ -

بعض الفاظ میں حسب ضرورت کچھہ اور تصرف بھی کیا ہے اور ' صوت ' کو ' املا ' پر ترجیح دی ہے ' جیسے " جہاں " کا قافیہ " رهنماں " (رهنما) :—

الٰہی بحرمت کی صاحب جہاں
سید نجم‌الدین ہے دو جگ رهنماں

اِسی طرح نازک کو نازوک یا نزک ضامن کو ضامین صحیح کو صحی نبات کو نابات اور ورد کو ویرد لکھا ہے - ' جناور ' (جانور) ، لغام (لگام) ، اکروٹ (اخروٹ) ، کچَا (کچّا) وغیرہ جیسے الفاظ بھی بکثرت ملتے ہیں -

کہیں کہیں فارسی الفاظ میں الف زاید کا استعمال کیا ہے ، جیسے " نیک " کو " نیکا " لکھ کر اُس کا قافیہ " دکھا " لایا ہے -

" اں " کے ساتھہ جمع کی ترکیب عام ہے ، مثلاً :—

لڑاں (لڑیں) ، دعایاں ، طبقاں ، تسبیحاں ، هاتاں ، پاواں ، دایاں ، بخفتاں ، نصیباں وغیرہ ۔

بعض مقامات پر جمع (مونث) کا اثر نہ صرف فاعل بلکہ اُس کے متعلقات اور توابعات پر بھی آمر نظر آتا ھے، مثلاً :—

ملیاں ناریاں ساریاں ستاریاں[1] مثال

اتھی "ماہ" اُن میں چندر جگ اوجال

کہ دایاں ددایاں سکانیاں جتیاں

لوتھیاں جاکہ ساریاں جتیاں تھیاں وتیاں

دو معطوف اسموں یا جمع کے لیے فعل واحد کا بھی استعمال کیا ھے، -

(۱) کہ مہ ھو پیکر سو ھے نیک نام -

(۲) ھتلیاں و انگلیاں کنول پھول ھے -

"کرنا" سے ماضی مطلق "کیا" بنتا ھے، لیکن مولف نے "کرا"[2] استعمال کیا ھے، جیسے :—

"کری" کپڑے تن پر سو او تار تار

ذیل کے مصرعے میں "کری" کے علاوہ "وضو ساز" کی ترکیب قابل غور ھے[3] :—

"وضو ساز" شکرانہ حق کا "کری"

---

۱ - یعنی "سب عورتیں تاروں کے جھرمٹ کی طرح (آپس میں) ملیں" - اِس مصرعے میں ھر "ی" مخلوط التلفظ ھے - (س) -

۲ - دکن کی زبان آج بھی یہی ھے - شمالی ھند میں بھی بعض جگہ (خصوصاً کری اور کرے) بولتے ھیں - (س) -

۳ - جیسے فارسی میں ، وضوساختن ، محاورہ ھے ، دکن میں بھی ، وضو بنایا ، جاتا ھے - (س) -

اسي طرح "خم" سے "خمها" (خما)[1] بمعني "خم" ہوا ' جیسے :

(۱) سروقد اتہا ' سو "خمها" جھوکتی -

(۲) "خمها" تھا سروقد ' سو بلنہ بہار ساتھ -

ہندی اور فارسي ' یا ہندی اور عربي اسموں کو ملا کر "مرکب" بنانے کي ترکیب اُس زمانے میں عام تھی ' اِس مثنوي میں بھي اِس کے متعدد نمونے ملتے ہیں ' مثلاً

سو "غم گھر" میں "مہ" کوں نہ دلدار تھا

یہاں "غم گھر" بجاے "غم خانہ" استعمال کیا گیا ہے -

"ہمراز" و "ہمدم" کے قیاس پر "ہمیار" بنا لیا ہے :

کہ نرمک نرم مک سو آواز کوں

کہ پڑتی تھي "ہمیار" ہمراز سوں

نو چاند (مہ نو) ' دھن پھول ' وغیرہ ' بھي عام ہیں -

بعض مقامات پر ہندي اور فارسي کو ملاکر "اسم فاعل ترکیبي" بنا لیا ہے ' جیسے :

اندیشا کہ اب کار سازي کروں

میرے جیو اوپر "تھک بازی" کروں

بہت سے الفاظ جو آج مونث ہیں اُن کو مذکر باندھا ہے ' جیسے یاد ' مناجات ' اُمید ' پناہ ' ندا ' خلق ' سزا وغیرہ :

(۱) تیرا یاد منجھکو ' سو دایم اچھو .

(۲) تیرے کن ' سو میرا مناجات ہے -

(۳) جو ملنے کو مہ کا اُمید آئیا -

---

۱ - خمنا ' گھٹنا ' سیرنا وغیرہ دکن میں بہت عام ہیں - (ص) -

(۴) جب احمد جلیدی کو اُن کا پہناہ -

(۵) ہوا ہے خلق سارا حیراں تمام -

(۶) برا کام اچھیکا تو ہوئیگا سزا -

مستقبل کے لیے ''سي'' کا بھي استعمال کیا ہے ' مثلاً :

کہ ماں باپ منجہ سر پو ورزور رهیں

نچل "سي" مرا کہے او سرزور هیں

(پو = پہ ' ور زور = زور میں بڑھ کر یعنی زبردست) هندي

الفاظ کے ساتھ '' اضافت '' کي ترکیب بھي مل جاتی ھ :—

کہاں پاؤں میں " پھکر لال " کوں

کہ قرباں کروں میں سو دھن مال کوں

هندي الفاظ اور فقروں کے ساتھ '' واو عطف '' :

(۱) نہ تھا ڈر و دھشت کا کچھہ بھي قرار -

(۲) کہ دونا و بالا و بانا اتھا -

(۳) رهي رات تھوڑی و قصہ دراز -

تشبیہیں زیادہ تر وهي هیں جو عام طور پر هماری شاعري

میں مستعمل هیں ' بعض جگہ ندرت سے بھي کام لیا ہے :—

کہ جس دل میں نی یاد دلدار کا

نہ ہے دل ' کلیسا ہے کفار کا

ابھي دیکھا مکھ سو منجہ لال کا

کہ ہے پھول منجہ روح کي ڈھال کا

چلیا اُس کے سایہ نمن ہو سنگات
نتھا دور نزدیک روح تن کی سات

الہی توں ظاہر ہے ہر شے بھتر
کہ جوں پھول میں باس ہمیکدگر

ولے راز دل کا دیدا تک گوا
کہ مک آنند '' مہ '' کے دل کا ہوا

ایک جگہ لکھا ہے کہ انار کے پھل ' پتوں میں یوں چھپے تھے جیسے جوبن چولی کے اندر چھپا ہو :

اناراں کے جھاڑاں کلیاں بار تھے
کہ لالی میں یاقوت کے سار تھے
کہ آئے تھے جھاڑاں کو آنار بار
رسیلے نکالے تھے جوبن کے سار
سو چولی نمن پات اُنکے اوپر
رکھے تھے چھپیا کر سو اُنکے بھتر

[جھاڑاں ' درخت - سار ' مانند]

'' ماہ '' کا سراپا بیان کرتے ہوئے "مانگ '' کو یوں سراہا ہے :

کہ یا مانگ ' مانند جوں کہکشاں
کہ یا وصل کی بات کی ہے نشاں
کہ یا بات دیئے کیوں موسیٰ کو واں
کہ فرعون کسی جنگ کرتے تہاں

[بات ' راہ]

" گال " کي تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ " چہرے کے باغ میں گال دو گل لالہ ہیں ' جن کا نگہبان خال (حبشي) ہے " :

کہ مُکھ باغ میں گال گل لالہ دو
کہ تل باغباں ہے واں رکھوال ہو

" ٹھڈی " کي تعریف یوں کی ہے :

ٹھڈي بھہ ' کہ پانیہ ' کي اوسیب ہے
کہ یا حسن کے باغ کا زیب ہے
کہ یا چاہ جم جم ' کہ آبِ حیات
کہ گرداب پلہ کا ہے اِس سیب ساتھ

" سینے " کی تعریف میں کہتا ہے :

سینا صاف انبرت تے ہے نار کا
کہ جاتا ہے مقبول پلہ کار کا
یا آنار کـي ڈال ہے نار او
دو جوبن کلیاں نار اُس تھار او
کہ نیہ باغ میں پھل دو اوتار ہے
کہ یا حسن کیاں نارنگیاں بار ہے

نار (لڑکی ' عورت) اور نار (انار) میں " تجنیس " قابل غور ہے -

مولف نے قرآن مجید کی آیات ' احادیث ' اور عربی ضرب‌الامثال کا استعمال بھی اکثر کیا ہے ' مثلاً " پیکر " جب گرفتار ہوتا اور کوتوال کے ہمراہ اپنے باپ (عبداللہ) کے پاس ضمانت کے لیے جاتا ہے تو کوتوال اور عبداللہ دونوں قرآن مجید سے سند پیش کرتے ہیں - اِس سے پتا چلتا ہے کہ مولف کو نہ صرف قرآن مجید

پر ایک حد تک عبور تھا ' بلکہ وہ عربی سے بھی نابلد نہیں تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ اِن اشعار کو "باوزن" پڑھنے کے لیے آیات قرآنی کے لفظوں میں بہت زیادہ تصرف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے - کوتوال اور عبداللہ کے " مکالمہ " کے چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں ' جن کے پڑھنے سے میرے اِس بیان کی تصدیق ہو جائے گی :

بولیا اُس کوں عبداللہ یوں کھول کر
' الرزاق ھواللہ '[1] اُٹھیا بول کر

ھمارا رزق حق کیا ہے پدید
کہ ' یوم جدید و رزق جدید '

کہ کوتوال سن کر دیتا یوں ندا
مسبب الاسباب ہے او سدا

... ...

کہ قرآن میں حق تے یوں آئیا
کہ ' واللہُ فضل '[2] یہاں پائیا

... ...

پوچھا اُس گھڑی اب جو فرزند کوں
کہ ' چھوڑوں گا میں تورے دلبند کوں

---

۱ - اِنّ اللہ ھو الرزاق ذوالقوۃ المتین (الذاریات ' آیہ ۵۸) -

۲ - واللہُ فضّلَ بعضکم علیٰ بعض فی الرزق (النحل ' آیہ ۷۱) - [" فضل " کے متحرک ل کو ساکن کر دیا ہے جو قابل اعتراض نہیں - (ص) -]

که خواجه اُٹھیا بول حق کا کلام
که 'المال والبنون'[1] حکم ہے مدام
که مال ہور اولاد حق کا عطا
دنیا میں یو میوہ اہے سب جتا[2]

.. ..

'یاایها الذین آمنوا'[3]، آیات ہے
یہی حکم حق کا سو دل سات ہے
کہیا ہے سو فرقان میں یو حکم
که 'اِنّ من ازواجکم و اولادکم'[3]،

---

۱ - المال والبنون زینة الحیوة الدنیا (الکهف ' آیت ۴۴) - [' والبنون ' وزن سے خارج ہے ' سوا اِس کے کہ ل اور آخری ن گرا دیا جائے اور ب ساکن کر دی جائے اور اِس طرح ' وبنو ' یا ' وبنوں ' پڑھا جائے - یہ دهرا تہرا تصرف ' اقتباس میں پسندیدہ نہیں - مگر یاد رہے کہ شاعر اُس زمانے کے لوگوں میں ہے جب اُردو کی صحت کا معیار عربی اور فارسی نہیں سمجھی جاتی تھی - اُس زمانے میں اکثر عربی کے ال کو تلفظ سے ساقط کر دیا کرتے تھے اور نون کو اب بھی غنہ کر دیتے ہیں - (س)]

۲ - جتا (= جتنا) کی مشدد ت کی تخفیف ضرورت شعری کی بنا پر ہے - (س)

۳ - یاایها الذین آمنوا اِن من ازواجکم و اولادکم عدواً لکم (التغابن ' آیت ۱۴) - [' یاایها الذین آمنوا ' میں ' یا ' کا الف گرائیے ' ' ایها ' کی ی کی تشدید کو دور کیجیے اور ' آمنو ' سے مد کو ہٹائیے تب کہیں مصرعہ بنتا ہے - آگے چل کے ' ازواجکم و اولادکم ' مصرعے میں کسی طرح نہیں سماتا - عجب نہیں کہ شاعر نے یوں کہا ہو: '' کہ اِن من ازواج و اولادکم '' یعنی ایک ' کم ' کو حذف کر کے عربی عطف کو فارسی عطف کے طور پر پڑھا ' مگر کاتب نے نجات اِسی میں دیکھی کہ کلام اللہ کی آیت کو جوں کا توں لکھے - (س) -]

خدا کا امر بھی ایسی دھات ہے
کہ 'یوم لا ینفع مال'[۴] سو آیات ہے

مثنوی کے بعض حصے خاص طور پر دلچسپ ہیں، مثلاً "ماہ" کے باغ کا منظر بہت دلکش ہے، اور اُس میں بہسوں پھلوں اور پھولوں کے نام آئے ہیں، اِسی طرح جب "ماہ" کی شادی ہوتی ہے تو بھاہ کی ریت رسموں کا ذکر مولف نے بڑی تفصیل سے کیا ہے اور اُس سے اُس زمانے کے رسم و رواج کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں - اِس کے علاوہ مولف کے زمانے میں جو باجے بجتے تھے، آتشبازیاں چھوٹتی تھیں یا زیورات پہنے جاتے تھے اُن کا بیان بھی دلچسپ ہے، لیکن مولف نے "بسط و اِطناب" سے بہت کام لیا ہے اور بعض

---

۴ - 'یوم لا ینفع مال ولا بنون' (الشعراء' آیت ۸۸) -

[یہ بھی حضرت کاتب کی کرامات ہے کہ مصرعہ اپنی حد سے بہت آگے نکل گیا - شاعر نے یوں کہا ہوگا: "کہ 'لا ینفع مال' سو آیات ہے" - اِس میں صرف ینفع کا ع گرتا ہے اور یہ پرانے شاعروں کے ہاں بہت عام ہے - اقتباس یا تضمین میں اصل میں خفیف تغیر جائز ہے، جیسے مولانا روم کے اِن شعروں میں:

عشق جان طور آمد عاشقا طور مست و 'خر موسی صعقا'
گفت آدم کہ 'ظلمنا نفسنا' او ز فعل حق نہ بد غافل چوما

الاعراف کی آیت ۱۳۹ میں ہے: 'خر موسیٰ صعقا' ہے، مگر مولانا کے شعر میں ص کے زبر کو اِتنا کھینچنا پڑتا ہے کہ الف ہو جاتا ہے - اُسی سورت کی آیت ۲۲ میں ہے: 'ظلمنا انفسنا' مگر شعر کی ضرورت سے قرآن کے لفظ کو بدل کر 'نفسنا' کرنا پڑا - (ص) -]

مقامات کو اِتنا پھیلا دیا ھے کہ پڑھنے والے کو اُلجھن ھونے لگتی ھے ' مثلاً ایک رات جب " پیکر" ' " ماہ" کے یہاں نہیں آتا تو وہ بے قرار ھوتی اور کہتی ھے :—

نجانوں کہاں ھے سو کس تھار پر
کہ بیکار ھے او کہ یا کار پر

مولف نے اِس موقع پر ۸۸ شعر " ماہ " کی زبان سے کہلوائے ھیں اور اکثر میں اِسي " نجانوں" کي تکرار ھے -

یا جب " ماہ " کو " پیکر" کي زبان سے اُس کي گرفتاري کا حال معلوم ھوتا اور یہ خبر ملتي ھے کہ کل " پیکر" کو پھانسي دی جائے گی تو وہ گریہ و زاری اور آہ و فریاد کرتي ھے ' اِس موقع پر مولف نے ۷۵ شعر مسلسل " ماہ " کي زبان سے کہلوائے ھیں - اِن دو مثالوں پر کیا موقوف ھے ' مثنوي کے اکثر حصوں میں بھي " بسط و اطناب " موجود ھے ' -

(۲)

" ماہ پیکر " چونکہ بہت کمیاب ھے اِس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اُس کے قصے کا خلاصہ ' بھي دے دوں - تاکہ اِس مثنوي کے " پلاٹ " کا اُس دور کي دوسري مثنویوں کے پلاٹ سے مقابلہ و موازنہ کیا جا سکے - میں نے اِس " خلاصہ " میں مثنوي کے مصرعے اور اشعار بھي نقل کر دیے ھیں جس سے مولف کے انداز بیان اور زبان پر روشني پڑ سکے گي - میں چاھتا تھا کہ ' خلاصہ ' جس قدر مختصر ھو بہتر ھے لیکن دو سو صفحے کی مثنوي کا خلاصہ اِس سے کم ھونا دشوار تھا ' میں نے ھر باب کے فارسي " سرنامہ " کو بھی (ایشیاٹک

سوسائٹي کے نسخے سے) نقل کر دیا ھے ' اِن سرناموں کی فارسي جیسي ھے اُس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ھیں ' میں نے اُن کو (بغیر کسي اصلاح یا تصرف کے) نقل کر دیا ھے - اوراق کا حوالہ ایشیاٹک سوسائٹي کے نسخے سے دیا گیا ھے اور اوراق کے حساب میں شروع کے چار گم شدہ ورق بھي شامل کر لیے گئے ھیں -

قصہ یوں شروع ھوتا ھے :—

[ورق ۵ الف - تولد شدن ماہ و عاشق شدن بر پیکر و جدائي ایشاں] اگلے زمانے میں غزني میں " حسن میمندی " نام ایک وزیر تھا ' کہ (ع) خدا نے دیا تھا اُسے ملک و مال ' لیکن (ع) نہ تھا کوئي دلبند نہ تھا کوئي آل ' اِس لیے

اِسی غم میں سب عمر کھوتا اتھا
انسجو نین تھے موک دھوتا اتھا

آخر بڑي آرزؤں کے بعد ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی (ع) ' رجب کي ستاویسویں رات میں ' پیدا ھوئی - اُس کا نام " ماہ " رکھا گیا ' اور جب وہ " چار سال چار مہینے چار دن " کي ھوئي تو مکتب میں بٹھائي گئی -

اُسی زمانے میں غزني میں ایک تاجر " عبداللہ " نام تھا - عبداللہ کے ھاں اللہ کا دیا سب کچھ تھا لیکن وہ دولت اولاد سے محروم تھا :

سو تعویذ طومار کرتا اچھے   و اولاد کي آس دھرتا اچھے

آخر اُس کے گھر لڑکا پیدا ہوا ۔ نجومیوں کو بلوایا ؛ انہوں نے :

نجوم کے ستاریکوں سب راست کر
رکھیا نانوں اُس کا ۔و " پیکر " ککر[1]

اور جب (ع) ' برس چار پر چار مہینے[2] ہوئے ' تو (ع)
سو بسم‌اللہ ہور ختمہ ملکر کہے ۔ " پیکر " اُستاد کے سپرد
ہوا ' لیکن اتفاق کی بات

کہ جس روز " پیکر " کا مکتب ہوا
اُسی روز " مہ " کا بھی مکتب ہوا

" حسن مہدی " کو جب اِس کی خبر ہوئی تو اُس نے
عبداللہ کو بلوایا اور کہا :

میرے جیو ' میں یوں ہے جو یو نیک ذات
پڑیں[3] ایک مکتب میں دونوں سنگات

عبداللہ راضی ہو گیا ' اور بالآخر :

لگے پڑھنے یک ٹھار دونوں جلے
سورج چاند ہو آملے سامنے

ماہ اور پیکر میں دوستی ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ دوستی
عشق کے درجے تک پہنچ گئی ۔ یہ بات آخر چھپتی کب تک ؟

---

۱ ۔ یعنی ' کر کے ' ۔ ' ککر ' مخفف ہے ' کر کر ' کا ۔ (ص) ۔

۲ ۔ دکنی میں ' مہینا ' مخلوط التلفظ ہ کے ساتھ بولا جاتا ہے ۔ (ص) ۔

۳ ۔ یعنی " پڑھیں " ۔ (ص) ۔

فوراً ماہ کے ماں باپ کو خبر دی گئی (ع) ' کہ مہ ہور پیکر
میں یو راز ہے ـ ماں 'و جب خبر ہوئی تو وہ بہت برہم
ہوئي ' فوراً ماہ کو بلوایا ' برا بھلا کہا ' اور حکم دیا کہ وہ
ایک محل میں نظر بند کر دی جائے - حکم کي تعمیل کي
گئي اور ماہ قید ہو گئي -

[ورق ۹ ب : غم نمودن ماہ در فراق پیکر] ماہ نے اِس
" غم خانہ " میں اپنے دن جس طرح گذارے اُس کا ذکر مولف
نے اِن الفاظ میں کیا ہے :

سو غم گھر میں " مہ " کوں نہ دلدار تھا
نماز ہور مصحف اُسے یار تھا
ویرد ہور روزہ سو کرتي اتھي
و مصحف صبح رین پڑتي اتھی

یہ سب کچھہ تھا لیکن " پیکر " کے خیال سے وہ ایک دم کے
لیے بھي غافل نہیں تھي ؛ اُس کي یاد میں روتي ' سر پیٹتي
اور آہ و بکا کرتی -

[ورق ۱۲ ' الف : آمدن پیکر در مکتب و نا دیدن ماہ و غم
نمودن او] اِدھر پیکر جب مکتب میں آیا اور ماہ کو نہ پایا
تو واویلا کرنے لگا ' فوراً مکتب کو چھوڑ شہر کی خاک چھاننے
لگا - لوگوں نے بتایا کہ ماہ کي ایک مالن " کلیلالہ " نام ہے '
وہ روز محل میں جاتي ہے ' شاید وہ تیری مدد کر سکے - پیکر
فوراً مالن کے گھر پہنچا اور بڑی مدت سماجت کے بعد " کلي لالہ "
کو راضی کیا - وہ جب پھولوں کي ڈالي " ماہ " کے پاس
لے جانے لگی تو اُس نے چولي میں دو شعر بھي گوندھ دیے ' اور :

لکھیا یوں کي تج بن نہیں دل قرار
کہ دیدار دیکھلا کہ دے چک ادھار
کہ نو چاند سا مک توں مجکوں دکھا
ہنر تجہ کنے آنے مجکوں سکا[1]

[ورق ۱۴ ب : پیغام بردن کلیلاله و جواب دادن ماه سفت و نا اُمید شدن او] کلیلاله پھولوں کی ڈالي لیکر ماہ کے گھر پہنچي اور ڈالي اُس کے سامنے رکھکر وہاں سے ہٹ گئي اور :

نظر جب پڑي اُس کي چولي اپر
لیکھیا تھا سو سمجھی او پیکر ککر

فوراً کلیلاله کو بلوایا ' اور اُس کو دھمکی دي - کلیلاله نے پورا قصہ کہہ سنایا ' ماہ بہت غصہ ہوئي اور کلیلاله کو ڈانٹا ؛ لیکن وہ بھي اپنے فن میں یکتا تھي ' اِن باتوں سے بھلا کب ڈرنے والي تھي ' ماہ کو باتوں میں لانا چاھا ' لیکن وہ نہ مانی ' آخر مالن سامنے سے ہٹ گئي - ماہ نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور تین شعر جواب میں گوندھ کر رکھ دیے ' جن کا مضمون یہ تھا کہ رات کے وقت کمند پھینک کر باغ میں آنا ' میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی - کلیلاله وہ ڈالي لے کر گھر آئي ' اور پیکر کو سارا قصہ سنا کر بولی کہ اب عشق سے ہاتھ دھو - پیکر کي نظر جب چولي پر پڑي تو اُن اشعار کو پڑھکر مطلب سمجھ گیا اور وہاں سے رخصت ہوا -

[ورق ۱۸ ب : شدن شب و بیرون آمدن ماه در باغ و صفت باغ] دن گذرا رات آئی ' ماہ کي بےقراري و بےتابي بڑھي ' متصل

---

۱ - یعنی تیرے کنے آنے کا ہنر مجھ کو سکھا - (ص) -

سے نکلی اور باغ میں آکر ٹہلنے لگی - وہ باغ کے ایک طرف تھی [ورق ۲۰ الف : ملاقات شدن ماہ را با پیکر درآں باغ و خواندن قرآن] دوسری طرف پیکر کمند لگا کر باغ میں داخل ہوا اور دیوانہ‌وار ماہ کو تلاش کرنے لگا ' بہت دوڑا لیکن ماہ کا نشان نہ پایا آخر بے سدھ ہو کر زمین پر گرا اور بے ہوش ہوگیا ' ماہ جو اُدھر پہنچی تو پیکر کو اِس حال میں پایا - اُس کا سر اپنے زانو پر لیا ' پیکر کو ہوش آیا ' آنکھیں چار ہوئیں ' دونوں اپنی کہانی سنانے لگے ؛ پھر محل میں آئے اور (ع) ' وضو ساز دونو ادا کر نماز ' خدا سے دعا کرنے لگے کہ (ع) ' نکو کر جدا ' رک ہمن یپک تھار ' پھر دونوں نے مل کر قرآن پڑھا اور :

کیے قول و وعدا سو اِس بات کوں
کہ پڑنا آ فرقان ہر رات کوں

اب پیکر کا یہ معمول ہوگیا کہ روز رات کو آتا اور ماہ کے ساتھ بیٹھ کر قرآن پڑھتا ' چنانچہ :

گئے ماہ و سالاں اِسی بات میں
کہ پڑتے تھے فرقان ہر رات میں

اتفاق سے " رات شبرات " کی آئی ' ماہ نے پیکر سے کہا :

عبادت کریں حق کی درگہہ میں آج
کہ روشن ہووے دل ہمارا سراج

[ورق ۲۱ ب : بیرون آمدن سلطان محمود غزنوی و گرفتن پیکر را بدزدی و ضامن دادن بملکزادہ و خلاص شدن] اتفاق ایسا ہوا کہ اُسی رات کو سلطان محمود قرآن پڑھ رہا تھا - جب " اطیعوا اللہ " کی آیت پر پہنچا تو اُس کے دل میں خیال گذرا کہ مجھے

خدا نے بادشاہ بنایا ہے؛ اگر انصاف نہ کروں تو خدا کو کیا منہہ دکھاؤنگا - یہ خیال آتے ہی سیاہ کپڑے پہنے اور کوتوال کے بھیس میں نکل کھڑا ہوا[1] اور گھومتے پھرتے اُسی مقام پر پہنچا جہاں "پیکر" کمند لگا کر "ماہ" کے محل میں جا رہا تھا، بادشاہ نے اُس کو چور سمجھکر پکڑ لیا، اب پیکر کے لیے عجیب مصیبت کا سامنا تھا، 'گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل' کا مضمون تھا، کوتوال کی خوشامد کی، روپئے کا لالچ دیا، لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا؛ مجبوراً اپنا نام اور نشان بتانا پڑا - کوتوال اُس کو عبداللہ کے گھر لے گیا اور کہا کہ اگر تو ضمانت کرے تو میں پیکر کو چھوڑ دوں، لیکن عبداللہ نے جب سنا کہ

---

۱ - یہاں سے لے کر مثنوی کے ختم تک قصہ وہی ہے جو "قصۂ سوداگر بچہ" کے نام سے بہت مشہور اور عوام میں آج بھی بہت مقبول ہے - پرانے زمانے کے ایک شاعر "شاہ رحمن" نے سوداگر بچے کا قصہ اردو میں نظم کیا تھا - چنانچہ اُس کی مثنوی کے خاتمے کا یہ مصرعہ چھپے ہوئے نسخوں میں بھی ہے:

"کیا شاہ رحمن نے قصہ تمام"

۱۲۳۲ ھجری کے لکھے ہوئے ایک قلمی نسخے کا چھاپے کے مختلف نسخوں سے مقابلہ کرنے سے پایا جاتا ہے کہ بعد کو کسی شخص نے اصل مثنوی کی پرانی زبان کو بدل کر اپنی دانست میں اصلاح کر دی - غالباً یہ شاہ رحمن وہی ہیں جن کے متعلق اشپرنگر نے اپنی فہرست (ص ۲۷۹) میں، خوب چند ذکا دھلوی کے تذکرے "معیارالشعرا" کے حوالے سے، صرف اِس قدر لکھا ہے کہ: "رحمن ایک پرانا شاعر ہے کیونکہ ولی کا ہم عصر تھا" -

"ھندستانی" کی اگلی اشاعت میں شاہ رحمن کی مثنوی پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے گی - (ص) -

میرا لڑکا چوری کے جرم میں ماخوذ ہے تو اُس نے ضمانت سے صاف انکار کر دیا - جب اِدھر سے مایوسی ہوئی تو پیکر اپنے دوست " ملکزادہ " کے گھر پہنچا ' ملکزادہ نے فوراً ضمانت قبول کر لی ' اور پیکر نے صبح دربار میں حاضر ہونے کا قول دیا - پیکر اور ملکزادہ دونوں مل بیٹھے - کوتوال کو خیال گذرا کہ یہ نوجوان چور نہیں معلوم ہوتا ' اصل واقعہ دریافت کرنا چاہیے - یہ خیال آتے ہی مکان کے ایک گوشے میں چھپ گیا ' اور پیکر کی باتیں سننے لگا - پیکر نے شروع سے آخر تک پورا قصہ " ملکزادہ " کو سنایا اور کہا کہ کل تو مرنا برحق ہے لیکن مرنے سے پہلے " ماہ " سے آخری ملاقات کر آؤں تو بہتر ہے - ملکزادہ نے اجازت دے دی ؛ پیکر وہاں سے روانہ ہوا - کوتوال بھی سائے کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا [ورق ۳۷ الف : بسبب درنگ شدن پیکر و غم نمودن ماہ] اِدھر " ماہ " ہمہ تن انتظار بنی بیٹھی تھی ' طرح طرح کے وسوسے اُس کے دل میں آتے تھے ' آنکھوں سے آنسو جاری تھے - آخر انتظار کی گھڑی ختم ہوئی [ورق ۴۰ ب : آمدن پیکر رخصت ملک زادہ گرفتہ و ملاقات ماہ و حقیقت گفتن پیکر با ماہ] پیکر پہنچا ' دونوں نے ملکر نماز پڑھی ' ماہ نے پیکر کو پریشان اور متفکر پایا ' سبب پوچھا تو پیکر نے سارا ماجرا بیان کیا [ورق ۴۹ الف : غم نمودن ماہ بوقت رخصت پیکر و ملع نمودن] دونوں دیر تک اپنی بدقسمتی پر روتے رہے ' ماہ نے کہا آخر ہم کو کس پر چھوڑے جاتے ہو پیکر نے دلاسا دیا اور کہا کہ مشیت ایزدی میں چارہ کیا ہے ؟ [ورق ۵۱ الف : دلاسا دادن و تسلی نمودن پیکر و وعدہ کردن ماہ کہ بوقت کشتن خود را رسانم]

پیکر جب رخصت ہوکر جانے لگا تو ماہ نے کہا کہ اب میں ننگ و نام کو سلام کر چکی ، کل ماتمی لباس پہنکر دربار میں حاضر ہوں گی اور (ع) ' دھروں گي میرا رخ تیرے رخ کے تھار ' - [ورق ۵۳ الف : رخصت گرفتہ رفتن پیکر و جدا شدن یک دیگر] آخر پیکر رخصت ہوا - [ورق ۵۷ ب : بعد رفتن پیکر بیہوش شدن ماہ و گرد آمدن سہیلیاں] ماہ دیوانہ وار باغ کي ہر روش پر " پیکر " " پیکر " پکارنے لگي اور بے سدھ ہو کر (ع) ' پڑي " مہ " زمین پر ، سو درخواب ہوں - سہیلیوں نے جب ماہ کو پلنگ پر نہ پایا تو اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگیں - دیکھا تو زمین پر بیہوش پڑي ہے ' فوراً محل میں لے گئیں ، نہلا دھلا کر پلنگ پر لا بٹھایا ' اور لگیں اُس سے حال پوچھنے : لیکن وہ (ع) ' نہ دیتي جواب کچھ اُنکو پھرا ' آخر ددا کو بھیجا - [ورق ۶۲ ب : پیش آمدن ددا با مکر و افشاے راز مہ با او] یہ عورت (ع) ' انھي او سو ہر فن میں ماہر تمام ' - اِس کا جادو ماہ پر چل گیا اور ماہ نے اپنا سارا راز اُس سے کہہ دیا - ددا نے سمجھانے کي بہت کوشش کي لیکن ماہ نہ ماني اور ددا ناکام واپس ہوئی -

[ورق ۶۹ الف : غم نمودن پیکر بعد جدائي ماہ و رفتن پیش ملک زادہ و احوال او بیان کردن بہ پیکر] ماہ سے رخصت ہو کر ، پیکر ملک زادہ کے گھر پہنچا ' ملک زادہ اُس کے انتظار میں بہت پریشان تھا کہ (ع) ' دو نینان کو نینان ہوے وین چھار ' ملک زادہ اُسے گھر کے اندر لے گیا ' پیکر نے ماہ سے ملاقات کا حال پورا بیان کر دیا اور ماہ کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو

رونے لگا - ملک زادہ نے بہت طرح سمجھایا ' اور دلاسا دیا '
صبح ہوئی تو دونوں نے دوگانہ ادا کیا -

[ورق ۷۴ ب : طلوع شدن صبح و طلب داشتن سلطان محمود و در ظاہر حکم کردن بکتوال براے دادن سولي] اِدھر یہ ہو رہا ہے ' اُدھر جب سلطان محمود پر پیکر کي پاکبازي کا حال کھلا تو اُس کي آنکھوں سے آنسو نکل آئے ; وہاں سے رخصت ہو کر گھر پہنچا - صبح ہوئي تو (ع) ' بیٹھیا شاہ عدالت کے آ تخت پر ' فوراً کوتوال کو ملک زادہ کے گھر بھیجا ' پیکر دربار میں حاضر کیا گیا اور شہر میں منادي کر دی گئي کہ پیکر کو چوری کے جرم میں سولي دی جائے گي - یہ سنتے ہی تماشائیوں کا سیلاب اُمنڈ آیا -

[ورق ۷۹ ب : شنیدن آوازۂ سلي ماہ و منت و زاری نمودن پیش ددا و لباس نمودن سیاہ و آمدن پیش پیکر] ماہ کو جب اِس کی خبر ملي تو وہ ددا کي ہزاروں خوشامدیں کرنے لگي ' آخر ددا کا بھي دل پسیجا اور اُس نے جانے کی اجازت دے دي - فوراً سیاہ کپڑے پہن ماہ قتل‌گاہ میں پہنچ گئي - بادشاہ کي نظر جب اُس پر پڑی تو حسن میمندي سے پوچھا کہ " تمہیں کچھ معلوم ہے کہ یہ سیاہ‌پوش کون ہے ؟ " میمندی نے جواب دیا : " جہاں پناہ ' مجھے نہیں معلوم " - یہ سن کر [ورق ۸۰ ب : بموجب حکم محمود بردن کوتوال بہ بندی‌خانہ پیکر را و غم کردن او] بادشاہ نے کوتوال کو حکم دیا کہ پیکر کو یہاں سے لے جاؤ اور اُسے ایک مکان میں آرام سے رکھو - کوتوال ' پیکر کو وہاں سے لے گیا اور مجمع بھي رفتہ رفتہ منتشر ہوگیا -

پیکر کے لیے وہاں آرام و آسایش کا سب سامان مہیا تھا ' لیکن ماہ بغیر اُس کے لیے دنیا اندھیر تھي - [ورق ۸۴ ب : رفتن مہ بخانہ و غم کردن و ددا را بزندان فرستادن براے خبر پیکر] اِدھر ماہ جب اپنے گھر پہنچي تو اُس کو کسي پہلو کل نہ تھي ' ددا آئي تو اپنے درد کي داستان سنائي ' اور اُسے پیکر کا حال دریافت کرنے بھیجا [ورق ۸۵ ب : لباس نمودن مردانہ ددا و رفتن بہ بندي‌خانہ و خوش‌خبر آوردن پیکر] ددا بھیس بدل کر پیکر کے پاس پہنچي اور ماہ کو آکر اطمینان دلایا -

[ورق ۸۹ ب : علی‌الصباح طلب داشتن سلطان محمود پیکر [را] و دعا کردن و رضامند کردن حسن میمندی] دوسرے دن سلطان محمود نے حکم دیا کہ پیکر ' بہترین خلعت پہنا کر ' دربار میں حاضر کیا جائے - فوراً حکم کی تعمیل کي گئی - پیکر جب دربار میں پہنچا تو سلطان خود استقبال کے لیے بڑھا ' اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور کہا (ع) ' کہ محمود بخشا گنہ تیج تمام ' پھر سلطان حسن میمندی سے مخاطب ہوا اور کہا کہ کل جس سیہ پوش کو میں نے دکھایا تھا وہ تیري بیٹی ماہ تھی - ماہ و پیکر دونوں عالم ہیں ' میں چاہتا ہوں کہ " میرے " لڑکے پیکر کي شادی تیري لڑکی ماہ سے ہو جائے - حسن میمندي نے کہا مجھے بسروچشم منظور ہے -

[ورق ۹۰ ب : خبر شنیدن ماہ از شادی و تعجب کردن کہ در بیداریست یہ در خواب] ماہ کو سنوارنے کی تیاریاں ہونے لگیں ' وہ حیران تھي کہ ابھي یہ ماجرا کیا ہے ' کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہي ہوں ' جب اُسے یقین دلایا گیا تو وہ پھولي نہ سمائي اور خدا کا شکر بجا لائي -

[ورق ۹۴ الف : شروع کردن شادي سلطان محمود] سلطان محمود نے پیکر کي شادي کا انتظام شروع کر دیا - بادشاہ کے گھر میں کس چیز کي کمي تھي ؛ بات کي بات میں سب سامان مہیا ھو گیا اور برات بڑے تزک و احتشام سے روانہ ھوئي -

[ورق ۹۵ ب : پیکر سوار شدن بہ شہرگشت و رسیدن بخانۂ مہ و عقد بستن قاضي] شہر میں گشت کے بعد برات حسن مہندي کے گھر پہنچي ' قاضي صاحب نے نکاح پڑھایا اور مبارک سلامت ھونے لگي - [ورق ۱۰۰ الف : بیان آراستن ماہ و جلوہ کردن و بردن] رسم رسومات کے بعد پیکر ماہ کو لیکر اپنے گھر واپس ھوا ; بچھڑے ھوئے ملے اور دن عید رات شب برات منانے لگے -

[ورق ۱۰۲ ب : مناجات احمد جنیدي و خاتم کتاب]

موهنجوداڑو

پانچ ہزار برس کا قدیم ہندوستانی مذہب و تمدن

(از اصغر حسین اصغر ایڈیٹر " ہندستانی ")

سر جان مارشل نے موہنجوداڑو کے سلسلۂ ذکر میں جو تفصیلی معلومات پیش کی ہیں اُن کا تمام و کمال احاطہ دو تین مضامین میں نہیں کیا جا سکتا ' چھوٹی چھوٹی منتشر اور حقیر چیزوں پر نگاہ تعمق ڈال کر تمدن و معاشرت کا ایک مرتب نقشہ پیش کر دینا ' تحقیق و استنباط کا ایک غیر معمولی اعجاز ہے جو اِس کتاب میں شروع سے آخر تک نظر آتا ہے — اُس زمانے کی آب و ہوا ' تعمیرات اور تعمیرات سے طرز ماند و بود ' کھانے پینے کی چیزوں ' آرائش و زیبائش کے زیورات ' زیورات کے سلسلہ میں قیمتی پتھر اور معدنیات اور پھر اِن سب سے دیگر ممالک کے تعلقات کا جس خوبی و عمدگی سے سراغ لگایا گیا ہے اسکی جسقدر بھی ستائش کیجائے کم ہے - ان تمام باتوں کا حقیقی لطف تو اصل کتاب ہی سے اُٹھایا جا سکتا ہے ' تاہم ان سطور میں یہ کوشش کیجائیگی کہ اس کے کچھ جستہ جستہ بیانات پیش کر دئے جائیں تاکہ موہنجوداڑو کے آثار اور ان آثار سے اُس زمانے کے عام ذہنی و مادی رجحانات کا ایک مختصر سا خاکہ ناظرین کے سامنے آ جائے :—مثلاً ملبوسات کے سلسلے میں سر جان مارشل کا بیان ہے کہ :—

کاتنا اور کپڑا بننا

موہنجوداڑو میں کاتنے کا عام رواج تھا ' جس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ مکانوں سے تکلیوں کی گدیاں دستیاب ہوئی ہیں یہ تکلیاں قیمتی اشیاء سے لیکر مٹی اور گھونگے تک کی ہیں ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر امیر و غریب گھرانے میں کاتنے کا عام رواج تھا ' گرم کپڑوں کے لئے اون ' اور ہلکے کپڑوں کے لیے سوت کام میں لایا جاتا تھا - سوت کے بہت باریک باریک ٹکڑے ایک چاندی کے برتن میں چپکے ہوئے پائے گئے ہیں - سوت کے ان ریشوں کا امتحان جب مسٹر اے ' ان گلاتی ' ایم ' اس ' سی اور مسٹر اے ' جے ٹرنر ایم ' اے ' بی ' اس ' سی نے انڈین کاٹن کمیٹی کے دارالتجربہ میں کیا تو معلوم ہوا کہ یہ موجودہ زمانے کے سخت ہندوستانی سوت سے مشابہ ہے - یہ امریکہ کے موجودہ سوت یا دوسرے باریک و ملائم سوت کی طرح کا نہیں ہے - اس کا ایک بٹا ہوا نمونہ جو دستیاب ہوا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کا یہ سوت سندھ کے موجودہ کسی سوت سے مشابہ نہیں ہے - یہ تحقیقات جو موہنجوداڑو میں ہوئی ہے اس نے قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ باریک ہندوستانی سوت جسے اہل بابل سندھو اور یونانی سندوں کہتے تھے وہ اصلی کپاس کا نہ تھا بلکہ کسی درخت کے ریشے کا تھا ' یہیں پر اس امر کا بھی اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سوت پر جو رنگ نظر آتا ہے وہ مسٹر گلاتی اور ٹرنر کے نزدیک مجیٹھ کا ہے -

پوشاک

موہنجوداڑو ایسے ہمہ گیر شہر میں جہاں تقریباً چار مختلف نسلوں کے لوگ آباد رہے ہوں لباس بھی ان کے مختلف حلیوں کے اعتبار سے مختلف رہا ہوگا لیکن
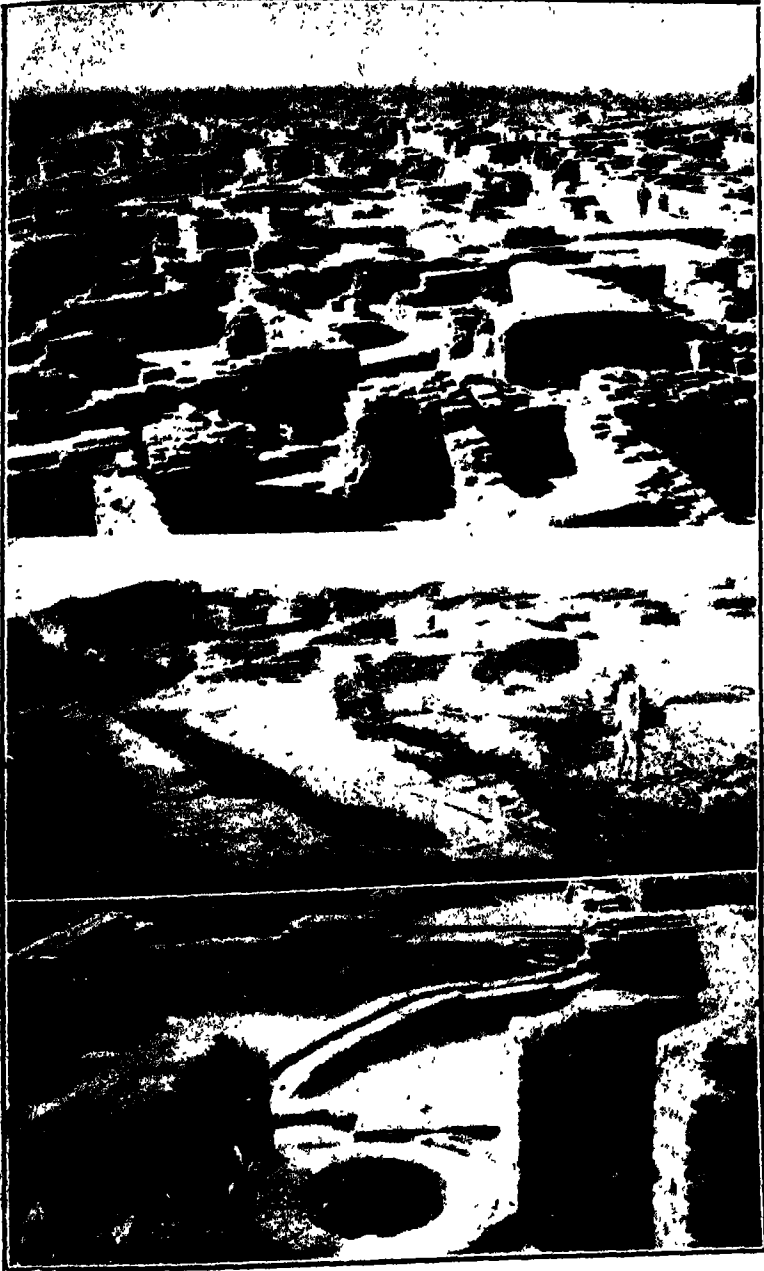
موہنجو دارو میں کھدائی کا عام منظر۔
(گورنمنٹ کے محکمۂ آثار قدیمہ کی اجازت سے)

بدقسمتی سے ابھی اسکے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں ۔(دو مُجسمے جو دستیاب ہوئے ہیں اُن میں سے ایک مرد کا مجسمہ ہے ، یہ مجسمہ گویا ایک شال لپیٹے ہوئے ہے) شال کا ایک سرا داھنی بغل سے گذرتا ہوا بائیں شانے پر اسطرح پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ داھنا بازو بالکل آزاد ہے ، شال کا دوسرا حصہ جسم کے بقیہ زیریں حصے کو چھپائے ہوئے پاؤں تک لٹک رہا ہے لیکن شال کے نیچے کوئی اور لباس بھی ہوتا تھا یا نہیں اس کا کوئی ثبوت ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے ۔(اس کے علاوہ مٹی کی کچھ اور مورتیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جو مردوں کی ہیں یہ بہ استثنائے زیورات اور سر کے لباس کے قطعاً برھنہ ہیں ، لیکن اُس سے یہ نتیجہ نکالنا محفوظ نہ ہو گا کہ غریب مرد یا کسی طبقے کے مرد اُس وقت برھنہ رھتے تھے ، اسلئے بعید نہیں کہ یہ مورتیں دیوتاؤں کی ہوں اور کسی قدیم زمانے کے رسم و رواج کی نمایندگی کرتی ہوں)۔ اِسی طرح دیویوں کی بھی مورتیں ہیں جن میں سے بہ استثنائے چند ، سب کی سب کچھ نیم برھنہ سی ہیں ، اُن پر کوئی باقاعدہ لباس نہیں ہے بلکہ تہبند کی طرح کوئی چیز ، باند ہوئے نظر آتی ہیں یہ تہبند عموماً سوتی ہیں لیکن بعض بعض اونی بھی معلوم ہوتے ہیں ، کانسے کا ایک برھنہ مجسمہ جو برآمد ہوا ہے غالباً کسی رقّاصہ کا ہے لیکن اس مجسمہ کی حیثیت دوسری ہے ۔ اس سے ہم صرف یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ غالباً دوران رقص میں ناچنے والی سوا زیورات کے اور کچھ نہیں پہنتے تھے ، لیکن یہ خیال کرنا کہ وہ بالعموم برھنہ رھتے تھے یقیناً زیادتی ہوگی ۔ مرد داڑھیاں بھی رکھ

تھے اور گلُچھے بھي ' کبھي کبھی لبوں کا بالاي حصہ ملدا ہوا
ہوتا تھا -

بال اور سر کا لباس

بال یا تو آگے کي جانب سے چڑھا کر پیچھے
ڈال لئے جاتے تھے ' یا پیچھے کسي قدر چھوٹے
کرا لئے جاتے تھے ' جوڑے یا چوٹي کا بھی رواج
تھا ' اور اِسکو موباف سے پیچھے باندہ لیا جاتا تھا - موباف
کے یہ نمونے جو موہنجوداڑو میں دستیاب ہوئے ہیں اُن سے معلوم
ہوتا ہے کہ سونے کو پیٹ پیٹ کر پتلا سا فیتہ بنا لیتے تھے '
اُس میں جا بجا سوراخ بھي ہوتا تھا ' اسي سے موباف کا کام
لیا جاتا تھا - لیکن موباف عموماً لچکدار سوتي فیتے کا ہوا
کرتا تھا - مرد کا جو برھنہ مجسمہ برآمد ہوا ہے اسکے سر کے
لباس کی صورت توپي کي سي ہے جو کسي قدر پشت کي
جانب خم ہے - دوسرے مجسمے میں یہ توپي کسی قدر زیادہ
لمبّی ہے اور اُس میں مُڑی ہوئي گوٹ سی لگي ہوئي ہے -

ایک سر (جو کسي عورت کے مجسمے کا ہے) کے دیکھنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ بال کھلے ہوئے پیچھے پڑے ہیں - کانسے
کا مجسمہ جو کسي رقّاصہ کا ہے اسکے سر کے بال ایک بڑے جوڑے
کی شکل میں بندھے ہوئے ہیں یہ جوڑا بائیں طرف کے کان
سے شروع ہوتا ہے اور داھنے طرف کے شانے پر مڑا ہوا ہے -
مٹي کی مورتوں میں سر کے بال توپی سے چھپے ہوئے معلوم ہوتے
ہیں اور بعض بعض مورتوں کے سروں پر کوئي چیز دستار کي سي معلوم
ہوتي ہے لیکن دیویوں کے سروں پر کوئي چیز یا تو ہلال کے شکل کي
ہے یا کوئي چیز نوکیلي سي ہے جسکے ساتھ پیالے کے مانند کوئي چیز سر
کے دونوں جانب دکھائي دیتي ہے جس کے حاشیئے پر فیتہ لگا ہوا ہے -

زیورات کے نمونے جو موہنجو داڑو میں دستیاب ہوئے -
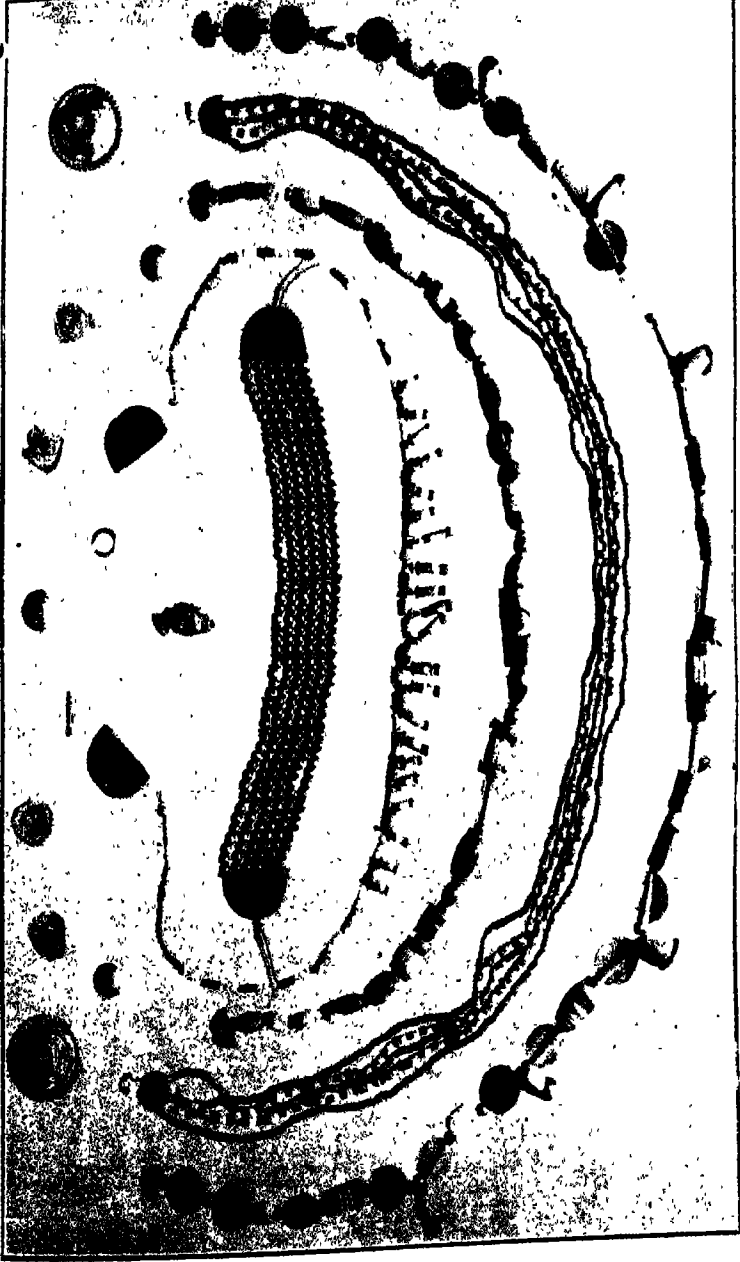
(گورنمنٹ کے محکمۂ آثار قدیمہ کی اجازت سے)

زیورات کا استعمال ہر طبقے میں رائج تھا -

زیورات

گلے کا ہار ' سربند ' بازوبند اور انگوٹھیاں مرد و عورت دونوں استعمال کرتے تھے ' کردھنی ' بُندے ' اور پازیب صرف عورتیں پہنتی تھیں ' مسٹر میکے نے ان زیورات کا مفصل ذکر کیا ہے - مثلاً کردھنی ' ہار - چوڑیاں ' بازوبند ' موباف ' انگوٹھیاں ' بالیاں ' اور شاید بلاق یا نتھ - بُندے - پن اور بٹن وغیرہ وغیرہ - اُمرا کے یہاں یہ چیزیں سونے ' چاندی چینی ' ہاتھی دانت اور قیمتی پتھروں کی ہوتی تھیں ' غرباء میں گھونگھے ' تانبے ' مٹی اور ہڈیوں کی رائج تھیں (- کردھنی کمر کے گرد پہنی جاتی تھی ' اسکے بہترین نمونے مسٹر دکشت کو ایک مکان میں دستیاب ہوئے ہیں - یہ لمبے لمبے ہار کی طرح کی ہیں جن میں قیمتی پتھر مثل عقیق وغیرہ کے لگے ہوئے ہیں - اِن پتھروں کے بیدھنے میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے - اس میں جا بجا سونا بھی استعمال کیا گیا ہے جس کے آثار جابجا اب تک پائے جاتے ہیں)- سستی اور معمولی کردھنیاں بھی پائی گئی ہیں جن میں بجائے عقیق وغیرہ کے خوبصورت پکائی ہوئی مٹی کے دانے پروے ہوئے ہیں ' لیکن اُنکی وضع بالکل اُنہیں قیمتی کردھنیوں کی سی ہے -(ان لمبے لمبے ہاروں کے علاوہ جو عموماً کردھنی کے کام میں استعمال کئے جاتے تھے چھوٹے ہار بھی پائے گئے ہیں جو غالباً چندن ہار کی طرح گلے میں پہنے جاتے تھے) - اس طرح کے گلے میں پہننے کے ہار اہل سندھ میں بہت زیادہ مرغوب تھے - اور شاید اسی طرح بازوبند اور کردھنی بھی - اس طرح کے ہار مختلف وضع و قطع کے ہوتے تھے ' بعض گول ' بعض پہلدار بعض صراحی دار وغیرہ وغیرہ '

بعض دھات کے مثلاً سونا ' چاندي ' تانبے وغیرہ کے ' بعض کھونگھے ' ھڈی اور متي وغیرہ کے ھوتے تھے - لیکن اُسکا بڑا حصہ چمکدار پتھروں کا تھا ' جن کا ذکر ابھي کیا جا چکا ہے ، انگوٹھیاں عموماً سادي ھوتي تھیں -

یہ زیورات کچھ تو یونھیں متفرق طور پر دستیاب ھوئے ' کچھ مجسموں میں دکھائے گئے ھیں جن کا ذکر بہت تفصیل و وضاحت سے کیا گیا ہے ' لیکن اس سلسلے میں یہ بہت ھي عجیب بات کہي گئی ہے کہ باوجود آرائش و زیبائش کے اس تمام سامان کے نہ شیشہ کہیں دستیاب ھوا اور نہ شیشے کي کوئي چیز دیکھنے میں آئي ہے حالانکہ عراق اور مصر میں اُس زمانے میں شیشہ ایجاد ھو چکا تھا ' اور سر آرل استین نے بلوچستان اور سیستان وغیرہ میں شیشہ کي مختلف چیزیں برآمد کي ھیں -

اسلحہ

زیورات کے بعد سر جان مارشل نے اُن اسلحہ کا ذکر کیا ہے جو موھنجودارو میں برآمد ھوئے ھیں - وہ لکھتے ھیں کہ " اسلحہ جو لڑائی اور شکار میں کام آتے تھے وہ مندرجۂ ذیل اقسام پر مشتمل تھے :— کلھاڑے ' برچھے ' کٹار ' تیر و کمان ' گرز ' اور فلاخن ' - غالباً اِن چیزوں میں غلیل نہ تھي ' اِن تمام اسلحہ کي مسٹر میکے نے بہت تفصیل سے وضاحت کي ہے - یہ تمام اسلحہ جارحانہ عمل کے لئے ھیں لیکن مدافعت کے لئے کوئی چیز مثل ڈھال ' اور زرہ وغیرہ کے دستیاب نہیں ھوئي - جارحانہ عمل کے اسلحہ میں تلوار بھي دستیاب نہیں ھوئي جو بہت ھي حیرت انگیز بات ہے "-

مسٹر میکے کا بیان ہے کہ مصر وغیرہ میں برچھے کي نوک
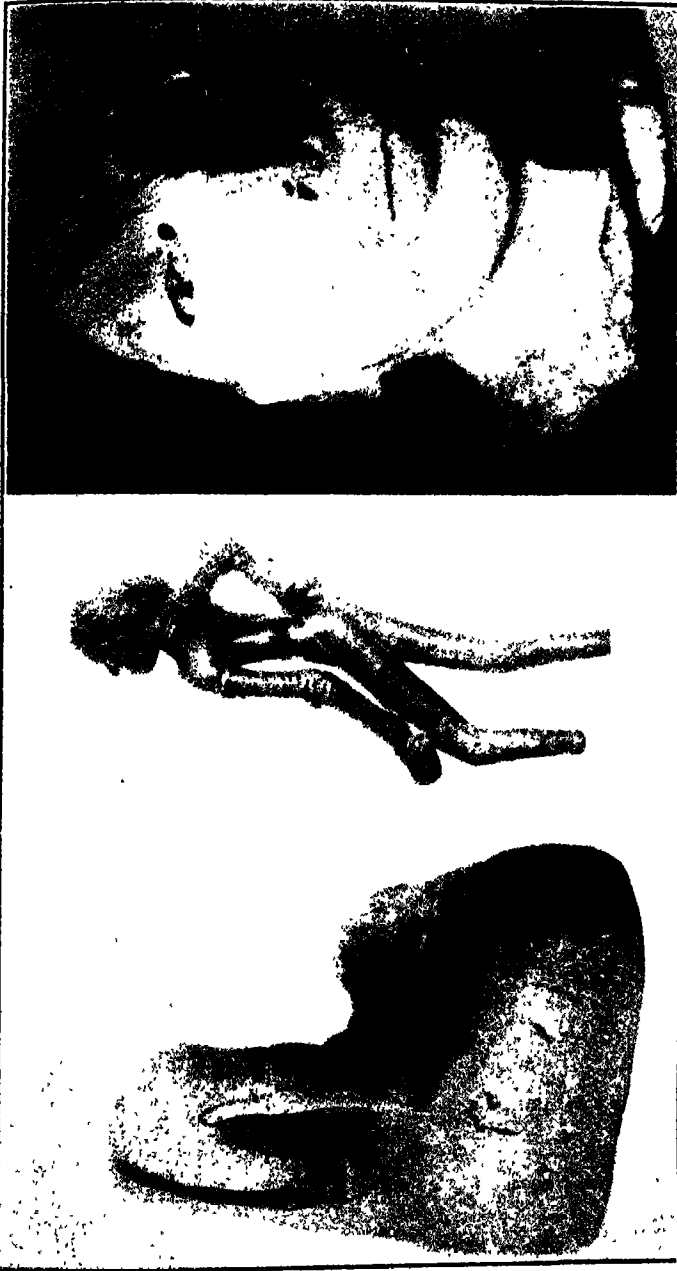
موھنجو داڑو میں بت تراشي کے نمونے -
(گورنمنٹ کے محکمۂ آثار قدیمہ کي اجازت سے)

۲۰۰۰ ق م میں بہت ترقی یافتہ شکل میں ظاہر ہو گئی تھی - مذکورہ اسلحہ جو موہنجوداڑو میں دستیاب ہوئے ہیں بہت ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ برچھے ہی کے اقسام ہوں جن سے کٹار اور چاقو کا کام لیا جاتا ہو - ایسے تیر جلکے پیکان نوکیلے پتھر کے ہوں موہنجوداڑو میں نہیں پائے گئے ' تانبے کے پیکاں کے تیر ' کہیں خال خال مل جاتے ہیں ' اگرچہ اسکے بعد مسٹر میکے نے اطلاع دی کہ تانبے کے پیکاں کے تیر متعدد دستیاب ہوئے ہیں - بہر صورت اس سے یہہ اندازہ ہوتا ہے کہ تیر و کمان کا شمار اُنکے محبوب اسلحہ میں نہ تھا - گُرز ' پتھر اور تانبے دونوں چیزوں کے پائے گئے ہیں - اور اُن کی شکل و وضع بھی تین قسموں کی ہے - اُن میں سے ناشپاتی کی شکل کا گُرز بہت عام تھا ' جیسا کہ معمولاً اُس زمانے میں دنیا کے تمام متمدن حصوں میں رواج تھا ' فلاخن بہت زیادہ رائج تھے وہ بھی دو قسم کے تھے ' ایک تو گول دوسرے بیضوی - غلیل اس زمانے میں ایجاد ہو چکی تھی یا نہیں ' ابھی یہ امر مشتبہ ہے - وزنی گولیاں البتہ پائی گئی ہیں جلکے بارے میں یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ غلیل میں استعمال کی جاتی ہونگی لیکن بغیر کسی مزید ثبوت کے اسکا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا ''۔ ————

مذہب

اسلحہ ' کے بعد گھر کے کاروباری آلات و اوزار ' مٹی کے معمولی برتن ' اُن کے مختلف اقسام ' سیاہ اور رنگے ہوئے برتن ' خانہ‌داری کی چیزیں ' اور کھلونوں وغیرہ کا ذکر ہے - اِس کے بعد

اُن تحریروں کا تذکرہ ہے جنکے بارے میں ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا - مذہب کے لئے سرجان مارشل نے ایک مستقل باب کھولا ہے - اُس کا تمہیدی بیان یہہ ہے :—

مذہبی قسم کے باقیات و آثار ہڑپا اور موہنجوداڑو

مذہب

دونوں مقامات پر بہت کم ہیں ' چند کھنڈر جو پائے گئے ہیں وہ ممکن ہے شوالہ کی حیثیت رکھتے رہے ہوں یا اور کسی قسم کے مذہبی عبادت خانے ہوں مگر ان میں اس وقت کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے ' جس سے اُن کی غرض صحیح صحیح طور پر متعین کی جا سکے - اور نہ ایسی کوئی یادگار موجود ہے جس کے آثار سے بہ وثوق اس کے مذہبی یا مقدس ہونے پر اصرار کیا جا سکے - البتہ اُس وقت کے لوگوں کے مذہب کے بارے میں اگر کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو اس کے لئے وہ مُہریں ہیں جو اس خرابے میں بیشمار موجود ہیں یا تانبے کے پتّر یا مٹی ' دھات اور پتھر کے مجسمے ہیں جو ادھر ادھر پڑے ہوئے ہیں -

یہ سامان کتنا ہی کم اور کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو لیکن هندوستان کے مذہب کے بارے میں اُن شائقین علم کے لیے بیحد قیمتی ہے جو آریاؤں سے قبل هندستانی مذہب و معتقدات کے بارے میں کچھ ثبوت و شہادت بہم پہونچانا چاہتے ہیں - یہ صحیح ہے کہ اِن معتقدات کا بڑا حصہ ویدک لٹریچر اور وید کے زمانۂ مابعد کے لٹریچر میں موجود ہے - لیکن معلومات کا یہ بڑا ذخیرہ آرین زمانہ اور غیر آرین زمانے کے معتقدات میں صحیح صحیح طور پر امتیاز کرنے میں معین ہوگا - اس وقت تک اہل علم کی جو کوششیں آرین اور غیر آرین معتقدات

کے تعین میں صرف ہوئی ہیں وہ بہت کچھ اختلافی ہیں ۔
مانیر ولیمس اور ہاپکنس نے عام مسلمات کو پیش نظر رکھ کر
(یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندو مذہب میں دروڑی یا آریوں
سے قبل کی دوسری نسلوں کے معتقدات اگر کچھ شامل ہوئے ہیں
تو وہ بہت ہی کم ہیں بلکہ اتنے کم ہیں کہ اُن کو کوئی
اہمیت نہیں دی جا سکتی اور جو ہیں بھی وہ ہندوؤں کے
بہت ہی وحشی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں) - لیکن برخلاف
اس کے اوپرٹ نے غیر آریوں کے مذہب کو اس سے بالاتر درجہ
دیا ہے ' وہ لکھتا ہے کہ وہ (غیر آریہ) آسمان کے ایک
قادر مطلق ہستی پر عقیدہ رکھتے تھے اُسی طرح تقریباً اِسی
طاقت کی ایک زمین کی دیوی کو بھی مانتے تھے ' یہ دو کے
دونوں اُن اچھی اور بری روحوں پر ' جو انسانوں کو ستاتی ہیں '
اور تمام آدمیوں اور دنیا پر حکومت کرتے ہیں - اسی کے ساتھ
مرنے کے بعد تناسخ کا بھی عقیدہ تھا) - اِن دونوں نظریوں میں
کون سا نظریہ قرین صداقت ہے ' اِس کا فیصلہ اُن یادگاروں سے
ہو سکتا ہے جو آریوں کے زمانے سے قبل کے برآمد ہوئے ہیں - اور
اِسی وجہ سے ہڑپا اور موہنجوداڑو کا یہ نیا مسالا اتنی اہمیت رکھتا
ہے - اس کی اہمیت اُس وقت یقیناً اور بڑھ جائے گی جب کہ
اُن چیزوں پر لکھے ہوئے کُتبے پوری طور پر پڑھ لئے جائیں گے " -
اس تمہید کے بعد موہنجوداڑو کے بتوں وغیرہ کا ذکر کیا
گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ (موجودہ ہندو
مذہب کے اکثر معتقدات اُنھیں قدیم معتقدات کا پرتو ہیں) -
اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز مہا مائی کی مورت ہے -
اُس کے بارے میں لکھتے ہیں :---

مہا مائی

" یہاں کی تمام چیزوں میں سے جس چیز
پر سب سے پہلے توجہ مائل ہوتی ہے وہ مٹی مہا مائی کی شکل
وغیرہ کی مورتیاں ہیں ۔(یہ مورتیاں موہنجوداڑو
اور ہڑپا دونوں مقامات پر پائی گئی ہیں اور اس کے ہمسایہ
ملک بلوچستان میں بھی اس کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں)۔ ان
میں سے کچھ مورتیں تو ایسی ہیں کہ گویا کوئی عورت آٹا
گوندھ رہی ہے یا روٹیوں کی ٹوکری بغل میں لئے ہوئے ہے ۔
مورتیوں کی یہ قسم غالباً کھلونے کی کوئی قسم ہے جس میں
کوئی مذہبی مفہوم پنہاں نہیں ہے ۔ (دوسری مورتیاں ایسی
ہیں کہ جیسے کوئی عورت گود میں بچہ لئے ہوئے ہے یا حمل
کی حالت میں ہے ۔ ممکن ہے کہ اس طرح کی مورتیاں زمانۂ
حمل میں نذر و نیاز کی غرض سے طیار کی جاتی ہوں ۔
اس لئے کہ یہ امر اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان کے بعض
حصوں میں، حاملہ عورت، نوزائیدہ بچہ اور ماں کے بارے میں
ایک خاص مذہبی احتیاط ملحوظ رکھی جاتی ہے ۔ اور حاملہ
عورتوں اور بچوں کے لیے یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ناپاک اور خراب
روحیں اُن پر حملہ نہ کریں ۔ بہر صورت مٹی کی ان مورتوں
کا کثیر حصہ ایک نمایاں لیکن یکساں وضع و قطع کا ہے ۔
یعنی ہر عورت تقریباً برہنہ کھڑی ہوئی ہے اور ایک پٹکا سا
اپنے گرد باندھے ہوئے ہے ایک سربند، گلے میں کچھ حلقہ سا
پڑا ہوا اور ایک لمبا ہار، یہ ہے ان کا کل سامان آرائش)۔
اکثر مورتیوں کے کانوں کا زیور گھونگھے کی طرح پیالہ نما سا

ہے ' جو معلوم ہوتا ہے کہ کسی فیتے سے سر کے دونوں جانب اٹکا ہوا ہے ' اس کے اوپر سر بند کم و بیش کچھہ ہلال کی شکل کا ہے '' ۔

یہ ہے سرجان مارشل کا بیان مہا مائی کی اُن مورتیوں کے بارے میں جو موہنجودارو میں پائی گئی ہیں - اس کے بعد بلوچستان اور مغربی ایشیا وغیرہ میں مہا مائی کی جو مورتیں کچھہ خفیف تغیر و تبدل کے ساتھہ دستیاب ہوئی ہیں ' اُن کا ذکر کیا گیا ہے ' اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :—

'' ہندوستان سے زیادہ کسی ملک میں '' مہا مائی '' کی پرستش کا خیال قدیم ترین زمانے سے اتنا مستحکم طور پر قائم نہیں ہے ' کوئی موضع اور کوئی قریہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کا استھان نہ ہو - ہر گاؤں میں کچھہ مخصوص دیویاں ہوتی ہیں جن کی پوجا ہر امیر و غریب باشندہ کرتا ہے ' لیکن ماتا یا مہا مائی '' پریکرتی '' کی مرادف سمجھی جاتی ہے اور جس کی مزید ترقی یافتہ صورت '' شکتی '' کہلاتی ہے ' اسی کے نمائندے '' گراما دیوتا '' کہلاتے ہیں ' گاؤں کی متفرق دیویاں بھی جن کے نام اور جن کے کام مقامی اعتبار سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں دراصل اسی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہیں - بہر صورت اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں کہ غیر آریہ آبادی میں قومی دیویوں کے ضمن میں اس کی حیثیت بہت نمایاں رہی ہے - قدیم فرقوں میں اس کی عام مقبولیت اور پرستش کے علاوہ یہ امر بھی خصوصیت کے ساتھہ قابل توجہ ہے کہ اس کی پوجا کے تقریبوں اور تیوہاروں میں سربرا ہی ' برہمنوں کو نہیں

بلکہ نیچی ذات کے لوگوں کو سپرد کی جاتی ہے ' ان میں سے بھی کسی قدیم ترین فرقے کے آدمی کو تلاش کیا جاتا ہے جس کی بابت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دیوی کو خوش کرنے کی تدبیروں سے واقف ہے - کچھ ایسے فرقے جو آریوں کی آمد سے بہت قبل کے ہیں اور جو دراصل ہندو مذہب میں بھی داخل نہیں ہیں ' ان میں اس مہا مائی کی پوجا خصوصیت کے ساتھ بڑے دھوم سے ہوتی ہے قدیم آریوں کے بارے میں خواہ وہ ہندوستان کے ہوں یا کہیں اور کے ' یہ مثال کہیں نہیں ملتی کہ انہوں نے کسی دیوی کو الوہیت کا اتنا بڑا درجہ دے دیا ہو جو مہا مائی کو دیا جاتا ہے - ویدک علم‌الاصنام میں دیویوں کی حیثیت ایک ماتحت کی سی ہے ' یہ صرف دیوتا ہیں جن کی بزرگی اور عظمت کے باعث دیویوں کا اثر تسلیم کیا گیا ہے - ویدک آریوں کی زمین کی دیوی (پرتھوی) قدیم لوگوں کی مہا مائی سے بالکل مختلف تھی - اس میں شک نہیں کہ وہ رگ وید میں بھی دیوی ہی تسلیم کی گئی ہے ' کبھی تنہا کبھی آسمان (آکاش) کے ساتھ - اور اُس سے برکت کی دعا بھی مانگی گئی ہے ' لیکن اُس کی پرستش قدیم دیوی (مہا مائی) کی طرح اُس وقت سے کی جانے لگی جب سے آریہ اور آریہ سے قبل کے لوگوں میں باہم خلط ملط ہوا - ہڑپا میں بھی جو مُہریں دستیاب ہوئی ہیں اُن سے بھی '' مہا مائی '' کی پرستش کا کافی ثبوت ملتا ہے - مُہر کی دوسری جانب ایک مرد اور ایک عورت کی تصویر ہے ' مرد کے داہنے ہاتھ میں ہلسیے کی طرح کا ایک چاقو ہے اور عورت بیٹھی ہوئی دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے گویا

پہلا مانگ رہی ہے اور مرد گویا اس کو مار ڈالنے کا قصد کر رہا ہے - اس منظر سے یہ معقول طور پر نتیجہ نکلا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کی قربانی کی طرف اشارہ ہے" -

مہا مائی کے ذکر کے بعد ایک دیوتا کا ذکر ہے جو هندو مذهب کے شیو یا مہیش سے بالکل مشابہ ہے ، سر جان مارشل کی تحقیقات یہ ہے کہ شیو کا خیال بھی آریوں میں اِس غیر آریہ تخیل سے ماخوذ ہے جس کا ثبوت آگے چل کر نہایت شرح و بسط سے دیا گیا ہے بہر صورت اس دیوتا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :—

دیوتا

" مہا مائی" کے ساتھ ساتھ ایک دیوتا شیو کی طرح بھی ہے جو تاریخی شیو کے مماثل ہے ، اس کا دیوتا کی تصویر ایک بہت ہی بھدی سی مُہر پر منقش ہے ، مسٹر میکے نے ابھی حال ہی میں اس کے حالات پر روشنی ڈالی ہے ، یہ دیوتا جس کے تین چہرے ہیں ایک هندوستانی تخت پر متمکن ہے ، بیٹھنے کا خاص انداز ہے جسے یوگ کا طریقہ کہنا چاهئے ، دو زانو ، ایڑی سے ایڑی ملی ہوئی ، پنجے نیچے کی جانب جھکے ہوئے ، شانے پھیلے ہوئے اور هاتھ اور انگوٹھے آگے کی جانب گھٹنوں پر لٹکے ہوئے ہیں - کلائی سے لے کر بازوؤں تک بازو بند ہیں ، جن میں سے آٹھ چھوٹے اور تین بڑے ہیں - اور کمر کے گرد دُهرے بند بندھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں - سر پر دو سینگ ہیں جو سر بند سے ملے ہوئے ہیں - اس دیوتا کے دونوں طرف چار جانور ہیں ، ایک هاتھی ،

اور ایک چیتا تھیک داھنے جانب ایک گینڈا اور ایک بھینسا بائیں جانب - تخت کے نیچے دو ھرن ھیں جن کے سر سیدھے اور سینگ بائیں جانب کو مُڑے ھوئے ھیں - مُہر کے سرے پر سات حروف کندہ ھیں ' جن میں سے آخری حرف داھنی جانب کے سرے پر جگہہ کی کمی کے باعث ھاتھی اور چیتے کے درمیان میں آ گیا ھے " -

تین چہروں یا تین آنکھوں کا دیوتا

اس دیوتا کا اس قدر ذکر کرنے کے بعد وہ دلائل پیش کئے گئے ھیں جن سے آرین زمانے کے شیو کا ماخوذ و مستنبط ھونا ثابت کیا گیا ھے - اس کا خلاصہ یہ ھے " مذکورہ بیان سے اس دیوتا کی حیثیت اور اس کے صفات صاف صاف نمایاں ھوگئے - پہلی بات یہ ھے کہ اس کے تین چہرے ھیں (تری مُکھا) جس سے ھمیں یکایک یہ یاد آ جاتا ھے کہ تاریخی زمانے میں شیو کی صورت میں ایک ' تین ' چار یا پانچ چہرے دکھائے جاتے تھے اور آنکھیں ھمیشہ تین ھوتی تھیں - اور یہ کہ شیو ' برھما اور وشنو کی مشہور تثلیث ھمیشہ تین چہروں کے ساتھ دکھائی گئی ھے - تین چہروں والے شیو (یعنی بغیر برھما اور وشنو کے) کی ایک عمدہ مثال کوہ آبو کے قریب دیوانگنا کے مندروں کے کھنڈر میں موجود ھے اور ٹی - اے گوپی ناتھ راؤ کی کتاب ھندو بت تراشی کے مبادیات (Elements of Hindu Iconography) میں بھی مذکور ھے " -

مہا یوگی

دوسری بات جو اس آرین زمانے کے قبل کے دیوتا کی کڑی کو اس تاریخی شیو سے ملاتی ھے

وہ اُس کی یوگ کی نشست ہے - شیو کو جوگیوں کا شاہزادہ مانا گیا ہے، وہ سادھو، تپسوي اور تیاگي تسلیم کئے جاتے ہیں بلکہ اُن کا نام ہي "مہا یوگي" بتایا جاتا ہے - یوگ کي مخصوص غرض یہ ہے کہ ذہني ورزشوں اور یکسوئي قلب کے ذریعہ خدا تک رسائي حاصل کي جائے، لیکن اسي ذریعہ سے مافوق‌الفطرت طاقتیں بھي حاصل کی جاتی ہیں اور اسي لئے کچھ دنوں کے بعد یوگیوں کے ساتھ خرق عادت کا خیال وابستہ ہوگیا - شیو مت کی طرح یوگ کا تعلق بھي آرین زمانے کے قبل کے لوگوں سے ہے - اس لئے کہ رائے بہادر رام پرشاد چندا نے اس دیوتا کی آنکھوں کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ توجہہ دلائي ہے کہ یہ یوگ کي حالت سے مشابہ ہے، اس کے علاوہ تین اور مُہریں جو دستیاب ہوئي ہیں اُن پر جو تصویریں منقش ہیں اُن کي نشست، اور اُن کے انداز سے بھی یوگ کي حالت کا اندازہ ہوتا ہے، اُن میں بظاہر تھوڑا سا اختلاف معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہ ایک ہی دیوتا کي تصویریں ہیں -

مویشیوں اور جانوروں کا مالک

تیسري بات قابل لحاظ یہ ہے کہ شیو صرف یوگیوں کے شاہزادے ہي نہیں ہیں بلکہ اُن کے بارے میں یہ بھي کہا جاتا ہے کہ وہ مویشیوں اور جانوروں کے مالک (پسوپتي) بھي ہیں - اس تخیل کي تصدیق اُن جانوروں سے ہوتی ہے جو موہنجوڈارو کے دیوتا کے گرد دکھائے گئے ہیں، ہاتھي ہاتھي، چیتا، گینڈا اور بھینسا - تاریخي زمانے میں پسوپتي کے لقب کے معني مویشیوں کے مالک کے تھے اور مشابہت کي بنا پر "پسو" سے مراد انساني گروہ

سے لی گئی جس کے مالک یا چرواہے شیو ہیں - لیکن وید منتروں میں پسو کے معنی جنگلی جانوروں کے لئے گئے ہیں ' اس لئے معقول طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُس وقت اس دیوتا کو پالتو جانوروں کا نہیں بلکہ جنگلی جانوروں کا مالک سمجھا جاتا تھا -

شاخ الوہیت اور ترسول

چوتھی صفت جو اس غیر معلوم دیوتا اور شیو کو معناً متحد کرتی ہے وہ اِس کے سر کے دو سینگ ہیں ' اس طرح کے سینگ موہنجوداڑو کی دوسری مورتیوں اور شبیہوں میں بھی پائے گئے ہیں ' جن سے بلا شبہہ یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سینگوں کا کوئی خاص مقدس مفہوم ہے - اور یقیناً یہ دیوی اور دیوتا کے خاص علامات و نشانات ہیں ' بعض حالتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پروہت وغیرہ کے علامات ہیں ' لیکن یہ شاخ یا سینگ کسی خاص دیوی یا دیوتا کا نشان یا وصف نہیں ہے ' یہ ایک دیوی یا دیوتا کو دوسرے دیوی دیوتا سے امتیاز کئے جانے کے لئے بھی نہیں ہے - لیکن آرین زمانہ سے قبل کا یہ نشان الوہیت ' گو عام طور پر ویدک آریوں میں قبول نہیں کیا گیا لیکن وہ مطلقاً نیست و نابود بھی نہیں ہو گیا - گذشتہ زمانے میں اس نے ترسول کی صورت اختیار کرلی اور اس شکل میں وہ شیو کی ایک خاص صفت بنکر برابر قائم رہا - اگرچہ اس پر دوسرے مت والوں نے غاصبانہ طور پر قبضہ کر لیا مثلاً بودھوں نے اس کو اختیار کر لیا جہاں یہ تین جواہرات (تری رتنا) کی تثلیث بن کر رہا - غرضکہ یہ نشان گو بجائے خود قابل ترمیم و تشریح ہو لیکن اُس زنجیر کی یقیناً یہ ایک کڑی ہے جو اس دیوتا کو شیو سے ملاتی ہے -

اب آخر میں وہ ہرن رہ گئے جو اس دیوتا
کے تخت کے قریب دکھائے گئے ہیں - اسی طرح تخت کے پاس کے ہرن
کے دو ہرن قروں وسطی کے شیو کی مورتوں میں
بھی دکھائے گئے ہیں خصوصاً جب وہ '' دکشنا مورتی '' یا '' یوگ
دکشنا مورتی '' کے انداز میں دکھائے گئے ہیں - اور اسی طرح
انکے ہاتھ میں ایک ہرن (مرگا) بھی دکھایا گیا ہے - تخت
کے پاس دو ہرنوں کو دیکھکر بودھ کے تخت کے پاس کے ہرن
'' دھرما کاکرا '' کے موقع کے یاد آ جاتے ہیں - یہیں پر اُن کا
پہلا وعظ ہوا تھا - ہندوستان کے بودھ زمانے میں ہرنوں کو
نمایاں کرنے کا اسقدر رواج تھا کہ ہم اس غلط فہمی کے لیے شاید
معذور تھے کہ ہرنوں کا تخیل شیو مت والوں نے بودھوں سے مستعار
لیا - لیکن اب یہ شہادت ملتی ہے کہ یہ خیال اس سے بھی قبل
کا ہے اور ظن غالب یہ ہے کہ خود بودھوں نے اسے دوسروں سے
حاصل کیا جیسا کہ انہوں نے اور باتیں بھی اُس زمانے کے دوسرے
مذہب سے حاصل کی تھیں -

پتھروں کی پرستش اور شاکت مت

آرین زمانے کے ما قبل کے شیو کی بابتہ جو مباحث درج ہیں
ان کے بعد پتھروں کی پرستش کا ذکر ہے ، اس سلسلے میں تین قسم
کے پتھروں کا بیان ملتا ہے جنکے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا
ہے کہ موہنجوداڑو کے لوگوں میں ان کی پرستش ہوتی تھی -
چنانچہ لنگ اور یونی کی پرستش کے سلسلۂ ذکر میں " مہامائی "
اور شیو کی طرف دوبارہ توجہہ منعطف کرائی گئی ہے - اس بحث
میں تعلق کا فلسفہ ، '' شکتی '' ، " پرُش '' اور "پرکرتی" کی

وضاحت کرتے ہوئے اس امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ اِس وقت کا شاکت مت بھی اپنے معتقدات و خیالات میں آرین زمانے کے ما قبل کے خیالات و معتقدات کا بہت کچھ رھین منت ہے -

درخت کی پرستش

ایک مُہر کے دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں درخت کی بھی پرستش کا رواج تھا ' چنانچہ مُہر کے سرے پر درخت کی دو شاخیں نیم دائرہ کی شکل میں زمین کو چھوتی ہوئی دکھائی گئی ہیں ' ان دونوں شاخوں کے درمیان دیوتا کی صورت ہے - دیوتا کی ہئیت کذائی یہ ہے : ایک برھنہ کھڑا ہوا شخص ' بال بہت لانبے ' ترسول والے سینگ اور بازوبند جس کو دیکھکر مذکورہ تین چہروں والے دیوتا کا تصور ذہن کے سامنے آ جاتا ہے - درخت کے سامنے ایک منت مانگنے والا نیم قد اسکا دہ ہے ' اسکے بال بھی لمبے ہیں اور سینگ اور بازو بند بھی دیوتا ہی کی طرح کے ہیں ' صرف اتنی بات زائد ہے کہ سینگ کے درمیان ایک طرح کی کلغی سی معلوم ہوتی ہے - اس منت مانگنے والے کے پیچھے ایک مرکّب قسم کا جانور کھڑا ہے مرکّب سے مراد یہ ہے کہ نصف سانڈ اور نصف بکرا ' اور چہرہ بالکل آدمی کا سا - اس ہئیت کی مخلوق کی تصویر ہڑپا اور موہنجوداڑو میں عام طور سے دیکھی گئی ہے - نیچے کھیت میں سات مورتیوں کی ایک قطار نظر آتی ہے جلکے لباس گھٹنوں تک ہیں اور سروں پر کلغیاں معلوم ہوتی ہیں - درخت کی پتیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ درخت پیپل کا ہے ' جسکی پرستش اب تک تمام ہندوستان میں کیجاتی ہے جسے کوئی ہندو کاٹنے یا نقصان

پہونچانے کے لیے طیار نہیں ہوتا اور جسکے سائے تلے وہ کسی
طرح کی چھوٹی بات کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا -
یہی وہ درخت ہے جسکے نیچے بودھ نے گیان
شجرعقل و حیات کی روشنی حاصل کی تھی - موہنجوداڑو میں بھی
اس درخت کو علم و حیات کا درخت سمجھتے تھے
یا نہیں؟ ہمارے پاس اس علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے - لیکن بہر صورت
اس کا وجود بے معنی نہیں ہے کیونکہ پیپل کا درخت جو بودھ
کے زمانے سے لیکر اس وقت تک ہندوستان میں اتنی اہمیت
رکھتا رہا ہے وہ بابل میں بھی "شجر حیات" سمجھا جاتا تھا ،
ہڑپا اور موہنجوداڑو میں اس کی موجودگی اس امر کی کافی
دلیل ہے کہ اسکی روایتی اہمیت آریہ زمانے سے قبل کی ہے -
درخت کی شاخوں میں جو چہرہ دکھایا گیا
درخت کی دیوی ہے وہ بہت چھوٹا ہے اور تصویر بھی کچھ مٹی
مٹی سی ہے ، لیکن اس برہنہ وجود کے بارے
میں دیوتا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ، اگر اس امر کو
ملحوظ رکھیں کہ ہندوستان میں درختوں پر عموماً دیویاں ہوتی
ہیں نیز یہ کہ مُہر پر جو دوسری شکلیں دکھائی گئی ہیں
وہ عورتوں کی ہیں ، یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ درخت
کی شاخوں میں جو چہرہ دکھایا گیا ہے وہ بجائے کسی دیوتا
کے دیوی کا چہرہ ہے - منت مانگنے والے کے قریب جو مرکب
قسم کا جانور کھڑا ہوا ہے اُس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا -
دوسری مُہروں پر جہاں اسی قسم کا منظر دکھایا گیا ہے وہاں
بکرا یا اور کوئی سینگوں والا جانور دکھایا گیا ہے جو کبھی تو
منت مانگنے والے کے پیچھے ، اور کبھی دیوی اور منت مانگنے

والے کے بیچ میں دکھایا گیا ہے - جس سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ یہ وہ جانور ہے جو دیوی کی نذر چڑھایا جائے گا لیکن
جانور کے اساطیری ہونے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ نذر اور
قربانی کے لئے نہیں ہے' میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کی
حیثیت ایک درمیانی دیوی کی ہے جو نذر پیش کرنے والے کی
عرض داشتوں کو بڑی دیوی کے سامنے پیش کرے - اِس لئے کہ
عراق سے نکلی ہوئی مُہروں پر بھی یہی حیثیت نمایاں کی
گئی ہے' ایک اور چھوٹی سی چیز نذر پیش کرنے والے کے
پاس دکھائی دیتی ہے جس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں ہوتا'
اس لئے کہ اس مقام پر مُہر کسی قدر ٹوٹ گئی ہے' بہت
ممکن ہے کہ یہ کوئی برتن ہو جس میں کوئی خوشبودار چیز
ہو اور جو دیوی کی قربان گاہ پر جلائی جاتی ہو - سات شکلیں
جو نیچے ایک قطار میں دکھائی گئی ہیں وہ دیوی کی خادماؤں
کی ہیں' ان کے سروں پر جو کلغی دکھائی گئی ہے' ممکن
ہے ان کے پَر ہوں - لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ یہ چھوٹی
چھوٹی شاخیں ہیں' جس طرح آج کل بھی کافرستان میں
"چیلی" کی پرستش کے موقع پر وہاں کے حاضر باشوں اور
خدمت گذاروں کو اپنے سروں پر سینگ لگانا پڑتا ہے" -

موہنجوداڑو اور ہڑپا دونوں مقامات پر درخت
کی پرستش کے دو طریقے معلوم ہوئے' ایک طریقہ
تو یہ ہے کہ درخت اپنی اصلی حیثیت میں
پوجا گیا ہے' دوسرا طریقہ یہ ہے کہ درخت کی
روح کو انسانی شکل اور انسانی صفات دے کر اس کی پرستش
کی گئی ہے اس طرح کی مثال سانچی اور بھرہُت میں ہمیں

درخت کی پرستش کے مختلف طریقے

ملتي هے ' درختوں کو یا اور کسي چیز کو انساني شکل و صورت سے متصف کر دینا هندوستانیوں کے لئے کبھی عجیب اور مشکل نہیں رها هے ' هندوستانیوں کا یہ عام خیال هے کہ هر درخت اور پودا ایک شخصیت رکھتا هے اور اُس میں روح هے اور اس لئے اُس کے ساتھ ایک ذی‌هوش انسان کا سا برتاؤ کیا جاتا هے - مثال میں اُس کو یوں سمجھئے کہ جب کوئی درخت کاٹا جاتا هے تو سب سے پہلے اُس درخت میں جو روح هوتي هے اُس سے معافي مانگ لی جاتي هے - گوند کا غیر آریہ فرقہ رات میں درخت کو هرگز نہ هلائے گا ' اور اُس کا پھل پھول بھی رات میں توڑنا پسند نہ کرے گا تاکہ درخت کي روح کو سونے میں تکلیف نہ هو - بعض غیر آریہ فرقوں میں یہ دستور هے کہ عورتیں اپنے خاوند سے بیاهے جانے سے پہلے کسي درخت سے بیاہ دی جاتي هیں - جس کا ایک مقصد یہ بھی هے کہ دولہا دولہن بھي بالکل هرے بھرے رهیں - درختوں کا آپس میں بھي بیاہ کیا جاتا هے اور تلسي کا مقدس پودا هر سال بیاها جاتا هے ' اکثر اس موقع پر پوجا پاٹ هوتی هے اور سالگرام پتھر کو بھوگ بھی دیا جاتا هے ان حالات میں درخت خود ایک دیوتا تسلیم کیا جاتا هے اور اس کی پوجا کی جاتی هے - اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ کی ان مُہروں میں یہی چیز دکھائی گئی هے -

جانوروں کی پرستش

" جانوروں کی پرستش کے بارے میں جو شہادتیں موهنجودارو میں ملتي هیں وہ درختوں کی پرستش سے کہیں زیادہ هیں -

مُہر اور پتّھروں کے نقوش اور مختلف قسم کی مٹی کی مورتوں کے سلسلے میں اس طرح کے جو جانور ہمارے سامنے آتے ہیں ان کو تین قسموں میں منقسم کیا جا سکتا ہے - (۱) وہ جن کی حیثیت اساطیری اور افسانوی ہے (۲) وہ جن کا اساطیری اور افسانوی ہونا بحث طلب ہے (۳) بالکل قدرتی قسم کے جانور - اس پہلی قسم میں مختلف طرح کے عجیب عجیب جانور ہیں ، اُن میں سے ایک آدمی کے سے چہرے کا

مرکّب مخلوق

بکرا یا بھیڑ ہے - ممکن ہے کہ اس سے بھی زائد مرکب قسم کے جانور ہوں مثلاً کچھ بکرا ، کچھ بھیڑ ، کچھ سانڈ اور کچھ آدمی ، ہم نے ابھی درخت کی دیوی کے سلسلے میں اُس کا ذکر کیا ہے جہاں ہم نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ کوئی چھوٹی قسم کی دیوی ہے جو پرستش کرنے والے اور اصل دیوی میں ایک درمیانی کی سی حیثیت رکھتی ہے - ہمارا یہ خیال ، ممکن ہے صحیح نہ ہو لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ قربانی یا چڑھاوے کا کوئی جانور نہیں ہے ، اور اسی طرح کے دوسرے جانور جو ایسے موقعوں پر دکھائے گئے ہیں اُن کا مصرف بھی یہی ہے ، بالکل اسی طرح عراق میں بھی انسان کے چہرے کا شیر پایا گیا ہے جسے دیوی یا دیوتا تسلیم کیا گیا ہے -

دیو

اسی سے قریب لیکن اُس سے پیچیدہ تر صورت اُس مرکّب جانور کی ہے جو بھیڑ ، بکرا ، سانڈ اور ہاتھی سبھی کچھ ہے - ایک مہر پر دیوتا یا دیو ، کی تصویر ہے جس کی نصف انسان اور نصف بیل کی صورت ہے ، یہ ایک

سینگ والے چیتے پر حملہ کر رہا ہے - عراق میں بھی ایک
دیوتا نصف انسان اور نصف سانڈ کی صورت کا مانا جاتا تھا -
نیم انسان اور نیم جانور کی قسم میں غالباً
ناگ بھی آتا ہے - اُسی مہر پر جس کا ابھی ذکر
کیا جا چکا ہے ' کالا سانپ منت مانگنے والے کے آگے دکھائی
دیتا ہے اور اُس کی دُم منت مانگنے والے سے لپٹی ہوئی
دکھائی گئی ہے - بہر صورت معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ منت
مانگنے والا غالباً خود ناگ ہے - ویدک زمانے میں ناگ کا عقیدہ
نہیں پایا جاتا لیکن زبعد کے ہندوستانی ادبیات میں یہ بہت
نمایاں ہے ' اور ناگ کی تصویر یا مجسّمے کو کسی دیوی یا
دیوتا کے سامنے اظہار عقیدت کرتا ہوا دکھانا ہندوستانی فن کاری
کا محبوب ترین نمونہ سمجھا جاتا ہے '

وہ جانور جنکا اساطیری و افسانوی ہونا ہنوز بحث طلب ہے
اُن میں کچھ سانڈ اور بھینسے وغیرہ ہیں جن کے صرف ایک ہی
سینگ ہونا دکھایا گیا ہے ' ممکن ہے یہ بالقصد کیا گیا ہو
اور یہ بھی ممکن ہے کہ نقش کرنے والوں نے جانور کا رخ ایسا
قائم کیا جس سے صرف ایک ہی سینگ کا نمودار ہونا ممکن
تھا - لیکن اسی کے ساتھ جب ہمارا خیال ہندوستان کے اس
قدیم روایتی بیل کی جانب مائل ہوتا ہے جس کے ایک سینگ
ہونا بتایا جاتا ہے تو ہمیں خیال ہوتا ہے کہ موہنجوداڑو کے
لوگوں نے عمداً ایک سینگ کا جانور دکھایا ہے - اس ایک سینگ
کے جانور کا ذکر ہندوستان کی دیہاتی کہانیوں میں بکثرت ملتا ہے '
اور وشنو کے لقب '' یک سرنگا '' سے زمانۂ تاریخ سے قبل
کے اس قدیم جانور کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے - تیسری

قسم اصلی جانوروں کی ہے مثلاً بھینسے ' سانڈ ' گینڈا ' بغیر کوہان کا سانڈ ' چیتا ' اور ہندستانی ہاتھی ' ان کے علاوہ اور قسم کے جانور بھی مہروں پر منقوش پائے گئے ہیں مثلاً بھیڑا ' سور ' کتا ' بندر ' ریچھ ' ہرن وغیرہ ' اسی طرح طوطے وغیرہ کی قسم کی چڑیاں بھی پائی گئی ہیں اُن سب کے نقوش کچھ تو تانبے کے پتّروں پر پائے گئے ہیں اور کچھ مورتیوں کی صورت میں ہیں ' ان میں سے کچھ مورتیں جو مٹی کی ہیں وہ یقیناً بچوں کا کھلونا معلوم ہوتی ہیں بقیہ جتنی ہیں اُن میں یا تو کوئی مذہبی مقدس مفہوم پنہاں ہے یا اُن کی حیثیت کچھ طلسمانی سی ہے - غرض یہ تمام تصویریں اور مورتیں ' جو تقریباً تمام مکانوں کے گرد پائی گئی ہیں ان سب کا ٹھیک ٹھیک مقصد کیا ہے ؟ اس کا جواب دینا مشکل ہے ' مگر اسی قسم کی دوسری مہروں پر جب ہم مذکورہ عجوبے و غریب دیوی اور دیوتاؤں کے نقوش پاتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ حقیقی و غیر حقیقی یا نصف حقیقی جتنے جانور ہیں ان سب کا کوئی نہ کوئی مذہبی مفہوم ضرور ہے ' یہ کہنا کہ اُن جانوروں کو جو مذہبی اہمیت دیجاتی تھی اُس کا درجہ کیا ہے ؟ یعنی کون زیادہ مقدس سمجھا جاتا تھا اور کون کم - تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ ہمارے پاس اس تصریح کے لئے قوی وجوہ موجود نہیں ہیں ' کسی چیز کو مذہبی تقدس یا اہمیت دینا ' اور اُس کی پرستش کرنا ' ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے ' مثلاً کسی جانور کو سعد یا نحس سمجھنا ' اس کی پرستش کرنا نہیں ہے ' یا مثلاً آج بھی ہندوستان میں مچھلیوں کو آٹا دیا جاتا ہے ' اس لئے کہ وہ اُس مقام پر آباد ہیں جہاں اُن کے آبا و اجداد
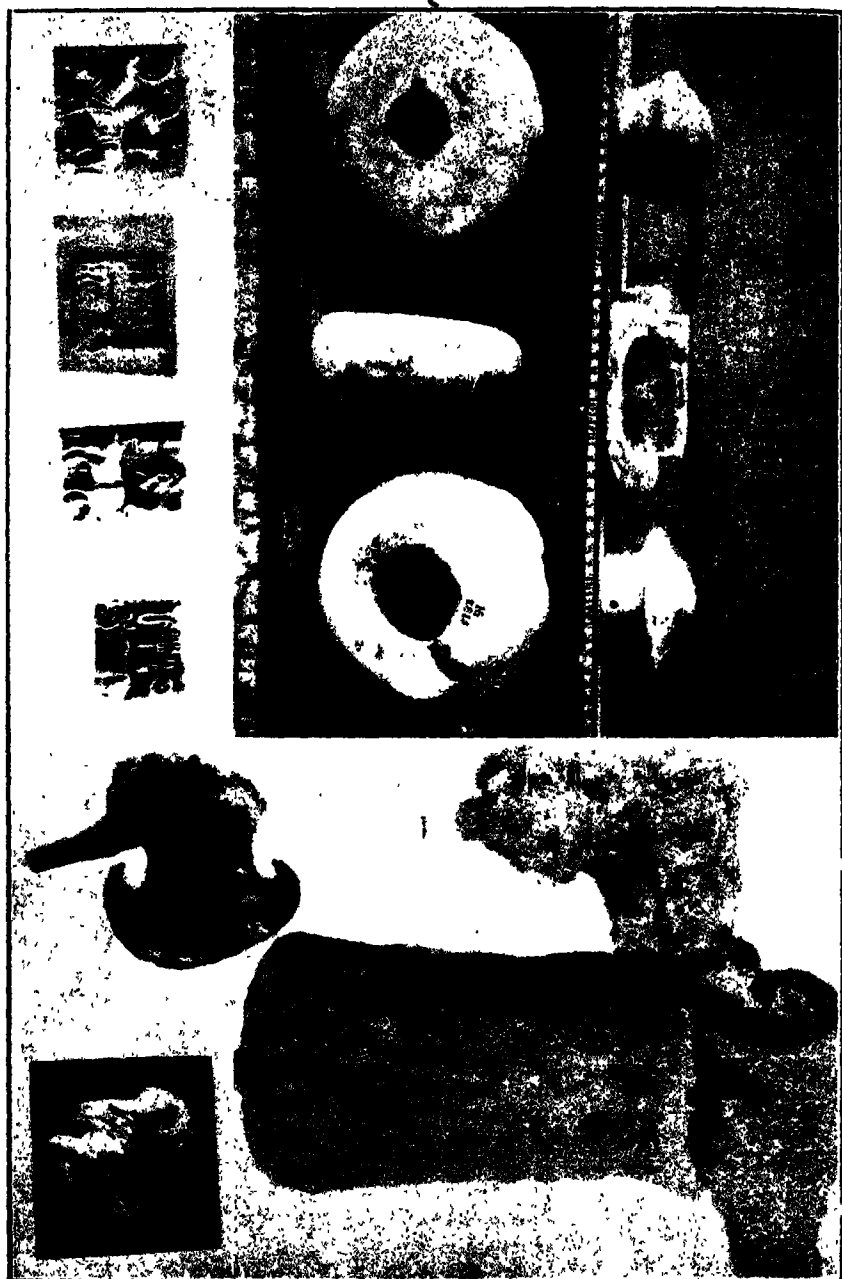
کی روحیں ہیں ' لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اُن کی پرستش کی جاتی ھے ' نظر بران ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ مرکب جانوروں کی مورتیاں ' (جنکے چہرے انسانوں کے دکھائے گئے ہیں) تین چہروں کی مورتیاں ' اور درخت کی دیویاں تو پوجی جاتی تھیں ' اسی طرح بڑے جانور مثلاً ایک سینگ کے بھینسے ' چیتے ' ہاتھی ' گینڈے ' اور گھڑیال وغیرہ کو بھی ایک طرح کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور بقیہ جانوروں کو کسی نہ کسی تخیل و توہم کے ماتحت صرف مذہبی اہمیت دی جاتی تھی - مثلاً پہلے چیتے کو مہامائی کی سواری سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ خیال اب بھی ہندؤں میں موجود ہے ' مہامائی کی یہ سواری ' مہامائی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھی جاتی. بلکہ مہامائی جب غصہ و عتاب کی حالت میں ہوتی ھے تو وہی چیتے کا روپ اختیار کر لیتی ھے - بہار کے گونڈوں میں اس کو '' وگھنی دیوی '' کہتے ہیں ' بھیلوں کا بھی اسی طرح کی ایک دیوی پر عقیدہ ہے جس کو وہ لوگ '' واگھیکا کنور '' (یعنی شاہزادہ شیر) کہتے ہیں اور جس کو پھل ' شراب اور بھیڑ نذر کے طور پر پیش کی جاتی ہے - کہانیوں میں یہ '' زمین کی دیوی '' بجائے چیتے کے ہاتھی کی صورت اختیار کر لیتی ہے - اور ایک زمانہ ہوا کہ اس شکل میں اس کو انسان کی قربانی بھی پیش کی جاتی تھی - ہندوستان کے آرین زمانے میں ہاتھی کو '' ایراوت '' یعنی اِندر کی سواری کہا جاتا تھا . لیکن اس کی پرستش گنیش یا گنپتی (یا بہ الفاظ دیگر عقل کا دیوتا اور مجسمۂ خوش بختی) سمجھ کر پرستش کی جاتی ھے - گنیش کو شیو کا بڑا لڑکا سمجھا جاتا ہے جو پاروتی

کے بطن سے ہے ' اس کی پرستش شمال میں عام طور پر رائج ہے اور جنوبی ہندوستان میں تو اُس سے عقیدت بہت ہی شدید ہے - لیکن ظاہر ہے کہ یہ دیوتا غیر آرین زمانے کا ہے -

گینڈا ' بھینسا اور سانڈ

گینڈا آجکل ملک کے بڑے حصے سے نابود ہو گیا ہے اور اس کے قدیم تقدس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے ' لیکن تاہم یہ امر ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ " لہوتا ناگا " اب تک گینڈے کی ہڈی اپنے کھیتوں کے قریب اس غرض سے دفن کیا کرتے ہیں کہ اُن کا خیال ہے کہ اُس کی وجہ سے کھیت کی پیداوار زیادہ ہوگی - بھینسا ' موت کے دیوتا سے متعلق سمجھا جاتا ہے ' اسی لئے ایک پرہیزگار ہندو اس کو ہل میں اور گاڑی میں جوتنا پسند نہیں کرتا - وہ پانی کا سیاہ دیو سمجھا جاتا ہے ' اور " بھینساسر " کے نام سے اُس کی پرستش بھی ہوتی ہے - سانڈ ' کوہان والے اور بغیر کوہان والے دونوں شیو سے متعلق سمجھے جاتے ہیں ' اور شیومت کے لوگ اس کی روزانہ پرستش کرتے ہیں ' اور سال میں ایک مرتبہ تہوار کے موقع پر تو تقریباً تمام ہندو اُس کی پوجا کر لیتے ہیں - سانڈ کو داغ کر شیو کے نام پر آزاد کر دینا بھی بہت بڑا کار ثواب سمجھا جاتا ہے ' اور اِس کے بارے میں یہ بھی عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد دوسرے عالم میں یہ سواری کا کام دے گا -

قدیم غیر تاریخی زمانے میں ان جانوروں کی یقیناً پرستش ہوتی تھی جس کا ثبوت سندھ ' پنجاب بلوچستان ' ہڑپا اور موہنجوداڑو سے نکلی ہوئی مٹی کی مورتوں سے ملتا ہے ' البتہ یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا اُس زمانے میں بھی سانڈ تین

چھیروں والے دیوتا سے جس کو میں نے شیو کا ہمشکل بتایا ہے، متعلق تھا یا نہیں، اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا لیکن یہ تو یقینی ہے کہ اُس کی پرستش اُس زمانے میں رائج تھی اور زمانۂ مابعد میں شیومت والوں نے بھی اُس کو اختیار کر لیا -

گھڑیال

گھڑیال کو گنگا کی اسی طرح سواری کہا جاتا ہے جس طرح کچھوے کو جمنا کی، مچھلی کی طرح اسے بھی بعض مقدس تالابوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے - اور بعض مقامات پر اس کی پرستش بھی ہوتی ہے، صوبۂ متوسط کے "سونجھر" لوگ گھڑیال کو زندہ پکڑ کر اس کی پوجا کرتے ہیں اور جب پوجا کی رسم ادا ہو جاتی ہے تو اُسے پھر لے جا کر دریا میں چھوڑ دیتے ہیں - بڑودھا کے بعض جنگلی لوگوں میں یہ رواج ہے کہ لکڑی کا گھڑیال بنا کر دو کھمبوں میں لگا دیتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کی پوجا کیا کرتے ہیں - گھڑیال کی دو قسمیں ہیں، ایک گھڑیال دوسرا مگر، چنانچہ اِن دونوں کی پوجا ہوتی ہے اور ان کو " گھڑیال دیوتا کہا جاتا ہے -

بندر دیوتا

بندر دیوتا کی پرستش تقریباً تمام ہندستان میں رائج ہے، اور مختلف غیر آریہ فرقوں میں بھی اس کا رواج عام ہے، ہنومان کی شکل نصف انسان اور نصف بندر کی ہے، اسکی مورت اکثر شہروں، گاؤں اور قلعوں کے پھاٹک پر حفاظت کے خیال سے لگائی جاتی ہے - یہ تعجب ہے کہ موہنجوداڑو میں اس کی کوئی مورت دستیاب نہیں ہوئی -

پانی کی پرستش

پانی کے تقدس کے بارے میں اب تک کوئی قابل اطمینان شہادت نہیں مل سکی ہے لیکن موہنجوداڑو کے لوگوں میں اس

کا جو احترام کیا جاتا تھا اور انکی روزانہ زندگی اور مذہب میں اسکا حصہ جتنا ضروری سمجھا جاتا تھا اُس کا اندازہ غسلخانوں اور نہانے دھونے کے اُس عام انتظام سے کیا جا سکتا ہے جو تمام مکانوں اور پبلک مقامات پر کیا جاتا تھا، کھلے کا زیادہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ موہنجوداڑو سے زیادہ کسی پرانے شہر میں نہانے دھونے کا ایسا اہتمام نہیں ثابت ہوتا، اور یہ سخت اہتمام و انتظام ہی اس کی دلیل ہے کہ یہ امر یقیناً مذہبی نقطۂ خیال سے ضروری سمجھا جاتا تھا، اتنے زمانے کے بعد بھی یہ کہنا کہ نہانے پر اتنا شدید زور اور اصرار مذہبی فرائض کی بنا پر تھا غالباً عجیب نہ ہو، اسلئے کہ ایک غیر معین زمانے سے ہندوستان میں تالاب، چشمے اور دریاؤں کا غسل، مذہبی تخیل و معتقدات کی بنا پر رائج رہا ہے - ہر پرہیزگار ہندو، علی‌الصباح کسی بہتے ہوئے چشمے میں غسل کرتا ہے اور اگر کوئی چشمہ و دریا نہ مل سکے تو تالاب، کنویں اور مکان ہی کے پانی پر اکتفا کرتا ہے، اس لیے کہ ایک دن کے گناہ صرف اسی طرح دھوئے جا سکتے ہیں - کسی مقدس جھیل مثلاً پشکر میں غسل کر لینا تو گویا تمام عمر کے گناہوں کو دھو ڈالنا ہے - لیکن گو پانی ہندؤں میں پاک اور پوتر سمجھا جاتا ہے لیکن اُس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کے یہاں پانی کی پرستش کی جاتی ہے - پانی میں چونکہ پاک و صاف کر دینے کی طاقت ہے اس لیے وہ پوتر سمجھا جاتا ہے لیکن دریا کی پرستش اس سے بالکل علحدہ چیز ہے -

دریاؤں کی پرستش

گنگا اور جمنا کو مستقل دیوی سمجھکر ان کی پرستش کیجاتی ہے - دریا پنتھیوں کا سب سے

بڑا مقدس مقام سندھ ہي میں ہے ' پرستش کي یہ رسم ممکن کیا بلکہ اغلب ہے کہ زمانہ تاریخ سے قبل کی ہے ' لیکن بغیر کسي پختہ ثبوت کے یہ دعویٰ کر دینا کہ ایسا ہوا بھي یقیناً بہت بڑي بے احتیاطی ہوگي ' اس لیے کہ دریاؤں کی پرستش ویدک مذہب کي ایک نمایاں خصوصیت ہے اور یہ ممکن ہے کہ بجائے غیر آریوں کے آریوں نے اس تخیل کو ہندو مذہب میں داخل کیا ہو - لیکن بر خلاف اسکے یہ خیال زیادہ قریں قیاس ہے کہ چونکہ دریا کي پرستش بھي عالمگیر رہي ہے اسلیے بعید نہیں کہ آریوں سے قبل کے لوگوں نیز آریوں نے اسے بطور خود شروع کیا ہو' اور واقعہ یہ ہے کہ ابتدائي لٹریچر سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ہندوستانیوں نے عام طور پر کنویں ' تالابوں ' جھیلوں اور ان میں بسنے والي روحوں کو جو تقدس دے رکھا ہے اسکا سراغ ویدک ماخذوں سے ہو سکتا ہے -

ناگ اور پاني کي روحیں

پاني کي اس طرح کی روحوں کا مظاہرہ ناگوں سے بھي ہوتا ہے ' اگر واقعي وہ ناگ ہیں ' مگر یہاں ایک بحث طلب مسئلہ سامنے آتا ہے - وہ یہ ہے کہ فن کاري اور حکایات کي رو سے ناگوں کا پانی سے بہت بڑا تعلق ہے ' اور عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا مکان یا مانند گھرے سمندر میں یا جھیلوں اور دریاؤں کے عمیق حصوں میں بناتے ہیں - لیکن سانپ کي پرستش کئي طرح سے ہوتی ہے ان میں سے ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ پاني کي روح تسلیم کئے جاتے ہیں ایک وجہہ غالباً اُن کا عجیب و غریب زہریلا ہونا ہے ' اس لئے ممکن ہے کہ خوف کے باعث اُن کا مقدس ہونا تسلیم کیا گیا

هو ، پھر اُن کے سوراخوں میں رہنے کے سبب سے اُن کے بارے میں یہ خیال کیا گیا کہ وہ زمین کے اندر کے طبقے کے رہنے والے ہیں-، اور چونکہ وہ اکثر مکانوں میں دکھائی دیتے ہیں اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اُن کی پرستش "پتر" یعنی آبا و اجداد کے ساتھ متعلق کر دی جائے - اس کے علاوہ اُن کا تعلق طوفان اور بادلوں سے بھی بتایا جاتا ہے اور اس طرح بارش کے ذریعہ وہ فائدہ یا نقصان پہونچانے کی بھی قابلیت رکھتے ہیں - غرضکہ اُن کے بارے میں بہت سے خیالات ہیں (جن میں اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے) ان میں سے جس کو چاہئے ناگ سے وابستہ کر لیجیے - لیکن ان میں سے کون سا خیال مخصوص حیثیت رکھتا ہے ، بغیر کسی مزید ثبوت و شہادت کے کچھ نہیں کہا جا سکتا -

خلاصہ و نتیجہ

مذکورۂ بالا تمام بیانات سے جو نتائج قطعی طور پر نکلتے ہیں وہ مندرجۂ ذیل ہیں :—

(۱) موہنجوداڑو میں ایک نہایت شاندار تمدن اب سے پانچ ہزار برس قبل موجود تھا -

(۲) مہامائی اور شیو کی طرح کے ایک دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی ،

(۳) درختوں ، جانوروں اور پتھروں کی پرستش بھی ہندوستان کے تاریخی زمانے کے مثل کی جاتی تھی -

(۴) جانور کبھی اپنی قدرتی شکل میں اور کبھی نصف

انسان یا کسی دوسری حیوانی شکل میں پوجے جاتے تھے -

(۵) شیومت کی طرح لنگ اور یونی کی بھی پوجا ہوتی تھی' مہامائی کی پرستش کے سلسلے میں شاکت مت کے آثار بھی اُس زمانے میں ملتے تھے -

(۶) بتوں کی پرستش کے دوران میں خوشبودار چیزیں بھی دیوتا کے لیے جلائی جاتی تھیں -

(۷) نہانے دھونے کو خاص مذہبی اہمیت دی جاتی تھی' وغیرہ وغیرہ -

موجودہ ہندو مذہب' جہاں تک کہ اس کے اعمال و عام معتقدات کا تعلق ہے انہیں چیزوں پر مشتمل ہے' مرور ایام سے اگر کوئی خفیف تبدیلی ہوئی ہو تو وہ قابل لحاظ نہیں بہرصورت ان امور سے یہ قطعی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندو مذہب کا اصل ماخذ آریں تہذیب و تمدن نہیں' بلکہ سندہ کا یہی قدیم مذہب و تمدن ہے' یہ صحیح ہے کہ ہندو مذہب اپنے مذکورہ معتقدات کی تہ میں آج آرٹ اور فلسفہ کے نہایت نازک و لطیف نکات بھی پیش کرتا ہے' اگر موہنجوداڑو کے لوگوں نے اپنے ان اعمال میں اسی طرح کے اعلی ذہنی تخیل کو مد نظر نہیں رکھا تھا تو ان تمام اعمال کو وحشیانہ توہم سے زیادہ اور کیا درجہ دیا جا سکتا ہے ؟ لیکن جس طرح آج ان کی حمایت میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اُسی طرح ان کے خلاف بھی کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے' موہنجوداڑو سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں وہ ابھی تک پڑھے نہیں جا سکے' جس دن وہ پڑھ لیے جائینگے' کون

کہہ سکتا ہے کہ اُس وقت ہمیں انکے ذہنی اور علمی کمالات کے بارے میں اور کیا کیا رائیں قائم کرنا پڑینگی ' لیکن کم از کم ہمیں اتنا اعتراف کئے بغیر آج بھی چارہ نہیں کہ جس قوم کے آثار سے آج اتنا بڑا ترقی یافتہ تمدن نمایاں ہوا ہو وہ فلسفہ اور دوسرے ذہنی کمالات سے بالکلیہ محروم و معرّا نہیں ہو سکتی -

---

اُردو طنزیات و مضحکات

از مسٹر رشید احمد صدیقی ایم - اے -

"ایک سؤر کو اِس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خود خدا نے اس کو بنایا ہے طنز یا تضحیک (ستائر) ہے -"

[چسٹرٹن]

"بعض تعریفیں (Definitions) صحیح ہوتی ہیں اور بعض محض دلچسپ، لیکن سب سے زیادہ موثر وہ ہوتی ہیں جو برجستہ ہوں -"

[مرشد]

انتباہ :— "از دشنام گدایاں وسیلئ زناں و زبان شاعراں و مسخرگاں مرنجید -"

[عبید زاکانی]

فسانۂ طنزیات

ہماری آپ کی جان سے دور، قرون اُولیٰ میں یونانیوں کے دو مقتدر دیوتا تھے، اِلٰہۃالفلاحت اور اِلٰہۃالخمر اور حقیقت یہ ہے کہ اس دور کی خصوصیات اور میلانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اِن دو دیوتاؤں کے علاوہ ذہن انسانی میں کسی اور کی گنجائش بھی نہ تھی - انسان واہمہ پرست اور خلقۃً کمزور واقع ہوا ہے، اِس لئے کسی طاقتور (یا مافوق‌العادت) ہستی کا سہارا ڈھونڈھنا اُس کی فطرت ہے - ہر وہ وحشی یا نیم وحشی انسان، جس کو اپنی ضرورت کا احساس تھا اپنے فکر اور عمل کے اعتبار سے مذہبی یا توہم‌پرست

تھا اور اب بھی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی انتہائی تہذیب اور ترقی کے باوجود آج بھی توہم‌پرست ہے ' وہ صرف مخلوق خداوند کا معتقد ہے -

انسان کے عہد اولین میں یقیناً ایسے مواقع بھی آتے ہوں گے جب اُس کو ہر قسم کی عافیت اور کامرانی نصیب ہوتی ہوگی ' مثلاً غلہ پکنے کا وقت ' خرمن جمع کرنے کا موقع ' موسم کا اعتدال ' فضا کی دلکشی ' صحت یا خوشگواری وغیرہ ' اُن مواقع پر اُس کی مسرت اور نشاط میں ایک طرح کا ہیجان ہوتا ہوگا اور وہ معمول سے زیادہ اُس کا اظہار کرتا ہوگا - ظاہر ہے یہی مواقع رفتہ رفتہ عیدالجماعت میں منتقل ہوتے ہوں گے -

ہر عہد اور تہوار اپنے وجود کے اعتبار سے دو پہلو رکھتا ہے ' ایک مذہبی ' دوسرا تفریحی - کسی تہوار کی مثال لے لیجئے اُس کی تاریخ اس حقیقت کی ترجمان ہوگی ' دن کا کچھ حصہ عبادت یا نذر نیاز میں اور بقیہ سیر و تفریح ' ملنے جلنے ' دید و بازدید میں صرف ہوتا ہے - اِن حالات کے ماتحت آپ اہالیان یونان کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیں ' اُن کے دو مخصوص اور محبوب دیوتاؤں الہۃالغلات اور الہۃالخمر تھے ' جن کے نام پر نذریں اور قربانیاں تہدیہ کی جاتی تھیں - اِس نذر نیاز کا بیشتر حصہ غلہ اور شراب ہوتا تھا - یہ مراسم ختم ہو لیتے تو رنگ‌رلیوں کا دور آتا جس میں عورت ' مرد ' بچے ' بوڑھے ' جوان ' سب ہی شریک ہوتے - ہنسی ' ہلکی مذاق ' تمسخر ' پھکڑبازی ' طعن و طنز ' سب و شتم ' برہنگی و بے پرواہ روی ' سب ہی کچھ ہوتا ' جن کو آج آپ اُرتھ اور

نوازی سے بھی موسوم کر سکتے ہیں اور برہنہ پن اور بے حیائی سے بھی ' فرق صرف زمان و مکان کا ہے ' افعال و افکار کا نہیں -

ظریفات کی ابتدا انہیں بدمستیوں اور برهنگیوں سے هوئی هے - یہاں اس امر کا بھی جائزہ لے لینا چاهئے کہ یہ هنسی دلگی یا سب و شتم کس نوعیت کا هوتا هوگا ' غالباً اس حقیقت سے کسی کو انکار نہ هو گا کہ جب انسان کے جذبات میں تموج هوتا هے اور اس پر ایک هیجانی کیفیت طاری هوتی هے اس وقت اس کا لب و لہجہ هی نہیں بدل جاتا بلکہ ایسی حالت میں اکثر لب و زبان سے جو کلمے ادا هوتے هیں وہ اپنی ترکیب اور بندش کے اعتبار سے بھی مختلف هوتے هیں ' لب و لہجہ اور ترکیب و بندش کی یہ عجیب نوعیت ' فن شعر و شاعری میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی هے جس کا اصطلاحی نام هم نے اوزان اور قافیہ و ردیف رکھ دیا هے ' آواز اور الفاظ کی انہیں مختلف نوعیتوں کو هم موسیقی سے بھی تعبیر کرتے هیں - یہ اصطلاحی اوزان در حقیقت همارے متلاطم جذبات کے اوزان هیں جن سے هم گریز کر سکتے هیں ' لیکن انکار ناممکن هے ' چنانچہ عہد قدیم کے یونان میں انہیں رنگ رلیوں میں جو طعن و طنز ' سب و شتم ' هنسی هلگی ' پھکڑ یا فحاشی پر مشتمل هوتی تھیں ایک قسم کے بے ربط وزن کا بھی التزام هونے لگا جس نے مرور ایام سے نظم کا جامہ اختیار کر لیا - یہی سبب هے کہ یونان اور روم کے جتنے مشہور هجوگو هوئے وہ سب کے سب شاعر تھے - عربوں کے یہاں بھی هجو کی تعریف و تشریح میں جو کچھ کہا گیا هے وهاں نظم کی شرط ایک حد تک لازمی قرار دے دی گئی هے - عربوں میں هجا بے صواہ

وہ اشعار ہیں جن میں کسی قوم ' کسی فرد ' کسی جماعت یا کسی کی منقصت کی گئی ہو -

موجودہ ناقدین میں یہ امر متنازعہ فیہ ہے

رومن اور لاطینی طنزیات

کہ اہالیاں روم نے یونانیوں سے طنزیات اخذ کیا یا یہ خود اُنہیں کے افکار دماغ کا نتیجہ ہے - جولیس اسکیلیگر (Julius Scaliger) اور ہنسی اس (Heinsius) اول الذکر خیال کے علمبردار ہیں ' ریگل شی اس (Regaltius) اور کیسبن (Casaubon) موخر الذکر نظریے کے معتقد ' لیکن قبل اِس کے کہ اُن عقائد سے بحث کی جائے اِس امر کا اظہار ضروری ہے کہ لعن و طعن یا سب و شتم ہر قوم میں خود بخود نشو و نما پاتے ہیں - اِس لئے یہ بحث کہ اس فن کو اہالیاں روم نے یونان سے حاصل کیا یا اسباب خاص میں یونانی اہالیاں روم سے مستفید ہوئے ایک حد تک بے سود اور غیر متعلق ہے - اسکیلیگر کو اصرار ہے کے یہ چیز یونان سے روم کو منتقل ہوئی اور ثبوت میں یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ لفظ سطائر (Satire) طنز یا ہجو کے مفہوم میں سطیرس (ایک قسم کا مختلف الاعضا جانور) یا بقول دیگر الہۃالفلاحت سے (جس کی ہیئت بکرے اور آدمی کی شکل سے مرکب تھی) ماخوذ ہے - دوسری طرف کیسبن اور اُس کے مقلدین اِس مفہوم سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں - کیسبن کا دعویٰ ہے کہ سطیرس سے سطیرا نظم کے مفہوم میں اخذ نہیں کیا جا سکتا ' کیونکہ سطیرا اسم نہیں بلکہ صفت ہے ' نظر براں اُس کو سطائر نہیں بلکہ سطائری کہہ سکتے ہیں ' دوسری طرف یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ الہۃالخمر اور الہۃالفلاحت کے لئے

سال کی اولین مختلف زرعی پیداوار ایک چنگیر میں بطور نذر اور تہدیہ پیش کی جاتی تھیں - اِس چنگیر کو (Satura laux) کہتے تھے - نظربراں " سطائر " کا مفہوم ایک ایسی نظم سے بھی وابستہ کیا جا سکتا ہے جس میں مختلف اقسام کی پست اور رکیک طعن و طنز مختلف بحروں میں ادا کی جاتی ہوں -

یونانیوں کے یہاں ایک اور چیز بھی تھی جسے وہ سلی (Silli) کہتے تھے، یہ ایک طرح کی دشنامی نظم ہوتی تھی اور رومن سطائر سے مشابہ تھی - طیمون (Timon) نے جو سلی لکھی تھی اُس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں پروڈیز (ایک قسم کی مضحک تضمین) بھی مقبول تھی جس میں کسی معقول اور سنجیدہ نظم کے الفاظ اور جملوں کو اُلٹ پھیر کر مضحک بنا دیتے تھے - لیکن اُس کے ساتھ اِس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ صنف کلام اہالیان روم میں بھی عام تھا - آسونیس (Ausonius) نے جو قطعات لکھے تھے اُس میں ورجل (Virgil) کے اَلفاظ اور جملوں کو اُلٹ پھیر کر پوری نظم کو مضحک بنا دیا تھا - لسان‌العصر اکبر مرحوم کی بعض نظمیں بھی اِس قسم کی ہیں جن میں حافظ کے بعض اشعار یا غزلوں کو اِس طور پر اُلٹ پلٹ دیا ہے اور ایسے مصرعے چسپاں کر دئے ہیں کہ پوری نظم دلچسپ اور مضحک بن گئی ہے - قونطلین (Quintilian) اور ہوریس (Horace) کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ طنزیات کی تکوین اور نشو و نما اطیلی (اٹلی) میں ہوئی ہے اور وہیں سے یہ یونان کو منتقل ہوئی ہیں -

طنزیات کے سلسلے میں اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے ایک طور پر یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فی الحقیقت ڈراما اور تھیٹر کے اولیں اشارات انھیں رنگ رلیوں، قربانیوں اور فحاشیوں سے وابستہ ہیں جو تمدن اور معاشرت کے عہد اولیں میں برسرکار تھیں اور یہ کچھ تھیٹر اور ڈراما ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ خود موجودہ عہد کی جتنی مہذب یا غیر مہذب رسمیں، مذہبی یا روائتی عید یا تہوار ہیں اُن سب کا تاریخی اور نفسیاتی پہلو، عہد اولیں کے اُنھیں معتقدات نظری یا عملی سے وابستہ ہیں۔

مرور ایام سے معاشرت اور مذاق میں بھی انقلاب پیدا ہوا، اور وہی چیز جو کسی وقت غیر مرتب اور غیر منظم صورت میں موجود تھی نسبتاً مرتب اور منظم نظر آنے لگی۔ فیسنائین (Fescennine) جو کسی وقت وزن اور قافیہ سے بالکل معرا تھی، اب اِن صفات کی حامل ہوکر زیادہ وسیع اور مقبول بن گئی۔ یہاں تک کہ جولیس سیزر نے جب گال پر فتح پائی اُس وقت یہ عسکریوں کی زبان پر تھی، لیکن ابھی اُس کو وہ رتبہ نہیں نصیب ہوا تھا کہ مہذب حلقوں میں باریاب ہو سکتی ۔ لیکن کچھ بعد زمانہ کے تصرف سے اُن پر کسی قدر تمیز و تہذیب کا عمل ہوا اور رفتہ رفتہ فحش اور سوقیانہ عنصر بالکل حذف کر دیا گیا۔ یہ گویا طنزیات کے علم و فن کا بحیثیت علم و فن کے اولیں سنگ منزل تھا، روم کے اسٹیج پر طنزیات کو ایک مستقل وجود کی شکل میں پیش کرنے کا سہرا لیوی اس انڈرونیقاس (Livous Andronicus) کے سر ہے۔ یہ ایک یونانی نژاد غلام تھا جس کو اُس کے آقا نے روم کے

شہرِ شہری بن جانے کا شرف عطا کیا تھا - انڈرونیقاس اپنے وطن کے طور طریقے مطالعہ کر چکا تھا، اس لئے روم کے اسٹیج پر بھی اُس نے اُنھیں خد و خال کو نمایاں کرنا شروع کر دیا جو یونان کے امتیازی خصوصیات تھے - بعضوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ روم میں اس نے یونانی اسٹیج کے طور طریقے ہی نہیں نمایاں کئے بلکہ یہاں کے طرز انشا اور طریقۂ تصنیف پر بھی یونانی نقوش ثبت کر دئے - اس نظریہ کے تسلیم کرنے میں یوں تامل نہیں کر سکتے کہ اُس کی بزمیہ (کومیڈی) ارسطافینس کی تصانیف کی آئینہ ہے - اس طور پر گویا روم کی تاریخ طنزیات میں تین مراحل نہایت نمایاں نظر آئیں گے -

(۱) وہ طعن و طنز جو ابتدا میں محض برجستہ فحاشی، پھکڑ اور رنگ رلیوں پر مشتمل تھی،

(۲) وہ درمیانی زمانہ جب طنزیات میں سے فحش اور سوقیانہ عنصر حذف کر دیا گیا اور ہر قسم کی بے محابا رنگ رلیوں میں کسی قدر سلاست اور سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی - یہ گویا ایک قسم کی بے ہنگام نقالی اور ہزالی کا دور تھا جس میں نہ تو ابتدائی عہد کی فحاشی اور رکاکت تھی اور نہ بعد کے تماشوں کی تہذیب اور تنظیم -

(۳) لیوی اس انڈرونیقاس کا دور جس نے طنزیات کو ایک مستقل حیثیت دے کر اسٹیج کے قابل بنا دیا اور جس کے متعلق یہ بھی دعوی کیا جاتا ہے کہ اُس نے یونانیوں کی قدیم بزمیہ کا احیاء کیا -

لوی اِس اندرونیقاص کو روم میں اسٹیج قائم کئے ہوئے ابھی نہایت مختصر زمانہ گذرا تھا کہ اینیاس (Ennius) پیدا ہوا - اُس نے اپنے ہموطنوں کی ذہانت اور طباعی کا پورے طور پر احساس کیا اور اِس نتیجہ پر پہونچا کہ جہاں تک طنزیات کا تعلق اسٹیج سے تھا اُس کی بعض نوعیتیں قابل گرفت تھیں - نظر براں سب سے پہلے اُس نے یہ اصلاح پیش کی کہ رکاکت اور عامیانہ پن کا عنصر کلیۃً حذف کر کے اُس کو لطیف اور سلیس تر بنا دیا جائے - اُس نے یہ التزام بھی کیا کہ آیندہ سے اُس میں علمی آب و رنگ کا اضافہ کر دینا چاہئے - بالفاظ دیگر اُس کو ایسا جامہ پنھانا چاہئے کہ اُس کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ مطالعہ بھی کیا جا سکے - اندرونیقاص کی تمام تصانیف اِن اساسی اصلاحات کی حامل ہیں -

ڈیسیر (Dacier) کا خیال ہے کہ اینی اس کے سامنے لویس اندرونیقاص کی تصانیف نہ تھیں جس کی تمامتر بنیاد یونانی بزمیہ پر تھی بلکہ یہ رومن سطائر کا خوشہ چیں ہے - لیکن ترانڈن کو اِس نظریہ سے اختلاف ہے - اُس کا بیان ہے کہ اینی اس کی تصانیف کا ماخذ یونانی بزمیہ اور اُس کی دلنشین نوک جھونک ہے جس کا مظہر اندرونیقاص کی تصانیف تھیں - دوسری طرف یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اینی اس گو اطالوی تھا لیکن یونانی السنہ کا زبردست عالم تھا - یہاں تک کہ اُس کا عقیدہ تھا کہ ہومر کی روح نے اُس کے کالبد کو اپنا نشیمن بنا لیا تھا - نظر براں یہ تسلیم کرنا حقیقت سے دور ہوگا کہ اُس نے اپنے ہموطنوں کے مزخرفات اور دہقانیت سے استفادہ کرنا کبھی گوارا نہ کیا ہوگا - بہر حال

اُس نے یونانی بزمیہ سے استفادہ کیا یا اُن بھڈے اور بھنکام نقالوں یا قصاصوں سے فائدہ اُٹھایا ہو جو روم میں مروج ہو تھیں - یہ امر مسلمہ ہے کہ اینی اس رومن طنزیات کا اولین مصنف ہے -

اینی اس کا بھانجا لوسی لیس (Lucilius) اُس کے بعد پیدا ہوا ' اِس لئے اپنے ماموں ہی کے نقش قدم کو اپنا خضر راہ بنایا - یہ بھی ممکن ہے کہ اینی اس نے اُس کی تعلیم وتربیت اپنے مخصوص نہج پر کی ہو - لوسی لیس کے دوران حیات ہی میں پکوویس (Pacuvius) نمودار ہوا - اس نے اِسی یونانی بزمیہ کو لطیف تر پیرایہ سے اختیار کیا جس کا اولین رومن طنزیات میں اندرونیقاص کے عہد تک وجود نہ تھا - ہوریس کا خیال ہے کہ لاطینیوں میں اولین طنزی شاعر لوسی لیس ہے - لیکن ڈرائڈن کا بیان ہے کہ اس نے اینی اس کی طنزیات میں صرف ایک قسم کا بانکپن پیدا کر دیا تھا - اور یہ خیال بعید از قیاس ہے کہ خود لوسی لیس نے کسی قسم کی طنزیات وضع کی - مگر زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ جوں جوں رومن زبان زیادہ سنجیدہ اور سلیس ہوتی گئی اُس میں یونانی زبان کی شیرینی اور لطافت قبول کرنے کی صلاحیت بڑھتی گئی ' بایںہمہ ہوریس اور کوینٹلین دونوں لاطینی طنزیگین میں لوسی لیس کو فضل تقدم دیتے ہیں -

یہاں طنزیات کی ایک دوسری صنف کو بھی بیان کر دینا مصلحت سے خالی نہ ہوگا ' طنزیات کی یہ قسم بھی قدما کی میراث ہے اور اُنھیں سے منتقل ہوتی آئی ہے - عام طور پر اُسے

کو وارونی طنزیات کے نام سے موسوم کرتے هیں لیکن وارو (Varro)
جس سے اس قسم کی طنزیات وابستہ کی جاتی هے اُس کو
مینپی (Menippian) بتاتا هے - روم کی دنیاے ادب میں وارو
علامۂ اجل تصور کیا گیا هے - یہ مینپس (Menippus) کا متبع
تھا جو فلسفۂ کلبی کا معتقد تھا - اینی اس کی طنزیات کی
مانند وارونی طنزیات میں نہ صرف مختلف اقسام کی نظمیں
شامل نہیں بلکہ اُس میں نثر کی بھی آمیزش تھی - وارونی
طنزیات اب تقریباً لاپتہ هیں سوا ان چند مختلف اجزا کے جو
اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے بالکل مسخ هو چکی هیں -
خود وارو کا بیان هے کہ اُس نے اپنی تصانیف میں نہ صرف
مطائبات اور مضحکات کو دخل دیا هے بلکہ اُس میں فلسفہ کے
پیچیدہ اور دقیق مسائل بھی داخل کر دئے هیں وارو کے متبعین
میں سے ایک بطرونیس اربطار (Petronius Arbiter) هے جس
کی تصانیف کے متعلق کہا جاتا هے کہ هالینڈ میں شائع هوئی
هیں دوسرا سینیکا (Seneca) هے جس کی متعدد تصانیف مثلاً
کلاڈیس (Claudius) اور سمپوزیم (Symposium) وغیرہ هیں -
دور جدید میں اریسمیس (Erasmius) اور بارکلے وغیرہ گزرے هیں -
انگریزی ادب میں وارونی اتباع کا پہلو کہ اس میں نثر کا حصہ
بھی شامل هوتا تھا صرف اسپنسر (Spenser) اور ڈرائڈن (Dryden)
کے بعض تصانیف میں نظر آتا هے -

هوریس ، جوونل اور پرسی‌اس

رومن طنزیات کے بعض اهم پہلوؤں سے آشنا
هونے کے بعد یہ ضروری هے کہ چند مشہور اور
مستند لاطینی طنزیئین مثلاً هوریس ، جوونل اور
پرسی‌اس کے طرز کلام پر ایک مختصر تنقیدی نظر ڈال لی جائے

تاکہ آیندہ ان لاطینی طنزیئوں کے تذکرہ کا جب موقعہ آئے اور ان کا حوالہ دیا جائے تو مفہوم آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہوسکے -

اسمیٹن (Smeaton) کا قول ہے کہ ہوریس جوونل اور پرسیاس ہر ایک نے کم و بیش لوسی لیس (Lucilius) کے طنزیات سے استفادہ کیا ہے - ہوریس نے اس فن کو اوج کمال پر پہونچا دیا - اُس نے لوسی لیس کی طنزیات کو ان مخصوص حالات اور واقعات رسم و رواج اور طور و طریقہ کا ہم آہنگ بنا دیا جو عہد آگسٹس (Augustus) کے امتیازات خصوصی تھے - ہوریس نے اپنے سنجیدہ اور شگفتہ مذاق طعن و طنز میں ایک قسم کا مذہبی تقدس پیدا کر دیا تھا - آگسٹس کے عہد حکومت میں غیر ملکی عنصر جسقدر غیر ملکی عنصر پر غالب ہوگیا تھا اور روم کی مہتم بالشان سیرت خصوصی پر جیسا کچھ اُس کا مذموم اثر پڑ رہا تھا ' ہوریس نے اُن پر نہایت دلگداز حملے کئے ہیں - کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس طغیان اور عصیان کا ایک ناقد اور مبصر کی حیثیت سے مطالعہ کر رہا ہے ' کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اس عصیان زار میں گردش کھا رہا ہے - اس کے بعد یکایک اُس کا لہجہ بدل جاتا ہے اور وہ سوسائٹی کی سفاہت اور شقاوت اور اُس کی بے بصری کا ماتم کرنے لگتا ہے جو مسائل حیات کی حیات بخش پاکیزگیوں کی طرف سے برتے جاتے تھے - ہوریس کا یہ نمونہ اکبر مرحوم کے کلام میں ملتا ہے - ہوریس کے مانند اکبر مرحوم بھی اس طور پر کہتے تھے گویا صرف مذاق و مزاح کو دخل دے رہے ہیں - وہ سب کچھ ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر کہتے سنتے تھے -

پرسی اس (Persius) فلسفۂ زینونی کا معتقد تھا - اس کی تمام تر تصانیف اسی عقیدہ کی ترجمان ھیں - وہ صداقت کا علمبردار تھا وہ بھی اس طور پر کہ اُس کے ھر لفظ سے خلوص اور سنجیدگی کا اظہار ھوتا تھا - رومن طنزیات کی تزئین اور تہذیب کا سہرا پرسی اس ھی کے سر ھے - اور یہ پہلا شخص ھے جس نے اس راز کا انکشاف کیا کہ طنزیات کی کامیابی اور کمال کے لیے لازم ھے کہ صرف ایک ھی موضوع اور مضمون ھو ۔ ایک فرد خاص ھو جس میں اگر دوسرے عیوب ظاھر بھی ھوں تو محض سرسری طور پر سرزنش کر دی جائے - پرسی اس کے وضع کئے ھوئے یہ اصول تھے جلکی پیروی انگریزی ڈراما نے کی ھے یہاں بھی صرف ایک ھی ترتیب اور تنظیم ھوتی ھے اور ایک ضمنی پلاٹ ھزل اور نقالی کا بھی ھوتا ھے تاھم وہ اصل واقعہ یا موضوع سے رھنمون رھتا ھے - ھوریس کے یہاں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی ' لیکن اُس کے متبعین اِسی سلسلہ میں یہ دلیل پیش کرتے ھیں کہ اُس کے یہاں وحدت اور یکتائی موضوع کی یوں ضرورت نہ تھی کہ '' سطائر '' کا لفظ ھی عبارت ھے ایک ایسے طباق یا چلگیر سے جس میں مختلف اقسام کا غلہ اور پھل ھو - پرسی اس نے رومن ڈراما میں جو جدت پیدا کی تھی اور جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ھے ' اُسی کو فرانس کے مشہور نقاد بوائلو (Boileau) نے بھی خضر راہ بنایا ھے - جوونل نے پرسی اس کی تقلید کی ھے یہ بھی محض ایک ھی نقص یا عیب کو مخصوص کر لیتا تھا اور اِسی کی سوزنش پر اپنی پوری قوت صرف کرتا تھا - جوونل کی طنزیات اپنی شعلہ نوائی

اور خیطبانہ ہیجان و طغیان میں مثال نہیں رکھتیں - اِن خصوصیات کا وہ امام ہے - جوونل کا پیرایۂ بیان انگلستان میں لینڈلینڈ اور ہندستان میں مولانا ابوالکلام کی تحریروں میں ملتا ہے - بلکہ یوں کہنا بھی حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ اپنے اپنے طرز کے اعتبار سے لینڈلینڈ اور مولانا ابوالکلام ایک ہی وادی کے دو امام ہیں - لیکن لینڈلینڈ اور جوونل کے زاویۂ نگاہ میں یہ فرق ہے کہ گو اِن دونوں کے نقوش پر تیرگی محیط ہے ' لیکن لینڈلینڈ کے ظلمت کدہ میں کبھی کبھی اُمید کی شعائیں نظر آ جاتی ہیں دوسری طرف جوونل کی تاریک فضا امید کی طلعت ریزوں سے بالکل بے نیاز ہے -

طنزیات یا ہجو و ہجا کی تعریف

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ طنزیات کی شان نزول سے متعلق تھا - اب تک یہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے کہ طنزیات کی تعریف اور اُس کا ادبی مفہوم کیا ہے - کسی چیز کی تعریف پہلے بیان کرنا اور بعد اُس کی تشریح اور توضیح کردینا میرے نزدیک ایک ایسا اصول ہے جو ناقص بھی ہے اور نامکمل بھی - کسی واقعہ یا مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے لازمی ہے کہ سب سے پہلے وہ فضا پیش کر دی جائے اور وہ روایات پیش کر دی جائیں جن کی ماتحت وہ واقعہ ظہور پذیرا ہوا ہو -

ہجا کا عام مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شخص ' شے یا واقعہ کی برائی بیان کی جائے خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز ' صحیح ہو یا غلط ' اُس کی مختلف نوعیتیں ہیں اور اُس

میں سب و شتم ' طعن و طنز ' ہنسی ' ٹھٹول ' نوک جھونک '
فحاشي ' پھکڑ اور مغلظات سب آ جاتے ہیں - لیکن جب سے
اُس کو ایک فن کي حیثیت حاصل ہوئي ہے اُس کا مفہوم
بھی محدود کر دیا گیا ہے - '' سطائر '' (Satire) کا جو مفہوم
انگریزی میں ہے اُس کي پوري اور صحیح ترجماني (ہمارے
یہاں کے کسي ایک لفظ میں) تقریباً ناممکن ہے - عربي اور
فارسی میں اس موقع پر چند الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں -
مثلاً ہجو و ہجا ' ہجو ملیح ' تعریض ' تنقیض ' لعن و طعن '
طعن و طنز ' استہزا ' مذمت ' مضحکات شطحیات جد و ہزل
وغیرہ - ان الفاظ کے دینے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اِن میں
سے ہر ایک '' ستائر '' (سطائر) کا مترادف ہے - اکثر اُن الفاظ
میں سے کوئی ایک لفظ (مناسب موقع کے لحاظ سے) یا الفاظ
کی ترکیب اختیار کي جاتی ہے -

راقم‌اُلسطور نے اُن میں سے صرف ایک لفظ طنز یا طنزیات
(و مضحکات) اختیار کیا ہے یہ صحیح ہے کہ طنزیات سے بھی
وہ مفہوم پورے طور پر ظاہر نہیں ہوتا جو '' سطائر '' میں
مضمر ہے - لیکن اُس میں بھي شک نہیں کہ '' طنزیات '' کا
مفہوم سطائر (Satire) کے مفہوم سے بڑي حد تک متجانس
اور ہم آہنگ ہے - دوسري خوبي یہ ہے کہ اِس لفظ کے اختیار
کرنے سے چند اور سہولتیں پیدا ہو جاتي ہیں جن کو نظرانداز
نہیں کیا جا سکتا - اور کچھ نہیں تو اِس میں کافي اشتقاقي
سہولتیں ہیں - بہر حال یہ ناموں کا اُلٹ پھیر ہے بہت
ممکن ہے اِس سے بہتر لفظ دریافت یا وضع کیا جا سکے -

"سطائر" کي تعريف ھ‍ٹسی اس نے یوں کي ھے -

" یہ ایک قسم کی نظم ھوتی ھے جس میں کسي واقعہ یا عمل کا تسلسل نہیں پایا جاتا - جو ھمارے ذھن اور دماغ کو آلائشات سے پاک کرنے کے لئے وضع کي گئي ھے ' جس میں غلطیوں ' جہالتوں اور اُن دیگر عوارض کو جو اِن سے مرتب ھوتے ھیں ' فرداً فرداً مورد لعن و طعن قرار دیا جاتا ھے کبھي اُس کو بطور ڈراما دکھایا جاتا ھے اور کبھي یونھی پیش کیا جاتا ھے - بعض اوقات دونوں طریقوں پر ' لیکن اکثر اشارۃ و کنایۃ وہ بھي پست اور بے تکلفانہ انداز سے ' طریق گفتار تیز اور تلخ ھوتا ھے ' اُس کے علاوہ کچھہ ظرافت اور تمسخر کي بھي رعایت رکھي جاتي ھے جس کا مقصد تنفریا تنغض یا ھنسي اور قہقہہ کا اکسانا ھوتا ھے - "

در اصل یہ تعریف نہیں بلکہ تفصیل ھے اور تفصیل ھی نہیں بلکہ یہ ھوریس کي طنزیات کی تشریح ھے - یہ کچھہ ضروري نہیں ھے کہ سطائر کا تعلق صرف ڈراما سے ھو یا صرف شعر میں ادا ھو یا طریق گفتار تیز اور تلخ ھو - دوسري طرف عربی میں ھجا سے وہ اشعار مراد ھیں جن میں کسی قوم ' کسی فرد ' کسی جماعت یا کسی زمانہ کی منقصت کی گئی ھو -

لیکن یہاں اس امر کو خصوصیت کے ساتھہ مد نظر رکھنا پڑے گا کہ جہاں تک ھجو و ھجا کا تعلق کسي قوم ' فرد ' جماعت اور زمانہ کي منقصت سے ھے ' وھاں تک تو کسی کو انکار نہیں ھو سکتا اور یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ھجو و

هجا میں منقصت کا پہلو ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور ہونا چاہئے - لیکن رومن ' لاطینی اور عربی فضلا نے جو شرط شعر کی لگا دی ہے وہ ایک بڑی حد تک غیر ضروری ہے ' ہجو و ہجا کا ایک اضافی پہلو تو شعر ہو سکتا ہے ' لیکن ہجو و ہجا کے لئے شعر کو لازمی قرار دے دینا کلیتاً دور از کار ہے -

راقم السطور کا خیال ہے کہ عربی شعرا کے مانند رومن اور لاطینی شعرا بھی شعر سے مراد خیالات کی ندرت اور برجستگی لیتے تھے اور جہاں تک رومن اور لاطینی طنزیئین کا تذکرہ ہو چکا ہے میرے مذکورہ نظرئے کی تائید ہوتی ہے - رومن اور لاطینی طنزیات کی شان نزول بھی وہی بے محابا یا بر محل برجستگی ہے جس کو رومن ' لاطینی اور عربی شعرا شعر و شاعری کا جزولاینفک سمجھتے رہے ہیں - نظر براں عہد حاضر میں ہجو و ہجا سے شعر کی شرط اگر حذف کر دی جائے تو کوئی قباحت لازم نہیں آتی اور یہی نہیں بلکہ اس شرط کو قائم رکھنے سے بہت سے مستند طنزئیں اس جماعت سے حذف ہو جاتے ہیں ' روم اور یونان میں طنزیات کی ابتدا ایک قسم کے ڈرامے سے ہوئی تھی - اس لیے شعر کی قید ممکن ہے ضروری سمجھی گئی ہو ' دوسری طرف عربی شعرا ہیں جن کا رخت حیات ہی شعر و شاعری پر مشتمل تھا - لیکن اُردو طنزیئین ایک بڑی حد تک اس قید سے آزاد ہیں اِن کا شمار جائز طور پر بہترین طنزی مصنفین میں ہو سکتا ہے -

بقول تھیکرے ' طنزی ' حتی الوسع زندگی کے ہر شعبہ پر ناقدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور مکر و فریب ' رعونت و منافقت '

حق و باطل کے خلاف اس طور پر جہاد کرتا ہے کہ بالآخر ہمارے جذبات مرحمت و محبت یا نفرت و حقارت کو تحریک ہوتی ہے اور ہم اِن جذبات کو بر سرکار لانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں - مظلوم اور ناتواں کے لئے شفقت محسوس کرتے ہیں اور ظالم و جابر کو قابل نفرین و ملامت تصور کرتے ہیں -

تھیکرے نے ہجو و ہجا کے باب میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ ایک طور پر ہجو و ہجا کے عمل و اثر سے متعلق ہے اور در اصل ہجو و ہجا کے صحیفۂ اخلاق سے تعلق رکھتا ہے - یہاں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہجو و ہجا کی مسلّمہ تعریف کیا ہے انگریزی ادبا اور فضلا کا ایک حد تک متفقہ خیال یہ ہے -

"ہجو و ہجا (طنزیات کے مفہوم میں) کا مقصد یہ ہے کہ کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبۂ تفریح یا نفرت کو تحریک ہو بشرطیکہ اس ہجو و طنز میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو - اگر ان حیثیتوں کا فقدان ہوا تو پھر یہ محض گالی گلوچ یا دھقانیوں کی طرح منھہ چڑھانا ہوگا"
(انسائکلو پیڈیا برٹانکا)

اِس تعریف کو ہجو و ہجا کی بیسویں صدی عیسوی کی تعریف کہہ سکتے ہیں ورنہ رومن اور لاطینی طنزیئین کی ایک بڑی تعداد جن کے یہاں سوا پھکڑ اور فحاشی کے کچھہ اور نہیں ہے طنزیئین کے صلف سے خارج ہو جاتے ہیں دوسری طرف ان طنزیئین کی تصانیف کو وہ ادبی حیثیت بھی حاصل نہیں ہے جو انگریزی فضلا کے پیش نظر ہے -

اصلاً ہجو و ہجا سے تنقیص و تعریض مراد ہوتی ہے - ایسی تنقیص یا تعریض جس سے جذبۂ تفریح یا نفرت کو تحریک ہوتی ہو، راقم السطور کا ذاتی خیال ہے کہ اس قسم کی تنقیص یا تعریض کو ادبی حیثیت حاصل ہو یا نہ ہو اُن کا اپنے مورد پر پورے طور پر چسپاں ہو جانا از بس لازمی ہے اگر یہ پورے طور پر (بقول شخصے) '' چپک نہیں جاتیں '' تو پھر اِن کو ہجو و ہجا یا طنزیات کے بجائے " لغویات '' کہنا زیادہ موزوں ہوگا - ہجو و ہجا کے سلسلہ میں بہت سے الفاظ جملے یا لطیفے ایسے ہو سکتے ہیں جو ادب کی کسوٹی پر صحیح اُترنا تو درکنار اِس کے قریب بھی نہیں لائے جاسکتے، لیکن اپنے مفہوم اور موقع و محل کے اعتبار سے اتنے موزوں اور برجستہ ہو سکتے ہیں کہ اُن پر ہجو و ہجا کا پورا طور پر اطلاق ہوسکتا ہے - یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بہت سی چیزیں ادبیت سے مُعّرا ہوسکتی ہیں بایںہمہ یہی نہیں کہ اکثر مذاق سلیم پر قطعاً بار نہیں ہوتیں بلکہ مذاق سلیم اُن کا شکر گزار بھی ہوتا ہے -

نظر براں ہجو و ہجا سے ایسی تنقیص، تعریض یا تضحیک مراد ہے (اور اِس میں وہ تمام الفاظ، آواز، انداز، حرکات و سکنات اور اشارات شامل ہیں جو......فرض کر لیجئے کانگریس سے منسوب کئے جا سکتے ہیں اور جن کے خلاف آرڈیننس نافذ ہو چکے ہیں) جو اپنے مورد پر ہر حیثیت سے یا کسی نہ کسی پہلو سے لیکن پورے طور پر چسپاں ہوتی ہو - اب رہا یہ امر، کس طور پر یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے ہمارا ذاتی خیال ہے کہ تنقیص یا تعریض کے لیے لازم ہے کہ وہ حقیقت پر مبنی ہو - اِس سلسلہ میں بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں وہ اصول پیش کر دے

جائیں جو ہجو و ہجا کے مصیبۃ لخلق میں عربوں کے یہاں ملتے ہیں'

(۱) جو چیز فی نفسہ قبیح یا مکروہ ہے اس کی ہجو کی جا سکتی ہے -

(۲) جسمانی یا فطری نقائص یا معائب کی مذمت ناروا ہے -

(۳) آبا و اجداد کی فرو گذاشت پر اولاد کو مورد لعن طعن قرار دینا ناجائز ہے -

(۴) اُنھیں معائب کو قابل گرفت تصور کرنا چاھئے جو عقل کے نزدیک قابل گرفت ہوں -

(۵) بہترین ہجو وہ ہے جو جلد ذہن میں محفوظ ہو جائے جس کی ترکیب اور معنی میں پیچیدگی نہ ہو جس کو عام مذاق جلد قبول کرلے اور صرف قبول ہی نہ کرلے بلکہ اُس کو صحیح بھی سمجھتا ہو' وغیرہ -

انگریزی طنزیات

اب تک طنزیات اور طنزیگوں کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ عہد قدیم سے متعلق تھا اور اُن زبانوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے جن کا شمار کلاسکس (ادبیات عالیہ) میں ہوتا ہے اس کے بعد کوئی اور ایسا مرتب اور مربوط سلسلہ نہیں ملتا جس پر وثوق کے ساتھ کوئی حکم لگایا جا سکے یا جس کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ سود مند ہو - اس میں شک نہیں' از منۂ وسطی' طنزیات کی ایک وسیع جولانگاہ پیش کرتا ہے - ارباب کلیسا کے فرسودہ معتقدات ان کی خلوت اور جلوت کی داستانیں' جنس نازک

کی کافر ماجرائی اور عشوہ زائی ' اصحاب دول کی فرعون سامانی '
ایسے واقعات نہ تھے جو اس عہد اور فضا کے لئے کسی طور پر
ناسازگار ہوتے تاہم طنزیات کا کوئی مخصوص اسکول ' نہیں ملتا
اور ہر پھر کر نگاہیں صرف ریناڈ اور ڈانٹے پر پڑتی ہیں -

قرون وسطی میں ریناڈ اور ڈانٹے کا نمونہ انگلستان نے
صرف لینگلینڈ اور چاسر کی ذات میں پیش کیا ہے یہ دونوں
اپنے احساس اور تعلیمات کے اعتبار سے ہوریس اور جوونل کے
علمبردار تھے - ایک کی حیثیت اس دیندار کی تھی جو
دشمنان عقل اور ذوق کو ہنسی دلگی اور طعن و تشنیع سے
مغلوب کرنا چاہتا تھا ' دوسرا اپنا پیام رسالت اُن کے خلاف
پیش کرنا چاہتا تھا اور اُس کے لئے کبھی کبھی انتہائی طیش
ناکیوں کے ساتھ برہم نظر آتا تھا - یہ دونوں مسالک انگریزی
ادب میں اب تک کسی نہ کسی طور پر نمایاں ہیں - ایک
کے متعقد -

چاسر ' اڈیسن ' سوئفٹ ' تھیکرے اور ٹینیسن ہیں اور
دوسرے کے علم بردار لینگلنڈ ' نیشن ' ڈرائڈن ' پوپ جانسن اور
براؤننگ ہیں -

لینگلینڈ قرون وسطی کا جوونل تصور کیا جاتا ہے - کوہستان
ملورن کی اس غمگین دنیا سے بیزار اور اپنے عہد کے معاشری
معائب اور معاصی کی سوگوار ہستی کو جماعت کے مقررہ نظام
اور اصول میں عافیت اور جمعیت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا
تھا ' کیونکہ اُن کے رگ و پے میں کید و فریب سرایت کر چکا
تھا اور اِسی عقیدہ کی بنا پر اُس نے بقول اسکیٹس اپنے تخیلہ

میں فریب اور فلاکت زدہ کسانوں کی حالت زار ' قسیسوں کی زباں کاری ' راھبوں کے حرص وآز کا نہایت بدیع نقشہ کھینچا ھے ' کاھل الوجود مزدور اور کاری گروں پر لعن و طعن کی ھے اور عدالتوں کی رشوت ستانی پر اظہار نفرین کیا ھے - مختصر یہ کہ اُس نے اِن تمام عیوب و ذمائم کو ھدف ملامت بنایا ھے جو ھمیشہ اور ھر زمانہ میں طنزیات کا موزوں ترین موضوع قرار دئے جا سکتے ھیں -

لیکن لینگلینڈ کی طنزیات میں وہ شعلہ نوائی اور خطیبانہ ھیجان و طغیان نہیں پایا جاتا جو جوونل کا امتیاز خصوصی ھے - اُس کے مقابلہ میں اُس کے ھم عصر جیفری چاسر کی شگفتہ نگاری اور طرب نوائی کا مقابلہ کیا جائے تو آسمان اور زمین کا فرق نظر آنے لگتا ھے - ھوریس کے مانند چاسر کی طنزیات میں ایک قسم کی آسودگی اور مرحمت پائی جاتی ھے - تلخی اور شوریدگی کا پتہ نہیں - یہ معائب و معاصی کی سرزنش کرتا ھے ' لیکن بجائے سرکہ جبیں ھونے کے ھمیشہ خندہ روئی کو دخل دیتا ھے - اُس کی وجہ یہ بھی ھو سکتی ھے کہ اُس نے ایوان اور ارباب حکومت کو پیش نظر رکھ کر اپنے کلام کو ترتیب دیا اور غالباً اِسی خیال سے وہ اِن مراحل اور مواقع کو قصداً نظر انداز کر دیتا ھے جہاں سے گذرنا دربار اور درباریوں کے نزدیک نا پسندیدہ اور بے محل ھو سکتا تھا - یہی حالت ھوریس کی ھے - جس نے ھمیشہ آگستس کی سامعہ نوازی کے لئے قلم کو جنبش دی - لینگلینڈ کی مہتم بالشان تمثیلیہ میں طنزیات کا عنصر نہایت سنجیدہ اور خطیر نظر آتا ھے جس کے مطالعہ

سے یہ امر فوراً محسوس ہوتا ہے کے اُس کو اپنی ذمہ‌داریوں کا
شدید احساس تھا - دوسری طرف چاسر کے قفس کنٹر بری
میں جسے اُس نے اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت سے زعفران زار
بنا دیا ہے - ہوریس کے مانند وہ بھی انسانی کمزوریوں کو قابل
عفو سمجھتا ہے اور محض اِس بنا پر کہ خود انسان تھا ا

پندرھویں صدی کی ابتدا لینگلینڈ اور چاسر کے خاتمہ سے
ہوتی ہے - اِس زمانہ سے سولھویں صدی کے وسط تک جس زمانہ
میں گیسکوئن نے '' اسٹیل گلاس '' نکالا ہے ہم کو اسکاٹلینڈ کے
طنزی شعرا کی طرف رجوع کرنا چاھئے - ولیم ڈنبار اور سرتھوڈ
لینڈسے اِس عہد کے بہترین شعرا تھے - اول الذکر کا شمار
برطانیہ کے بہترین طنزیئین میں ہوتا ہے - لینڈسے کے متعلق
یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اُس نے لفاظی اور دیگر پیچیدگیوں
کو راہ نہ دیا ہوتا تو اُس کی طنزیات غالباً اولین صف میں
بار پاسکتیں -

اِس کے بعد ہمارا گذر ملکہ الزبتھ کے عہد میں ہوتا ہے -
جو حیثیت بہترین لاطینی طنزیئین ہوریس ' جوونل ' اور پرسی اِس
کو عہد گذشتہ میں حاصل تھی وہی رتبہ پیرس پلاؤمین
اور لوچ کو اِس زمانہ میں حاصل تھا - اُس دور میں ادبیات
کو جو عروج ہوا اور جس کثرت کے ساتھ شعرا اور اہل کمال عالم
وجود میں آئے اُس کا تفصیلی تذکرہ تقریباً ناممکن ہے اور بے
محل بھی - سولھویں صدی کے آخر اور جیمس اول کی وفات
تک تقریباً سو شعرا اور نثار گذرے ہیں - بشپ ہال اِس عہد
کا بہترین نمونہ ہے - ہوریس اور جوونل کا اُس نے نہایت شوق

اور محنت کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور اُن کا بہترین متبع تسلیم کیا جاتا ہے - ہال کا ہم عصر طامس نیش تھا جس نے جوونل کی اِس خوبی سے پیروی کی تھی کہ بسا اوقات وہ خود جوونل کی سطح پر پہونچ جاتا تھا - ہال کا دوسرا ہم عصر طامس ڈیکر تھا جس کی ایک تصنیف ".گلس هارن بک" ہے - اُس نے لنڈن کی معاشرتی زندگی پر نہایت جوش اور شدت کے ساتھ حملہ کیا ہے - ہال کے بعد بعض حلقوں میں جان مارسٹن کو دوسرا درجہ دیا جاتا ہے -

اُس عہد کے جتنے طنزی شعرا گذرے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر نے ہوریس اور جوونل کے نقش قدم کو اپنا رهبر طریقت بنایا ہے - اُن کے یہاں اسلوب و انداز سے زیادہ نفس مضمون اور موضوع پر زور دیا جاتا تھا - جان بارکلے کی تصانیف بعض حلقوں میں اِس عہد کی بہترین ترجمان ہیں - برلیمانی جنگ کے دوران میں طنزیات کی سطح کسی قدر پست نظر آنے لگی تھی اُس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ شعرا زیادہ تر مذہبی اور جماعتی مناقشات میں اُلجھے رہے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے ایسی حالت میں دریدہ دھنی مذاق سلیم پر اکثر غالب آ جاتی ہے جس کی نمایاں مثال کلیو لینڈ ' اولڈھم اور کسی حد تک سموئیل بٹلر ہے -

لیکن یہ سب کچھ پیش خیمہ تھا انگریزی طنزیات کے اِس عہد زریں کا جس میں انگلستان کا بہترین اور بزرگ ترین طنزی شاعر جان ڈرائڈن عالم وجود میں آیا - جہاں تک طنزیئوں کی تعداد و شمار کا تعلق ہے الزبتھ کا عہد ایک نمایاں حیثیت

رکھتا ہے ' لیکن جہاں تک اس صنف کلام کی شگفتگی اور
شگوفہ زائی کا تعلق ہے ہم کو سترھویں صدی کا آخری اور اٹھارویں
کا تقریباً نصف ابتدائی حصہ مد نظر رکھنا پڑے گا جب ڈرائڈن
کی دو مشہور تصانیف ابسلم اور اکٹوفیل شائع ہوئیں - اس
زمانہ میں طنزیات کے وہ مایہ ناز علم بردار گذرے ہیں جن کا
نام انگریزی ادب میں شاید کبھی فراموش نہ ہو - ڈرائڈن '
سوئفٹ ' ڈیفو ' اسٹیل ' اڈیسن ' اور پوپ کے تمام شاہکار اسی
عہد کے یادگار ہیں - گولڈ اسمتھ ' شیریڈن ' مور ' اور بائرن بھی
اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں -

متذکرہ صدر عہد بھی مختلف ادوار پر مشتمل ہے ڈرائڈن
سوئفٹ کلیو لینڈ اور پوپ اپنے اپنے اسلوب بیان کے اعتبار سے اتنا
ہی مختلف ہیں جتنا خود ہوریس اور جورنل - اس کا ایک
بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس وقت انگریزی ادب پر فرانسیسی
ادبی رنگ غالب آ چلا تھا جس میں سب سے زیادہ نمایاں
اثر فرانسیسی نقاد اور طنزی شاعر بوائلو کا تھا - انگریزی ادب
میں ' ڈرائڈن کے بعد '' محتسب ادبی '' کی حیثیت اس کو
حاصل تھی - سوئفٹ ' پوپ اور ڈرائڈن ہر ایک نے بوائلو کے
تصرف اور فیضان کو انتہائی عقیدت سے تسلیم کیا ہے - لیکن
اس میں بھی شک نہیں ' اس تمام عظمت اور برتری کے باوجود
جو سوئفٹ ' ایڈیسن پوپ اور بائرن کو حاصل ہے ان کی تمامتر
خوبیاں ڈرائڈن کے فیضان کی منت کش تھیں -

یہاں اس امر کا تذکرہ کر دینا بھی غالباً بے محل نہ ہوگا
کہ ڈرائڈن کے بعد جن طنزیئین کا نہایت زبردست اثر انگریزی

ادب پر پڑا ہے وہ پوپ اور سوئفٹ تھے - ان کے ادبی کارناموں
کا تذکرہ طوالت سے خالی نہ ہوگا لیکن غالباً اتنا اشارہ
منزل مقصود کی طرف رہبری کرنے میں معین ہوگا کہ پوپ '
ڈرائڈن کا شاگرد تھا - شاگرد کی تصنیف نہ صرف استاد کی
تمام صفات کی بہمہ و جوہ حامل ہے بلکہ شاگرد نے ایک حد
تک خود اپنے ذاتی جوہر اور خوبی کا بھی نہایت صنعت کارانہ
طریق سے اضافہ کیا ہے - البتہ ایک اختلاف ایسا ہے جس کا
تذکرہ غالباً بے موقع نہ ہوگا - پوپ نے اپنے کلام میں طعن و
تشنیع ' کینہ پروری اور زہر ناکی کو زیادہ دخل دیا ہے حالانکہ
استاد کے یہاں فیاضی اور کشادہ قلبی کا عنصر غالب ہے - پوپ
اور سوئفٹ دونوں نے اٹھارویں صدی کے وسط میں رحلت کی ہے -
ان کے بعد طنزیات کی ادبی لطافتیں زائل ہونے لگیں - یہ
انحطاط کچھہ عرصہ تک قائم رہا یہاں تک کہ گولڈ اسمتھہ نے
اس میں زندگی کی ایک تازہ روح پھونکدی -

انقلاب فرانس نے انگریزی طنزیات میں ایک جدید اسلوب
کا اضافہ کیا جس کے تصرف سے طنزیات میں سیاسی عنصر کی
ایک دفعہ پھر آمیزش نظر آنے لگی - انیسویں صدی کے جن
طنزی شعرا کا تذکر ضروری ہے اس میں سب سے پہلا ولیم جیفرڈ
ہے اُس نے بھی لاطینی اساتذۂ فن کی تقلید کی ہے لیکن
بسااوقات اُس کے لفظوں اور فقروں میں شدت اور برہنگی اس درجہ
غالب آ جاتی ہے یا ذاتیات کو وہ جس حد تک ہدف ملامت
بناتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی بے محل نہیں ہے کہ اکثر
یہ مذاق سلیم پر بار ہونے لگتا ہے - اس عہد کی سب سے
نمایاں ہستی بائرن ہے اس کی بعض تصانیف اس فن کا بہترین

نمونہ ھیں بائرن کے بعد پریڈ کا دور آتا ھے جس کی نظموں کی شستگی اور پاکیزگی مسلم ھے - اُس کی حیات ھی میں لیمب ' سودی ' ڈزرائلے اور تامس ھڈ اسٹیج پر آئے - ان میں سے بیشتر ایسے تھے جنھوں نے اجتماعی زندگی کے نقائص اور ذمائم کو ھدف ملامت بنایا ھے - مس آسٹین ' ڈکنس ' ڈگلس جیرولڈ کی طنزی تصانیف بھی مختلف نوعیتوں کے ساتھہ بلند پایہ تسلیم کی گئی ھیں - اسی سلسلہ میں " امریکن اسکول " کی طنزیات کا مختصر ضمنی تذکرہ بھی یہاں بے موقع نہ ھوگا - اس کی بنیاد واشنگٹن اروِنگ نے رکھی تھی اور اس کے متبعین ھلوبرٹن ' پالڈنگ ' ھومس اور تقلے ھیں -

اب وہ دور آتا ھے جس میں طنزیات نے اپنی دیرینہ شدت تلخی اور زھر ناکی ایک حد تک نظر انداز کردی ھے - یہ مضحکات اور مطائبات کا عہد ھے - ھر بات خوشگوار انداز سے کہی جاتی ھے حرب و ضرب کا عہد گذر چکا ھے - کچھہ خوشگوار شوخیاں ' اُچٹتی ھوئی ضربیں ' تھوڑی بہت حریفانہ چشمک - لیکن یہ سب کچھہ اس انداز سے کہ ادبی لطائف و ظرائف پامال نہ ھونے پائیں ' انگریزی ادب میں عام ھیں - اس سلسلہ میں مورٹمر کولنس ' ارتھرلاک ' فریڈرک لوکو ' ڈبلواس گلبرٹ ' ڈاکٹر والٹرس اسمتھہ کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ھے -

موجودہ دور میں اسکروائلڈ چسٹرٹن اور برنارڈشا کا شمار بہترین طنزیئین میں ھوتا ھے ' جس کی تفصیل فی الحال نظر انداز کی جاتی ھے -

---

ادبی تاریخ کے اصول

(از ظفرالحسن لاری ایم - اے)

پچھلے دنوں اُردو ادب کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں - اور اِس میں شک نہیں کہ تنقیدی کارناموں میں ارتقائی تسلسل کے آثار واضح اور نمایاں ہیں - تنقیدی معیار' بھی ہر عہد و زمانہ کے ساتھہ بدلتا رہا ہے - ابتدائی تنقیدیں تذکروں کی شکل میں تھیں - اور ان کا معیار صنعتی اور شخصی تھا - صنعتی کا لفظ میں اِس معنی میں استعمال کر رہا ہوں کہ ادب کے کارنامے ادبی صنعت کے معیار سے جانچے جاتے تھے - لفظوں کی بندش' ترکیبوں کی چستی' قواعد عروض و قوانی کی پابندی' اِن امور پر نقاد کی نظر محدود تھی - یہ تنقیدیں بعض اوقات بہت ناگوار شکل اختیار کر لیتی تھیں - اور اکثر اعتراضات جو کسی محدود نقطۂ نظر سے کیے جاتے تھے اُن پر ہیچ ہونے کا گمان ہوتا ہے - مختلف شہروں کے محاوروں کا فرق' جا و بیجا سرقے کا الزام' ترکیبوں میں صفائی کا التزام' صحت زبان کے بارے میں حد سے گزرے ہوئے شرائط وغیرہ وغیرہ' یہ قیود بعض اوقات ادیب کی آزادی میں ضرورت سے زیادہ دخل انداز تھے - مگر اسی سختی کا نتیجہ ہے کہ جہاں تک صنعت کا تعلق ہے اُردو ادب نے' اور خاص طور پر اُردو شاعری نے' بہت جلد ابتدائی منازل طے کر کے تکمیل کی

شکل اختیار کر لی - جس وقت زبان اپنے ابتدائی منازل میں نئی شکلیں اختیار کرنے کے لئے مستعد ہوتی ہے ' اُس وقت بے راہ روی سے بچانے کے لیے سنگین قیود کا عائد کرنا لازم ہوتا ہے - اُردو زبان کی ترقی ادبی دنیا میں ایک معجزہ ہے اور اس کا سہرا اُن نقادوں کے سر ہے جنھوں نے ذاتی رجحانات کو دبا کر ایک معیاری ادب قائم کرنے کے لیے استقلال کے ساتھہ کوشش کی - وسیع سے وسیع خیالات کو دو مصرعوں کے اندر ادا کرنا ' اور اُس کے ساتھہ صنایع لفظی ' ترنم اور دوسرے قاعدوں کی پابندی کو کبھی ہاتھہ سے نہ دینا اِنھیں بزرگوں کا حصہ تھا -

اِس انداز تنقید کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ ہر ادیب کا کارنامہ الگ الگ اسی صنعت کے معیاری پہلو سے جانچا جائے - ابتدائی نقاد اپنے ماحول کے سیاسی و معاشرتی اثرات سے بے خبر نہ تھے - مگر اُن کا عقیدہ تھا کہ شاعر کی دنیا مادی دنیا سے جدا ایک الگ شاعرانہ دنیا ہوتی ہے - وہ ارسطو کے قانون سے واقف نہ تھے کہ ادب فطرت کی نقالی کرتا ہے - برخلاف اس کے ان کی دنیا اپنے جذبات کی دنیا تھی - پرانے شاعر سیاسی اور معاشرتی ترقی کو حکمران جماعت کے حصے س چھوڑنے پر راضی تھے - وہ اپنے روز روز کے اندرونی اثرات ' محبت ' صبر ' جفا کشی ' غم و رنج وغیرہ کو ادبی جامہ پہنانے پر قانع تھے اور اُسی کو اپنا مطمع نظر سمجھتے تھے - خوش قسمتی سے اس وقت شاعر اور نقاد میں وہ امتیاز نہ تھا جو مغربی ادبیات میں پایا جاتا ہے - ہر نقاد پہلے شاعر تھا ' اور اور ہر شاعر اپنے اور دوسروں کے کلام کو تنقیدی نظر سے جانچتا

تھا - مشاعروں کے رواج سے اس رویہ کو اور بھی تقویت ہو گئی
تھی کیونکہ وقتاً فوقتاً بہت سے شعرا جمع ہوکر اپنے اور دوسروں
کے کلام کو ایک مستقل معیار سے جانچتے تھے - وہ یہ مطالعہ
کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ کس شاعر نے صنعت کے عمومی
معیار اور شخصی جذبات میں کس حد تک مصالحت پیدا
کی ہے - صنعتی کامیابی کے بعد اُن کی نظر اُن جذبات
پر پڑتی تھی جو کسی شاعر نے ظاهر کیے تھے - لیکن یہ محض
ثانوی بات تھی - وہ جذبات میں کسی قسم کی تمیز اور
تفریق نہیں کرتے تھے - هر شعر اپنے اندر ایک دنیا لیے ہوئے
تھا کیوں کہ هر شعر میں کسی خاص جذبے کو نمایاں ہونے کا
شرف حاصل ہوا تھا - وہ جذبہ کیا تھا ؟ اخلاقی نقطۂ نظر سے
مناسب تھا یا نامناسب ؟ کوئی نیا جذبہ تھا یا پرانا جذبہ ؟
اور وہ بھی نئے انداز سے ظاهر کیا گیا تھا یا پرانے ؟ یہ سب
سوال ان کی نگاہ میں ثانوی حیثیت رکھتے تھے - " شخصی
جذبہ کا صنعتی اظہار '' صرف اِتنی بات اُن کے پیش نظر
تھی - اُردو شعرا ، اخلاقی کہانیاں نہیں کہتے ' سیاسی مسائل
کا حل نہیں پیش کرتے ' اور نہ اپنی معاشرتی کیفیت کا رونا
روتے ہیں - اُردو کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے شاعر
میں یہ خصوصیت موجود ہے - اُن کا خطاب انسان کے صرف
اُس شعبۂ حیات سے ہے جسے احساس حسن کہتے ہیں -
جو جذبات سے متاثر ہوتا ہے ' اور جو لفظی پیرائے (ادب) میں
حسن کی تشکیل کو دیکھ کر اُسی قدر محظوظ ہوتا ہے جتنا
رنگین پیرائے (مصوری) میں یا صوتی پیرائے (موسیقی) میں '
یا سنگین پیرائے (بت تراشی) میں دیکھ کر -

اُن تذکرہ نویسوں کے نام گنانا، جنھوں نے ادبی تنقید کی عمارت کھڑی کی بے ضرورت ہے - لیکن یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ تنقید کی اِس پہلی منزل کی سب سے اعلیٰ مثال ہم کو ایک اجنبی ملک فرانس کے نقاد میں ملتی ہے - میرا اِشارہ گارساں دتا سی کی طرف ہے - اِس نقاد میں، شاید اِس سبب سے کہ وہ مقامی تعصبات سے بالکل الگ تھا، اُردو شعرا کی سچی قدر کی صلاحیت تھی - اُس کی تنقیدیں فن عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں، کیوں کہ اُس نے نہایت خوبی سے ہر شاعر کی صنعتی اور شخصی خصوصیتیں ہمارے سامنے پیش کی ہیں -

اِس اولین طریقۂ تنقید میں (جس کو معیاری تنقید کے نام سے پکارنا نا مناسب ہو گا) اگر بہت سی خوبیاں تھیں تو دوسری طرف خرابی کے جراثیم بھی تھے - شخصی تنقید کے زیراثر ایسے گروہ میں جس میں ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا ہو، اور روزمرہ آپس میں سابقہ بھی پڑتا ہو، رشک اور تعصب کی بہت گنجائش ہے - یہ عناصر اُس وقت خاص طور سے بڑھ گئے جب شاعری دربار میں رسائی کا ذریعہ بن گئی اور درباری رسوخ کی کشمکش میں رشک و حسد کی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں - اِس درباری عنصر سے شاعری کے معیار میں اُتنی تبدیلی نہیں ہوئی جتنا تنقیدی روح میں انقلاب پیدا ہوا اور تنقید بجائے معیاری انصاف کے تقریظ و نکتہ چینی کا مجموعہ بن گئی -

لیکن سب سے بڑی کمزوری جو اِس تنقیدی انداز میں تھی وہ پیرایہ بیان کا مضمون اور جذبات سے الگ کر دیکھنا تھا - امتداد زمانہ سے پیرائے اور جذبات میں اِس تفریق کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری رفتہ رفتہ جذبات کو بالکل بھول کر ضلع جگت

اور لفظی رعایتوں کی بھول بھلیاں میں گرفتار ہو گئی - فنی دنیا میں پیرائے کو جذبات سے جدا کر دینا فن کی اصلی روح کا خون کر دینا ہے - رفتہ رفتہ جب جذبات کے پرانے سر چشمے خشک اور مسدود ہو گئے تو شاعری ایک صدائے بازگشت بن کر رہ گئی - اور روحانی کیفیات کے ساتھہ جدّت اور اختراع کا بھی خاتمہ ہو گیا -

آزاد کا نام تنقیدی دنیا میں اِس لئے ممتاز ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے فنی کارناموں میں وقت کا تسلسل محسوس کیا - اُنھوں نے یہ دریافت کیا کہ ادبیوں میں ایک گہرا سلسلہ ہوتا ہے جو خود بخود محض وقت کے گذرنے سے پیدا ہوتا ہے - اُنھوں نے اُردو شعرا کے گروہ معین کیے اور ایک حد تک ادب کے تاریخی ارتقا کی اپنے دلچسپ پیرائے میں تفتیش کی - اُن کا انداز تنقید معیاری تھا اور اسی سبب سے اُن کا تنقیدی کارنامہ ' پیرایۂ بیان کے کمال سے قطع نظر ' آج کل بڑی حد تک بے وقت کی راگنی ہو گیا ہے - مگر اُن کا ذاتی احساس اتنا نازک اور تیز تھا کہ اُن کے بعض تنقیدی آرا کو ابدی حیثیت حاصل ہو گئی ہے -

غدر کے بعد علیگڈھ کی تحریک کے وقت سے انگریزی ادب کا وہ اثر زباں پر پڑنے لگا جس کے بارے میں کوئی یکطرفہ رائے دینا ناممکن ہے - اِس نئے اثر کے سب سے ممتاز علم بردار تنقیدی دنیا میں حالی ہیں - مگر خود حالی کے انداز میں کسی یکسانیت کی تلاش بے کار ہے - ایک طرف اُن کے ذہن پر اُن اصولوں کا اثر تھا جو اُنھوں نے غیر پختہ طور پر انگریزی

زبان سے اخذ کیے تھے - دوسری طرف خود اُن کا ذاتی احساس اُن کو تدامت پسندی پر مجبور کرتا تھا - یہ کہنا صحیح ہے کہ جہاں تک انفرادی معاملات کے سمجھنے اور اُن پر فیصلہ صادر کرنے کا تعلق ہے حالی سے کوئی برتر نہیں - مگر جب وہ ادب کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کرنے پر آتے ہیں تو اُن کا ساتھ نہ دینا ہی بہتر ہے -

حالی کی اِس کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ شخصی اور معیاری انداز، تنقیدی دنیا پر حاوی رہا - جن شخصیتوں سے اِس کی اُمید ہو سکتی تھی کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے کوئی مستقل شمع ہدایت چھوڑ جائیں گی، اُن کی یادگار صرف وہ ذاتی آراء ہیں جو حالی کی ذات کے ساتھ مخصوص تھیں اور جن کا احیاء شاید کسی دوسری ہستی سے ممکن نہیں -

بیسویں صدی کی ابتدا میں تنقید کے حدود اِس اعتبار سے وسیع ہوگئے تھے کہ اب تنقیدی نظریں شاعری کے علاوہ ادب کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑنے لگی تھیں - جنگ عظیم کے بعد قومیت کے اثرات اور طلبہ کے مطالبے نے ادبی تاریخ کی جانب توجہ منعطف کی - اور لوگوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بہت سی اچھی کتابیں ادبی تاریخ پر لکھیں - جن میں ادب کی ترقی بخوبی واضح کی گئی - لیکن تنقیدی اصولوں میں نئے عناصر صرف عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد پیدا ہوئے ہیں - عثمانیہ یونیورسٹی کے بے ہونہار طلبہ نے اردو ادب میں تنقیدی ذخیرے کی کمی کو بخوبی محسوس کیا اور تنقیدی نظریے کی ایک نئی عمارت تعمیر کرنی چاہی - ان کی نظر

دراصل انگریزي پر زیادہ گہري ھے - اُدھر فرانسسي نقاد ٹین (Taine) کي '' تاریخ ادب انگریزي '' نے یہ امر واضح کردیا تھا کہ انگریزي ادب ماحول کے اثرات کا نتیجہ ھے - ٹین نے ادب کي تخلیق کے اسباب سب سے زیادہ تاریخي اور معاشرتي حالات میں تلاش کئے ھیں - یہ نظریہ اُن طبیعیوں کے خیالات کا پرتو ھے جو انساني روح کو مادی اثرات سے متاثر دیکھتے ھیں - اِسي زمانے میں اردوے قدیم کے متعلق تازہ انکشافات نے تاریخي تسلسل اور ماحول کے اثرات کو نئي اھمیت دے دي اِسي کا یہ اثر ھے کہ حیدرآباد کے نئے نقاد ادب کے ھر کارنامے کے پس پشت ماحول کا مطالعہ کرنا چاھتے ھیں -

ایک دوسرا کام ادبي شعبوں کا مطالعہ ھے - یعني ادب کو چند محدود شعبوں میں تقسیم کرکے ھر شعبے کے تاریخي ارتقا کا مطالعہ - اِس میں شک نہیں کہ فکر و مطالعہ کے یہ دونوں طریقے اب تک رائج نہ تھے - ماحول کے اثرات بلا شُبہ زبان پر پڑتے ھیں اور مثل دیگر موضوعات کے ادب کے ساتھ بھی ایک تاریخي دلچسپی وابستہ ھوتی ھے - ادبی ارتقا کو عام فہم بنانے کے لیے یہ بھی ضروري ھے کہ عہد بہ عہد ترقي کے منازل لوگوں کے سامنے لائے جائیں - ادب کو مختلف شعبوں میں تقسیم کردینے سے بھی ' ظاھر ھے کہ ' ارتقا کا مطالعہ آسان ھوجاتا ھے ' اور طلبہ کو اُس کا سمجھنا دشوار نہیں رھتا - اِس نقطۂ نظر سے کہ ھمارے نئے نقاد اب ایک نئے راستے پر چل رھے ھیں جو پرانے راستے سے بہر حال بہتر ھے ' اور ادبی منازل کو عوام‌الناس اور طلبہ کے لیے آسان بنانے کي کوشش کر رھے ھیں ' ان کی کوششیں ضرور قابل تعریف ھیں -

لیکن اصلی تنقید کا مقصد یہ نہیں ہے ' اگر میں یہ کہوں کہ اصلی تنقید کا مطمح نظر اس سے بلند تر ہوتا ہے تو میں کسی طرح شمالی ہندستان کے ادبی مورخوں اور جنوبی ہند کے نئے نقادوں کو کم کرنا نہیں چاہتا - پرانی تنقید کا راستہ چھوڑ کر نئے راستے کی طرف تنقیدی صلاحیتوں کی رہنمائی کرنا کوئی ادنی کمال نہیں ہے - لیکن اِن کوششوں میں ادب اور ادبی تنقید کا اصلی مطمح نظر بھول جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے -

ہمارے بزرگ ' انگریزی نقادوں کے اثر سے مبرا تھے اس امر میں وہ ہم سے بہتر تھے کہ وہ شاعری کا اصلی مقصد سمجھتے تھے - وہ شاعری کو احساس حسن کی تشفی کا ذریعہ سمجھتے تھے - اور اسی لیے خوبصورت سے خوبصورت پیرایہ تلاش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے - ادب اظہار ہے اُس فطری احساس کا جو ہر انسان قلب میں مخفی ہوتا ہے اُس کا مقصد حسن کی تخلیق و تشکیل ہے - ہر شخص کا معیار حسن ذاتی ہوتا ہے - وہ اپنے معیار میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کر سکتا ' وقتاً فوقتاً تاثرات کے لمحوں میں وہ اپنے معیار حسن کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے - اور یہی کوشش ادبی تخلیق کا ذریعہ ہوتی ہے -

اِس لحاظ سے کسی ادیب کے سیاسی اور معاشرتی ماحول کی تفتیش کرنا ادبی نقطۂ نظر سے بیکار ہے - ہم اُن مورخین کے ممنون ہیں جو ہم کو ہمارے پسندیدہ ادیبوں کی نسبت تاریخی مواد بہم پہونچاتے ہیں ٹھیک اُسی طرح جس طرح ہم

اُن مورخین کے ممنون ہوں جو ہمیں کسی قدیم یادگار کے تاریخی حالت سے آگاہ کرتے ہیں - کسی حسین شے کی قدردانی کی اصل وجہہ یہ ہے کہ وہ حسین ہے - ہم کسی تصویر کی اس لیے قدر نہیں کرتے کہ وہ بارھویں یا تیرھویں صدی میں بنائی گئی - بلکہ (فنی نقطۂ نظر سے) اُس لیے قدر کرتے ہیں کہ وہ شے حسین ہے - تاریخی اور خارجی نظریے کا معیار اُن شعرا کی نسبت اور بھی بے رحمی ہے جن کے زمانے میں سیاسی اور معاشرتی احساس بیدار نہ تھا اور جو دنیا سے کنارہ کش ہوکر اِحساس حسن کی پرورش کرتے تھے - میر کے اوپر یہ اعتراض کرنا کہ امور خارجی پر اُن کی نظر گہری نہیں، یہ کس قدر ظلم ہے - میر کو بحیثیت شاعر کے امور خارجی سے کیا نسبت ہوسکتی تھی - اِسی طرح سودا کی نسبت یہ تعریف کتنی بیجا ہوگی کہ وہ اپنے ماحول سے آشنا تھے - نہ ہم میر کی قدر اس لیے کم کرسکتے ہیں نہ سودا کی اس لیے زیادہ، کہ اُن میں ایک دنیادار تھا اور ایک تارک دنیا - ہماری نظر میں تو صرف اُس امر کی وقعت ہے کہ دونوں کے پاس حسیات اور جذبات تھے جن کی اُنھوں نے لفظی پیرائے میں تشکیل کی ہے یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ ہم اُردو ادب کو نہ صرف عہد اور دور میں تقسیم کرتے ہیں، بلکہ ہر دور کے شعرا میں ایک طرح باہمی تصادم کھڑا کر دیتے ہیں - یہ ارسطو کے اُس گمراہ کُن نظریہ کی پیروی کا نتیجہ ہے جسے سب سے پہلے حالی نے اُردو زبان میں داخل کیا یعنی "شاعری نقالی کو کہتے ہیں" - اِس نظریے کی موجودگی میں ہر ادیب اور شاعر کے ساتھ انصاف کرنا قریب قریب ناممکن ہے - اُن شعرا کی کوشش

جلیوں نے عشق مجازی، معاملہ بندی اور واقعہ نگاری پر قناعت کی اُتنی ہی قابل قدر ہے جتنی اُن شعرا کی جنہوں نے اِس عارضی زندگی کے حدود سے پرواز کر کے عشق حقیقی تک پہونچنے کی کوشش کی -

ادب کو دور اور عہد میں تقسیم کرنا نہ صرف فنی گناہ ہے بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح بھی نہیں ہے - وہ کون سے اجزا تھے جو دہلی کے شعرا کے پہلے دور میں پائے جاتے تھے اور جو غالب اور ذوق کے دور میں نہ تھے - لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا جداگانہ تصور کرنا ایک اہم اصول بن گیا ہے گہری تحقیق سے یہ واضح ہے کہ لکھنؤ کے بہت سے شعرا میں کسی طرح دہلی کے شعرا سے تمیز نہیں کی جا سکتی - آتش اور مصحفی کے اشعار مسلمہ طور پر اُس رنگ میں ہیں جسے دہلی کا رنگ کہا جاتا ہے - خود ناسخ اور انشا کے کلام میں اس خاص رنگ کی کمی نہیں - عہد اور زمانے کی تقسیم ہر حیثیت سے گمراہ کن ہے اور ادب کی نسبت غلط تاثرات پیدا کرتی ہے - حقیقی شاعری کسی خاص شخصیت یا زمانے کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ وہ تمام انسانوں کا حصہ ہے اور ہر انسان اپنے انداز میں اپنے جذبات اور احساسات کو ادا کرنے پر قادر ہے -

لہذا تمام خارجی اور بیرونی اثرات سے قطع نظر، ادب کی تفتیش، تشکیل حُسن کی تفتیش ہے لیکن حسن صرف پیرائے پر مبنی نہیں - پیرایہ خواہ لفظی ہو یا رنگین، صوتی ہو یا سنگین، اُن تاثرات کا مظہر ہے جو فن‌کار کے ذہن میں واضح

ہوتی ہیں - پیرایہ صرف اُن اندرونی تاثرات حسن کے تعین کا
نام ہے ' اور اُن سے الگ نہیں - شاعر کے ذہن میں جو
تاثرات ہوتے ہیں اُن کا لفظی جامہ صرف ایک ہے - اور شاعر
اُن تاثرات کو نمایاں کرتے وقت اُنہیں وہی لفظی جامہ پہنا
دیتا ہے - یہ ظاہر ہے کہ جامہ و پیرایہ کا مطالعہ بذات خود
کوئی شے نہیں - پیرائے کی خوبصورتی صرف اِس پر موقوف ہے
کہ کتنی موزونیت کے ساتھہ اُن اندرونی تاثرات کو جو بے رنگ
و بے صورت ہیں واضح اور نمایاں کرنے میں کامیابی ہوئی ہے ۔

اگر ہم اِس بحث کو یہیں ختم کر دیں تو ہر نقاد کو ہ
ادیب پر یہ اعتراض کرنے کا حق ہو جائے گا کہ اُس کا پیرای
اُس کے تاثرات کے لیے موزوں نہیں - مگر سچ یہ ہے کہ کسی
دوسرے آدمی کو کسی شاعر یا فن‌کار پر یہ اعتراض کرنے کا حق
حاصل نہیں - ادیب کے ذہن میں جو تاثرات تھے اُن سے سوا
اُس کے اگر کوئی اور واقف ہے تو وہ خدا ہی کی ذات ہے
اس امر کا پورا اندازہ شاعر ہی کر سکتا ہے کہ اُس کے وقتی
تاثرات کس پیرائے میں بہترین طریقے پر ادا ہو سکتے ہیں
ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے تاثرات کے یقین
میں کوئی دوسرا شریک کار ہو - یہ صرف ادیب کا فرض ہ
اور وہی اِس کو بوجہ احسن انجام دے سکتا ہے - ہمہ
کام اُس کو مشورہ دینا نہیں بلکہ اُس کی کارفرمائی کو عقید
کے ساتھہ قبول کرنا ہے -

اگر ہم اپنی اِس حیثیت کو قبول کرلیں کہ صرف ادیہ
ہی اپنے تاثرات کا اندازہ لگا سکتا ہے اور وہی اپنے تاثرات کو پیر

دیئے کا مستحق ہے ' تو اِس کا ایک لازمي نتیجہ یہ ہوگا کہ
ادب کے اصناف کی تقسیم لا یعني بات ہو جائیگی - نثر
اور نظم میں امتیاز ' آپ بیتي اور جگ بیتی کا فرق ' ایام قدیمہ
کی باتیں ہیں - جس وقت طباعت اور اشاعت کا انتظام نہ
تھا اُس وقت وزن اور قافیہ اشعار کو ذہن نشین کرنے میں مدد
دیتے تھے - وزن اور قافیے کے سہارے نظم لکھنا سہد ہی رواں
نثر لکھنے سے بدرجہا آسان ہے - اِسی سبب سے قریب قریب ہر
ملک میں زبان کی ابتدا نظم سے ہوئي ہے - اور نثر نے بعد
میں ترقی پائی ہے - لیکن یہ تفریق کسي اصولي امتیاز پر
مبنی نہیں بلکہ جبری و استبدادی ہے - فن دراصل تشکیل
حسن کا نام ہے خواہ یہ تشکیل حسن ' قواعد وزن و قواعد کے
حدود میں رہ کر حاصل کي گئي ہو یا اُن کے بغیر - آخر
آزاد کی نثر نگاری کا اثر کسي شاعرانہ کارنامے کے اثر سے کس طرح
مختلف ہے ؟ - سجاد حیدر کي سامعہ نوازیاں کسي شاعر کي
موسیقیت سے کس طرح کم کہي جا سکتی ہیں ؟ -

اگر ہم ایک بار اِس کو سمجھہ کر تسلیم کرلیں تو ہمارے
ادبیات میں بہت سے تنقیدي مشکلات کا خاتمہ ہو جاے گا -
سب سے پہلي بات یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں کو اُن سخت قیود
سے نجات مل جائے گی جن میں قدیم بزرگوں کي اِس معیاري
تنقید نے اُن کو مبتلا کر رکھا ہے کہ کوئي ایک مخصوص پیرایہ
صرف ایک خاص تاثر کے ادا کرنے کے لیے موزوں ہے - ایسے زمانے
میں ہمارے ادیبوں کي نظر وسیع ہوتي جا رہي ہے ' اُن کے
جذبات میں تلا طم اور اُن کے رجحانات میں کشمکش برپا ہے '
اُن کو اِ س بات کي آزادي مل جائے گی کہ وہ نئے پیرایوں میں

تجربے کریں اور جو پیرائے اُن وقتی تاثرات کے لیے خاص طور سے موزوں ہوں اُن کو انتخاب کر سکیں -

لیکن مستقبل کی بحث ہمارے موجودہ حدود سے باہر ہے - اِس وقت ہماری نظر صرف ادب کے ماضی پر ہے - ہمارے ادبی مورخین نے نہ صرف نظم اور نثر کو الگ کر کے ایک دوسرے سے بے تعلق کر دیا ہے بلکہ اِس کے علاوہ نثر میں ناول اور ڈراما وغیرہ کی بھی الگ الگ شاخیں کھڑی کردی ہیں - اُسی طرح نظم میں ' غزل ' قصیدے ' مثنوی اور مرثیے وغیرہ کی علحدہ علحدہ تقسیم قائم کردی ہیں - طلبہ اور عوام کی نگاہ میں شاید یہ تقسیمیں کسی حد تک آسانی کا موجب ہوتی ہوں - مگر فنی نقطۂ نظر سے اِس تقسیم در تقسیم کا مفہوم یہ ہے کہ حسن کے بھی اُتنے ہی ٹکڑے کر دئے گئے - جب تک ہم حسن کے اتحاد و وحدت پر ایمان نہ لائینگے اُس وقت تک ہمیں اِن تنگ قیود سے نجات نہیں مل سکتی - اِسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میر کی نسبت بہ حیثیت مثنوی نگار کے الگ رائے قائم کرتے ہیں ' بحیثیت غزل گو کے الگ ' اور قصیدے میں اُن کی حیثیت بالکل ہی دوسری تسلیم کرتے ہیں - کیا یہ ممکن ہے کہ وہی شاعرانہ شخصیت اِس قدر سیمابی ہو کہ ایک لمحے میں تو ہم کو بےحد محظوظ کر سکے اور دوسرے ہی لمحے میں یکایک ایسی پستی میں گر جائے کہ ہم سے معمولی پسندیدگی کا اعتراف بھی نہ کراسکے ؟

میرؔ کی شخصیت ایک تھی ' غالب کی شخصیت ایک ہی ' اور اقبال کی شخصیت بھی ایک ہی ہے - یہی انفرادی

شخصیت ہر رنگ میں ظاہر ہوتي ہے ۔ ہر لمحے کے گذرنے
کے ساتھہ اِس انفرادي شخصیت کے تاثرات بھي بجلي کي سرعت
کے ساتھہ بنتے اور بگڑتے ہیں ۔ بعض تاثرات تو لفظ و بیان کي
قید میں آئے بغیر گلدستۂ طاق نسیاں بن جاتے ہیں ۔ مگر
دوسرے جو زیادہ اہم تھے یا اِس لیے کہ وہ الفاظ کے پیرائے میں
واضح اور متعین ہو گئے وہي ہمارا ادبي سرمایہ ہیں ۔ کبھي
وقتي تاثر کي مطابقت میں وہي شخصیت مثنوی میں ظاہر
ہوتي ہے ' کبھي قصیدے میں ' کبھي غزل میں ' اور کبھی نظم
کو بالکل چھوڑ کر نثر کی طرف مائل ہو جاتی ہے ۔ مگر ہر
حالت میں وہ شخصیت ایک ہی رہتي ہے ۔ اُس شخصیت نے
وقتي تاثرات کو جو پیرایہ موزوں ترین سمجھا وہ بخش دیا ۔
ہمیں کوئي حق نہیں کہ اُس کي شخصیت پر خارجي قیود
عاید کرکے تاثرات اور پیرائے کے سچے توافق میں رخنہ
اندازی کریں ۔

ہماري ساري توجہ اِس طرف منعطف ہونی چاہیے کہ ہم
ادیب کي اندرونی شخصیت کو پہچانیں ' اس کے رجحان طبع
کا مطالعہ کریں - اور اُس کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش
کریں - فنی نقطۂ نگاہ اُس کے معاشرتی اور سیاسي ماحول سے
بے پروا ہے ۔ اِس کا مطالعہ مورخوں کا کام ہے ۔ بہ حیثیت ادبی
مورخ کے ہمارا فرض یہ ہے کہ اپنے مطالعے کا مرکز ادیب کے
روحاني تاثرات کو بنائیں جنھیں اُس نے مختلف پیرایوں میں
واضح کیا ہے ۔

اِس طرز مطالعہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم تعریف و
تنقیص دونوں سے ہٹ کر ادب کا بہ حیثیت فن کے مطالعہ

کر سکینگے - پس صورت میں، ادیبوں میں باہم مقابلہ و موازنہ کے ناگوار فرائض بھی ہمارے ذمّے نہ ہونگے - اسلیے کہ فن کی دنیا میں کوئی کسی سے بہتر و برتر نہیں ہوتا - ذاتی طور پر بعض ادیب ہمارے محبوب اور بعض غیر محبوب تو ہو سکتے ہیں - مگر فنی نقطۂ نظر سے کوئی محبوب اور کوئی غیر محبوب نہیں رہ سکتا - ہر انسان کے تاثرات، روحانی دنیا میں یکساں قیمت رکھتے ہیں - ہر شخص کے تاثرات اُس وقت تک عظیم اہمیت رکھتے ہیں جب تک وہ پُر خلوص اور سچے ہوں - صرف اسی حالت میں ہم اپنے ذاتی تعصبات و رجحانات کو چھوڑ کر اور قدما کے عائد کیے ہوئے قیود اور پابندیوں سے قطع نظر کر کے، ادب کو فنی نقطۂ نظر سے جانچ سکینگے اور سچ پوچھیے تو اُسی وقت ہم سچی تاریخ ادب بھی مرتب کر سکیں گے -

اس تاریخ ادب کی منطقی ترکیب کیا ہوگی ؟ ہم جغرافیائی اور مقامی تعصبات کو چھوڑ کر اردو زبان کے ہر ادیب کو وقت کے تسلسل کے ساتھ ترتیب دے کر اُس کے فنی نقطۂ نظر کا تعین کرینگے - اس طرح اردو کے پہلے ادیب سے لے کر آخری ادیب تک کی شخصیتوں کے تنوع اور پھر اُن کی جدت آفرینیوں کا مطالعہ کر سکینگے - ہم ادب کی تقدیم اور تقسیم در تقسیم سے نجات پاکر خالص ادبی آسمان میں ہر ادیب کے لیے جگہ محفوظ رکھینگے - ہم اولین ادباء مثلاً نصرتی، نشاطی اور وجہی کو ایک نگاہ سے جانچ کر اس امر کا فیصلہ کر سکینگے کہ کیوں ایک نے اپنے تاثرات کے مطالعے کی بنا پر کبھی مثنوی کو ذریعۂ اظہار بنایا کبھی مرثیے اور کبھی غزل کو - دوسرے نے کیوں نظم کی تمام قسمیں چھوڑ کر نثر کو ترجیح دی - اس طرح جغرافی

کی تمام صورتوں - غزل ' مثنوی ' قصیدے ' مرثیے' نثر وغیرہ کی اهمیت بهی باقی رهیگی - مگر بذات خود نهیں بلکہ اُن تاثرات کی نسبت سے جن کے اظہار کا وہ ذریعہ هوئے هیں - اِس طرح یہ معلوم هوجائیگا کہ پیرائے کی مختلف شکلیں کبهی الگ سے موجود نهیں تهیں - اور بذات خود اُنهیں اهمیت حاصل نهیں هے ' بلکہ وقتاً فوقتاً جیسے جیسے تاثرات میں تنوع اور باریکی پیدا هوتی گئی اُسی کے ساتهہ موزوں پیرایہ بهی استعمال میں آتا گیا - غرضکہ تمام شعبوں کی ابتدا اور ترقی اِس حیثیت سے واضح هو جائیگی - نظم کی کسی خاص صنف ' نثر یا ناول کی ابتدا اور ترقی کا سبب یهی تها کہ خود انسانی روح میں ترقی هو رهی تهی - رفتہ رفتہ پرانے اصناف ناکافی ثابت هوتے گئے - نئے نئے خیالات ' نئے نئے جذبات اهمیت حاصل کرتے گئے اور اُن کی مطابقت میں نئے نئے پیرائے بهی رائج هونے لگے -

اِس طرز نظر سے امید هے کہ دلچسپی کا مرکز بیرونی عناصر سے هٹ کر داخلی عناصر کی جانب منتقل هو جائیگا - هم بجائے خارجی حالات اور خارجی طرز ادا کے ' ادیبوں کے رجحانات کا مطالعہ کرینگے - یہ صحیح هے کہ خارجی کائنات سے بعض رجحانات زیادہ متاثر هوتے هیں اور بعض کم - مگر یہ فرق اُن میں مدارج قائم کرنے کا ذریعہ نهیں هوسکتا - هر شخصیت بذات خود یکساں اهمیت رکهتی هے -

اِس طور پر یہ بهی واضح هو جائے گا کہ کس طرح امتداد زمانہ کے ساتهہ ذاتی شخصیتوں میں وسعت پیدا هوتی گئی -

یہاں تک کہ آج پرانے پیرائے ایک بار پھر ناکافی ثابت ہو رہے ہیں - اور نئے پیرایوں کے اختراع کی جانب ایک دفعہ پھر لوگوں کی توجہ منعطف ہو رہی ہے - اِس صورت میں ادب کے بارے میں ہمارا یہ زاویۂ نگاہ ہمیں قدامت پرستی کے تعصبات میں مبتلا ہونے نہ دیگا - اور ہم زیادہ صبر اور خوشی کے ساتھ ادب کی نئی ترقیوں کو دیکھنے کے لیے تیار ہو جائیں گے -

جس نظریہ کا میں نے تذکرہ کیا ہے اُس پر اٹلی کے مشہور فلسفی کروچے کا بہت بڑا اثر ہے - لیکن یہ میرا نہایت پختہ خیال ہے کہ اگر ادب اور تنقید کو پرانے راستوں سے نکال کر نئے راستوں پر لانا ہے اور اُسے نیچی سطح سے اُٹھا کر بلندی پر دیکھنا ہے ' تو اِس نظریہ کے قبول کرنے سے چارہ نہیں ہے - ادب ' فنون لطیفہ کی شاخ ہے اور اُس کا صحیح مطالعہ صرف فنون لطیفہ ہی کی طرح کیا جا سکتا ہے -

---

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ
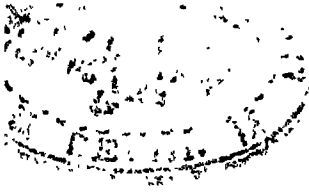
جلد ۳ } بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۳ع { حصہ ۳

اردو کے اولین قصے

(دکنی قصہ گوئی کا زرّیں عہد)

(از مسٹر عبدالقادر سروری ایم - اے مؤلف جدید شعری)

ناول اور افسانے کے ارتقا کی تاریخ میں قصے کی کوئی خاص شکل اور ادبی صورت ہمارے مد نظر نہیں ہوتی - بلکہ درحقیقت یہ انسان کے قدیم ترین جذبے ' قصہ گوئی کے ارتقائی سرشتے کی تلاش ہے - قصے کی ادبی صورتیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں - چنانچہ جارج سینٹس بری نے انگریزی قصہ گوئی کے ارتقا کا خاکہ[1] کھینچنے کے سلسلے میں اسی اصول کو مد نظر رکھا ہے -

---

۱ - ملاحظہ ہو ' کتاب " دی انگلش ناول " -

وہ انگریزی افسانوں کا آغاز اُن قدیم ترین منظوم تحریروں سے کرتا ہے ' جن میں کوئی قصہ نما واقعہ موجود ہے - اس لحاظ سے نارمنوں کی فتح انگلستان کے بعد سے پندرھویں صدی تک منظوم انسانوں کا زمانہ قرار پاتا ہے - شاہ آرتھر اور اس کے سورما نائٹس[۱] سے متعلق نظمیں اور اسی طرح کی چند دوسری منظومات انگریزی زبان کے اولین افسانے شمار ہوتے ہیں -

انہیں اُصول کو اپنا رہنما بنا کر جب ہم اُردو افسانوی ادب کو ٹٹولتے ہیں تو یہاں بھی قصہ‌گوئی کے جذبے کے ارتقا کی کم و بیش وہ تمام صورتیں موجود ملتی ہیں جن کا مشاہدہ دنیا کی اکثر زبانوں میں کیا گیا ہے اور جن کی بدولت ہم قصے کے ارتقا کے چند عام اُصول مدون کرنے کے قابل ہوسکے - لیکن یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ اُردو کی پیدائش ہماری قومی زندگی کے جس مرحلے پر ہوئی اُس وقت تک حیات قومی کی چند منزلیں طے ہو چکی تھیں - اس میں شبہ نہیں کہ زبان کی تعمیر ' قوم کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیے - لیکن اُردو کی پیدایش اور ارتقا کی شکل خاص ہے - یہ کئی ترقی یافتہ ادبی زبانوں کے اثر کے تحت بنی - اور ایسے وقت بنی جب کہ اس کے پیدا کرنے والے ابتدائی شائستگی کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے - .اور ایسے ملک میں بنی جو عرصۂ‌دراز سے مختلف اور اپنی اپنی مخصوص تاریخ رکھنے والی قوموں کا وطن رہ چکا تھا - ان چیزوں کا اثر زبان پر

---

۱ - Knights

بہت پڑتا ھے - پہلی چیز کا اثر اُردو پر یہ ھوا کہ اس کو بعض غیر فطری سانچے اظہار خیال کے مل گئے - لیکن ساتھ ھی ساتھ وہ بہت جلد ادبی معیار پر پہونچ گئی - دوسری چیز کا اثر اس طرح ظاھر ھوا کہ اس کی ابتدائی حیات ان فکری مرحلوں سے نہیں گزرسکی جن سے دنیا کی اکثر زبانیں گزرتی آئی ھیں - اُردو کی اولین تحریریں بھی فکری اعتبار سے آپ کو کافی وزنی نظر آئیں گی - اثرات کے اسی اختلاف نے اُردو کے رجحانات کو آج بے حد پریشان و پراگندہ کر رکھا ھے -

اردو قصے کی ابتدا ھم اُس اولین تحریر سے شمار کرینگے ' جس میں قصے کی دلچسپی کسی حد تک موجود ھو - اُردو میں مربوط تحریروں کے شروع ھونے کے ساتھ ھی افسانے لکھے جانے لگے - اولین آثار جو گجرات ' دکن اور پنجاب میں دستیاب ھوتے ھیں ' وہ زیادہ تر اقوال ' ملفوظات ' ارشادات اور مصرعوں پر مشتمل ھیں - چونکہ ایشیا میں مذھب کا جذبہ قوی تر رہا ھے ' اس لیے اردو کے آفرینش میں ھم کو بہت سے چھوٹے چھوٹے مذھبی اور متصوفانہ رسالے مل جاتے ھیں - لیکن اردو شاعری کی باضابطہ ابتدا کے ساتھ ھی اردو افسانوں کا بھی آغاز ھوا -

دنیا کی اکثر زبانوں میں قصّوں کی ابتدا قوم کے سورماؤں کی مہمات سے ھوتی ھے یہ مہمات رفتہ رفتہ مبالغہ آمیز اور نیم حقیقی صورت اختیار کرلیتے ھیں - طبعی قوت کے بل بوتے پر زندگی گزارنے کے اِستیعج سے انسان جب آگے بڑھتا ھے تو سب سے زیادہ قوی کشش اس کو حسن و عشق کے متعہد

و غریب واقعات میں نظر آتی ہے اور یہی عجیب وغریب واقعات مبالغہ کی صورت اختیار کرتے کرتے مافوق الفطرت بن جاتے ہیں - لیکن جیسا کہ مغرب کی اکثر زبانوں کی اصطلاح " ہیرو " یا سورما سے ظاہر ہے قصے مہمات کی منزل سے آگے بڑھنے اور حسن و عشق کی سرحد تک پہونچ جانے کے بعد بھی اپنے اصل شخص کے لیے " ہیرو '' ہی کی اصطلاح پر قرار رکھتے ہیں - چنانچہ عاشقانہ قصوں ناول اور ڈراما غرض قصے کی ہر صورت میں اصلی شخص قصہ کا قدیم ترین نام اب بھی برقرار ہے اور ہندوستان کی اکثر زبانوں میں یہ انگریزی کی توسط سے پہنچ کر عام ہوگیا ہے قدیم ترین رزمیہ قصے کا شخص قصہ درحقیقت " ہیرو '' یا سورما ہوتا تھا - لیکن بعد میں اس کا یہ لقب ایک تاریخی یادگار کے طور پر باقی رہ گیا -

رزمیہ قصے افسانوی ادب کی اولین شکل ہیں اور یہ قوم کی حیات میں اس خاص نفسیاتی موقع پر پیدا ہوتے ہیں ، جب اس میں زندگی کی پہلی لہر اٹھتی ہے - فارسی کا لازوال کارنامہ " شاہنامۂ فردوسی " اور اس کی معاصر رزمیہ داستانیں اس وقت پیدا ہوئیں جب عربوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کو اپنی قوم کی از سر نو تعمیر کا احساس ہوا - لیکن اردو کے اولین قصے اس وقت پیدا ہوئے جب ہندوستان اس نفسیاتی موقع سے آگے گزر چکا تھا - بلکہ حقیقت میں ان قصوں کو پیدا کرنے والی فضا یعنی مغل ہندی شائستگی اپنی ارتقائی زندگی کے آخری لمحات ختم کررہی تھی - ایسا زمانہ عموماً بے فکریوں اور بزم آرائیوں کا ہوتا ہے - اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان

کی بھی حالت تھی - ایسے موقعے پر جو قصے پیدا ہونگے ظاہر ہے کہ سوائے " بزمیہ " اور عشقیہ داستانوں کے کچھ اور نہیں ہو سکتے چنانچہ اُردو افسانوں کے ارتقا کا مطالعہ ہم کو سب سے پہلے بزمیہ مثنویوں سے مقابل کرتا ہے -

اس اولین حالت میں بھی اُردو قصے اپنی محدود فضا کے اندر ایسے متنوع ' بسیط اور دلچسپ ہیں کہ ان کی عمر کا اندازہ کرتے اس طرح کی مثال ملنی مشکل ہے اس کا سبب فضا کی وہ پختگی ہے جس میں یہ قصے پیدا ہوئے اور ادبی احساس اور معیار تخیل کی وہ بلندی ہے جو فارسی ادب اور فارسی قصوں سے اس نو خیز زبان کو ترکے میں ملی تھی -

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی اکثر زبانوں میں نظم کی آفرینیش ' نثر سے پہلے ہوئی ہے - اردو میں امیر خسرو اور سعدی جیسے فارسی گو شاعروں کے تفریح طبع کے فارسی ہندی اشعار کو چھوڑ کر ' لسانی اعتبار سے نظم و نثر کے آثار پہلو بہ پہلو ملتے ہیں تاہم ادبی زبان کے متعلق ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا کی دوسری زبانوں کے کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے - نظم اور شعر کی سحر طرازیاں نہ صرف ہمارے اسلاف کو مسحور کرنے میں کامیاب ہوئیں بلکہ آج تک ہمارے درمیان بھی انہیں بزرگوں کے ذوق کی تخم کاریاں بارآور ہو رہی ہیں - اردو کے اولین مصنفین میں مربوط ادبی نظم لکھنے کی جب صلاحیت پیدا ہوئی تو سب سے پہلا موضوع جو اُنہیں ملا وہ افسانہ تھا -

اولیں اردو قصے زیادہ تر دکن کی پیداوار ہیں - کچھ گجرات میں بھی لکھے گئے - پنجاب اور شمالی ہند میں قصے

دکن کے ایک سو سال بعد لکھے گئے - اردو میں قصے کی شکل
کی کوئی چیز ہم کو سب سے پہلے گجراتي زبان میں ملتی ہے -
عہد اکبر سنہ ۱۵۸۶ع میں گجرات کے ایک صوفی بزرگ
خوب محمد نے "خوب ترنگ" کے نام سے مولانا رومی کی طرز
پر ایک مثنوی گجراتي اردو میں لکھی تھی - یہ مثنوی اب
نہ صرف زبان کی قدامت کی وجہہ سے ادق بن گئی ہے بلکہ
اس کے مطالب بھي "مثنوي رومی" کے سے عام فہم نہیں
ہیں - جس طرح مولانا رومي نے اخلاق و تصوف کے مسائل
کی وضاحت قصوں کے ذریعے کی ہے خوب محمد نے بھی
چھوٹے چھوٹے قصے ' جن میں سے بعض بے حد اُبجي ہیں ؟
مسائل کی تفہیم کے لئے لکھے ہیں - اِن مختصر قصوں میں
سے اکثر تو صرف تمثیلي حیثیت رکھتے ہیں لیکن چند اہم ہیں -
خصوصاً چین اور ایران کے مصوروں کا قصہ اور شیخ چلی کے
مکان کے روٹھ جانے کا قصہ[1] اُردو مختصر قصوں کي بہترین
پیداوار سمجھے جاسکتے ہیں - اُن قصوں میں کوئي بات
فوق الفطرت نہیں ہے - اس کے باوجود یہہ موجودہ زمانے کے
دلچسپ ترین اُردو مختصر قصے سے کسی طرح کم نہیں ہیں -

گجرات کے بعد ہماری دلچسپي کا مرکز دکن کی سرزمین
میں منتقل ہو جاتا ہے ' جہاں حکومت دھلي کي طبعی سے
زیادہ سیاسي کمزوري نے کئی اسلامی سلطنتیں قائم کردي تھیں -
ان سلطنتوں میں سب سے زیادہ اہم بیجا پور کی عادل شاہی

---

۱ - اس قصے کو ایک صاحب " حاتم " نے جدید صورت میں لکھا ہے
جو " حسن کار " (حیدر آباد دکن) جلد ۱ میں شایع ہوا -

سلطنت اور گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت ہے - یہہ دونوں سلطنتیں دکن کی قدیم ہندوی فضا میں ایرانی حسن کاری کا مذاق لئے ہوئے تقریباً ایک ہی زمانے میں یعنی گیارھویں صدی ہجری کے آغاز کے قریب قائم ہوئیں - اور کم‌وبیش دو سال تک آئندہ ہندوستان کے ادبی مطمح نظر کے لئے ہند ایرانی ادب اور حسن کاری کے نفیس نمونے تیار کرتی رہیں - ایک طرف تو یہہ اپنی پیش‌رو، دکنی اسلامی سلطنتوں کے ادبی ترکے کو گرہ میں باندھے ہوئے ہیں - دوسری طرف مغلوں کی مخصوص حسن‌کارانہ ذہنیت سے بھی یہ کافی طور پر متاثر تھیں - اس لئے شمالی ہند کی مغلیہ شائستگی کے مماثل ایک نفیس شائستگی انہوں نے اپنے اطراف میں ایسی پیدا کی جس کی بنیاد جدید مغربیت کے نیچے اب تک استوار ہے -

انہیں دو سلطنتوں کی آغوش تربیت میں اردو کے اولین ادبی نصب‌العین بنے - اور خاص طور پر افسانوی ادب کا جو سرمایہ یہاں پیدا ہوا وہ اردو ادب کی تاریخ کے ہر دور میں نمایاں نظر آئیگا - بیجاپور اور گولکنڈہ کا ادبی سرمایہ زیادہ تر منظوم قصوں پر مشتمل ہے اس دور کی ادبی ذہنیت کسی نہ کسی طرح قصہ نگاری کی طرف مائل ہو جاتی ہے کیونکہ شعر کے حسن اور قصے کی دلچسپی کے علاوہ اس شعبۂ ادب میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہمیشہ وسیع ترین اثر کا مالک رہا ہے - اس زمانے کے خالص ادیبوں کے علاوہ، صوفی شعرا، مذہبی علماء، سوانح نگار یا مورخ سبھوں نے قصے کے پیرایہ کو انتخاب کیا، اور ہر طرز کے قصے چھوڑے -

قصہ نگاری ' جس کی ابتدا درحقیقت قوم میں شعور پیدا ہونے کے ساتھ ہی ہوتی ہے ' دکنی ادب کے زرّیں دور یعنی دسویں صدی کے آخری زمانے سے بہت پہلے وجود میں آ چکی ہوگی - تاہم اس وقت اس طرح کا بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے - اولین قصے یقیناً مختصر کہانیوں کی شکل میں لکھے گئے ہونگے - ادبی نقطۂ نظر سے یہ ابتدائی کوششیں بذات خود زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں - بلند پایہ ادبی قصوں کا زمانہ درحقیقت بیجاپور اور گولکنڈہ کے عروج کمال کا زمانہ ہے -

قصہ نگاری ' بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں مرکزوں میں بیک وقت شروع ہوئی - تاہم خوبی کے اعتبار سے گولکنڈہ کے قصے زیادہ مہتمم بالشان ہیں - گو تعداد کے لحاظ سے بیجاپور کے قصے شاید زیادہ ہی ہوں - بیجاپور کے قصوں کا عام معیار گولکنڈہ کے قصوں سے بلند معلوم ہوتا ہے - لیکن گولکنڈہ نے چند اعلیٰ ادبی پائے کے قصے ایسے پیش کیے جو اپنے بیانات کی نفاست ' اسلوب کی خوبی ' رفتار کے تسلسل ' واقعات کے بسیط نقشوں اور شاعری کے نکات میں شاید آج بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے - تاریخ میں اس عہد کے بعد منظوم قصہ نگاری کی ایسی مسلسل اور مہتمم بالشان کوششیں کبھی نہیں ہوئیں -

اس عہد کے قصوں کے متعلق چند عام امور خصوصیت کے ساتھ مشاہدے کے قابل ہیں - سب سے پہلے یہ کہ یہ قصے نثر میں بہت کم اور تمام تر مثنوی کی شکل میں لکھے گئے ہیں - نثر کا ایک قصہ '' سبرس '' اہم ہے جس کے متعلق ہم آگے تفصیل سے لکھیں گے - قصہ نگاری کے لیے دکنی مصنفین نے مثنوی

کی صنف کو بڑی حد تک مخصوص کر لیا تھا کیونکہ اصناف شاعری میں سب سے زیادہ طویل یہی صنف تھی - مثنوی کا بھی اُنھوں نے اپنی طرف سے ایک معین ضابطہ بنا لیا تھا آغاز قصہ سے پہلے وہ لازمی طور پر چند ضروری عنوانات قائم کرتے تھے جن کی ترتیب عام طور پر حمد ' نعت ' منقبت ' مدح بادشاہ وقت ' سبب تالیف میں ہوتی تھی - یہی تمہیدی ابواب ہیں جن کی بدولت اکثر کارناموں کو ہم آج صحیح تناسب کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں - بہت کم کارناموں میں اس ضابطے سے انحراف ہوا ہے -

نفس قصہ کو بھی وہ عنوانات پر تقسیم کرتے تھے - تاہم بعض وقت اس کی پابندی نہیں کی گئی - آخر میں ایک اختتامی بیان ہوتا ہے جس میں مصنف دعا کے علاوہ قصے کے متعلق بعض ضروری امور کا ذکر کرتا ہے -

یہ قصے عموماً ہندی نژاد ہیں چنانچہ اکثر قصوں کے پلاٹ سرزمین ہند ہی میں رکھے گئے ہیں - ان میں سے چند قصے ایسے بھی ہیں جو فارسی سے ترجمہ ہوئے یا فارسی قصوں کے اثر سے پیدا ہوئے ہیں لیکن خالص ہندی قصوں کی بھی اس سرمائے میں کمی نہیں ہے -

یہ قصے عموماً عشقیہ ہیں - صرف چند قصے جیسے " خاور نامہ " " قصہ حضرت تمیم انصاری " وغیرہ ایسے ہیں جن سے مہمات کی خواہش ظاہر ہوتی ہے - مذہبی قصے بہت ہیں - بلکہ اس طرح کے قصوں کا ایک ضابطہ بن گیا تھا - جس کا ذکر ہم نے " قصہ ملکہ مصر " کے سلسلہ میں کیا ہے ایک آخری مگر اہم محرک قصہ ' متصوفانہ نکات کی تفہیم کی کوشش ہے -

پلاٹ یا خاکے کے اعتبار سے یہ قصے سادہ ہیں - ان کے مصنفین کا فنی احساس ابھی اولین سر منزل میں تھا - اپنے ہیرو کے واقعات حیات وہ عموماً بغیر کسی اونچ نیچ کے بیان کر دیا کرتے تھے - جہاں وہ دلچسپی زیادہ پیدا کرنا یا حیرت کو اُکسانا چاہتے ' فوق الفطرت یا فوق العادت عنصر سے بلا تکلف کام لیتے - اس لیے اس عہد میں اور اس کے بعد بھی عرصے تک فوق فطریت قصے کا اہم‌ترین جزو رہی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوسط زمانے کے قصہ نگاروں نے اسی میدان میں مسابقت کی کوشش کی - سادہ خاکوں سے زیادہ ایک خاص قسم کے خاکے اس عہد میں بہت مقبول تھے - واقعات کی پیچیدگی ' پلاٹ کی دلچسپی کا بڑا سبب ہوتی ہے - ہمارے قدیم اہل فن اس راز سے اچھی طرح واقف تھے - اس لیے ایک خاص ترکیب پلاٹ میں پیچیدگی پیدا کرنے کی اُنہوں نے اختیار کی '' الف لیلیٰ '' '' انوار سہیلی '' کی طرز میں قصہ در قصہ کہنے کے فن کو اُنہوں نے خوب ترقی دی جس سے قصے میں دلچسپی کے علاوہ طوالت بھی پیدا ہو جاتی ہے - مہمات اور حزن بھی اولین قصوں کا لازمی جز بن گئے تھے - کیوں کہ اُن سے قصے میں اثر کا اضافہ ہو جاتا ہے - اکثر پلاٹ صورت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں - بلکہ بعض وقت تو ان قصوں کے مصنفین کی ذہنیت ایک معین ضابطے کے تحت سر گرم عمل نظر آتی ہے - بہت سے قصے ایسے ملینگے جن میں کسی ملک کا بادشاہ لاولدی کے غم میں مبتلا بتلایا گیا ہے پھر کسی فوق الفطرت کار پرداز کے ذریعے سے بادشاہ کے گھر لڑکا ہوا جو جوان ہونے کے بعد کسی نہ کسی طرح ایک دور دراز ملک کی بادشاہ زادی ' امیر زادی یا سوداگر زادی پر فریفتہ ہو گیا - محبوب کی تلاش

میں جو مصیبتیں شہزادہ برداشت کرتا ہے اُنھیں سے قصے کے پلاٹ کا اہم ترین حصہ تیار ہو جاتا ہے بالآخر کامیابی قصے کے اختتام کا باعث بنتی ہے - ایسے پلاٹ عام طور پر آخری زمانے میں بہت رائج ہو گئے تھے - اہم اشخاص قصہ ہمیشہ فوق العادت ہوتے ہیں - شان و شوکت کے اظہار کے لیے یہ عموماً معاشرت کے اعلیٰ ترین طبقوں ، خصوصاً حکمرانوں سے چنے جاتے ہیں - کیونکہ اُن کی قوت سے قصہ نگار کو عجیب و غریب کام لینے پڑتے تھے - اشخاص میں ہندی اور ایرانی نژاد ساتھ ساتھ ہوتے ہیں - کیونکہ جیسا اوپر بیان ہوا ہے اس دور کے قصہ نگاروں نے ہندوستانی قصوں سے بھی مساوی طور پر منصفانہ سلوک روا رکھا تھا - بلکہ اولین قصے زیادہ‌تر ہندی قصوں سے متاثر رہے - " چندربدن و مہیار " " منوہر مدمالتی " " پدماوت " " رتن پدم " وغیرہ اُس کا کھلا ثبوت ہیں - لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا شاعری کی طرح اشخاص قصہ پر بھی ایرانی رنگ غالب آتا گیا - کردار نگاری میں ہمارے افسانہ نگار اپنے ممالک عہد کے دوسرے ہم مشربوں سے کچھ بڑھے ہوئے نہیں تھے - انفرادی کردار نگاری کے بجائے وہ نمونے کی کردار نگاری کی طرف زیادہ مائل تھے - نفسیاتی نزاکتوں سے علحدہ رہنے کی وجہ سے انھیں کردار میں استقلال قائم رکھنے کی کوشش ہی نہیں کرنی پڑتی تھی نصیب‌العینیت ، اُن کا اُصول تھا اور جہاں جس قسم کے اوصاف کی ضرورت پڑتی ان میں خاص خاص کردار درجہ کمال پر ظاہر کیے جاتے تھے - قصے کی مجموعی دلچسپی ان کے مد نظر رہتی تھی - اس لیے انفرادی کردار پر اُنھوں نے زیادہ توجہ نہیں کی -

قصوں کا محرک ہمیشہ عشق ہوتا تھا اور اس عشق کے
پیدا کرنے کے لیے قصہ نگار عجیب عجیب چالیں چلتے تھے -
ہماری معاشرت میں پردے کی رسم نے عورتوں اور مردوں کے
درمیان ایک وسیع خلیج حائل کردی ہے - اس لیے عام طور
پر ہیرو کا کسی معزز عورت کو دیکھنا اور اس کے حسن و جمال
پر فریفتہ ہونا کوئی آسان بات نہیں ہے - اس میں شک نہیں
کہ چند قصہ نگاروں نے ہیروئن کی جھلک کھڑکی سے دکھلا کر
محبت کے لیے گنجایش پیدا کر دی ہے لیکن یہ چیز روزمرہ
کی بات نہیں - ہر قصہ نگار اسی ضابطہ پر عمل نہیں کر سکتا
تھا اس لیے انھوں نے نئی نئی ترکیبیں اختراع کیں - بعض
وقت وہ تصویر کو ذریعہ بناتے ہیں اور کبھی خواب میں ہیروئن
کی صورت دکھا کر وجہ تحریک (motive) پیدا کر لیتے ہیں -
ہیروئن کے استعمال کی کوئی چیز دیکھ کر' اس کے حسن و جمال
کا تصور کرنا اور اس پر عاشق ہو جانا بھی کوئی انوکھی بات
نہیں ہے لیکن ان سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی
ہندو لڑکی پر اپنے ہیرو کو عاشق کر دیتے ہیں چونکہ ان کا
ہیرو بھی حسن و جمال میں یکتا ہوتا ہے اس لیے ایک وجہہ
تحریک اس طرح پیدا کی جاتی ہے کہ پری کو ہیرو پر فریفتہ
کر دیتے ہیں - بعض آزاد خیال قصہ نگاروں نے اِس گتھی کو
سلجھانے کے لیے ہیرو کو کسی طوائف کے دام محبت میں پھنسانے
سے بھی گریز نہیں کیا - اس کی مشہور مثال ہم کو " گل بکاولی "
یا " گلزار نسیم " میں ملتی ہے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل
ہے کہ قدیم قصوں کا عشق ہمیشہ " پہلی نظر کا عشق " ہوتا ہے
جس کی اب شاید کوئی وقعت نہیں رہی -

ان چند مبادي کے بعد هم اصل قصوں کی طرف متوجه هوتے هیں - دکنی ادب میں اولین منظوم قصه جو هم کو ملتا هے وہ ابراهیم قطب شاہ والي گولکنڈہ کے درباری شاعر وجهي کا هے یه ایک نفیس مثنوي هے جس کا عنوان " قطب مشتري " اور اس کي تصنیف کا سنه ۱۰۱۸ هجري هے - وجهی بلندپایه شاعر تها - قطب مشتري اس کے دوسرے کارناموں کی طرح ایک انفرادیت کي مالک هے - فارسی کے اگلے قصه نگاروں کے راستے سے هٹ کر ' وجهی نے اپنے قصے کے لیے ایک انوکها موضوع منتخب کیا - وہ اپنے سرپرست بادشاہ کے شہزادے یعني محمد قلي قطب شاہ کو هیرو بنا کر اُس کے عشق و محبت کے واقعات قصے کے پیرائے میں لکهتا هے اِس میں شک نہیں که هیرو کے شهزادۂ وقت هونے کے باوجود " قطب مشتري " میں تاریخي واقعات کا بہت کم لحاظ رکها گیا هے - تاهم یه اُردو تاریخي قصوں کا جد اعلیٰ سمجها جا سکتا هے -

وجهي اردو نثر کے اولین کارنامے " سبرس " کا بهی مصنف هے - " سبرس " کا موضوع تصوّف هے لیکن جلال الدین رومی اور فریدالدین عطار کی طرح وجهي نے بهي متصوفانه مضامین کو قصے کے پیرائے میں بیان کیا هے چنانچه " سبرس " کا دوسرا عنوان " قصۂ حسن و دل " هے اِس اعتبار سے وجهی کی " سبرس " نثری انسانوں کا بهي باوا آدم هے - یه " قطب مشتري " کے ۲۷ سال بعد لکهی گئي - اُس کا مآخذ ایک فارسی قصه هے جو مشرق کي کئي زبانوں میں دهرایا گیا هے - لیکن دلچسپي اور حسن بیان کے اعتبار سے " سبرس " کو فارسی قصے پر سبقت حاصل هے -

"سبرس" کا قصہ اور طرز بیان دونوں اردو میں انوکھے ہیں -
پورا قصہ حقائق و معارف کی تمثیل ہے بظاہر وہ ایک عاشق
کی تلاشِ معشوق معلوم ہوتی ہے - تمثیل نہایت طویل اور بسیط
ہے اور ایسی نفیس ہے کہ مشرق میں جہاں اس طرح کے
قصے عام طور پر لکھے جاتے رہے ہیں اس کی مثال مشکل سے
ملے گی -

وجہی کے قصے جتنے دلچسپ ہیں اُس سے زیادہ پر مغز
بھی ہیں - لیکن محض دلچسپی کی خاطر جو قصے لکھے گئے
ان میں وجہی کے بیجاپوری معاصر مقیمی کے قصے سب سے
پہلے ہیں -

مقیمی ' ابراہیم عادل شاہ والی بیجا پور (۹۸۸ - ۱۰۲۷)ع
کے دربار کا شاعر تھا - جس کا عہد سلطنت ' قطب مشتری کے
ہیرو ' محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے مطابقت رکھتا ہے -
مقیمی نے دو قصے لکھے (۱) سومہار کی کہانی ' (۲) " چندربدن
ومہیار" ان میں سے پہلا قصہ تو زیادہ شہرت نہ پا سکا -
لیکن دوسرا قصہ حسن و عشق کی لازوال دلچسپیوں کے باعث
آج تک زندہ ہے - اس کی زبان اب عام فہم نہیں رہی -
تاہم جدید زبان کے قالب میں یہ اب بھی ویسا ہی دلچسپ
ہے - مقیمی کا یہ قصہ ہندی نژاد ہے لیکن مصنف کی ایرانی
ذہنیت سے بھی کافی متاثر ہے -

اِن اولین قصوں کو پڑھنے کے بعد یہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ
یہ کوششیں قصہ نگاری کی ابجد نہیں ہیں - یہ شبہہ بڑی حد
تک درست ہے - اس میں شک نہیں کہ فارسی ادب کے اثر

نے اُردو کے ادبی معیار کو بہت جلد بلند کردیا تھا - تاہم
اردو نثر و نظم کے اولین نمونوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا
ہے کہ قصوں کو اس معیار تک پہنچنے کے لئے کچھ مدت
ضرور لگی ہوگی - لیکن "خوب ترنگ" کے قصوں کے سوا
ہمارے پاس وجہی سے پہلے کے قصوں کا کوئی نمونہ فی‌الحال
موجود نہیں ہے - اُردو افسانہ نگاری کی تمہیدی کوششوں کے
متعلق ہم یہ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہندیت سے زیادہ
متاثر ہونگی - سب سے پہلے حسن‌کار ہمیشہ اپنے ماحول سے متاثر
ہوتے ہیں - بعد میں آنے والوں پر قدما کی روایات کا اثر
رہتا ہے - چنانچہ پنجاب کے اولین قصے "ہیر رانجھا"
"سوہنی مہنوال" "درگاوتی" پنجاب نژاد ہیں - بعد کے قصہ
نگاروں نے مشہور فارسی اور عربی قصوں پر طبع آزمائی شروع کی
ہندی ادب کی تجدید نے اُردو شاعروں کی طرح اُردو افسانہ
نگاروں کو بھی بہت جلد فارسی ادب کی طرف متوجہ کردیا -
اسی لئے اُردو ادب رفتہ رفتہ فارسی کے بہت قریب ہوتا گیا -
عربی کا صرف ایک قصہ "لیلی مجنوں" فارسی کے توسط سے
اُردو میں پہنچا " اور بے حد مقبول ہوا - عرب کی اس
داستان محبت کی مقبولیت شاید ہی کسی افسانے کو نصیب
ہوئی ہو - آج بھی وہ شعری ادب میں کمال عشق کا معیار
بنا ہوا ہے -

ہندی زبانوں سے یہ قصہ اس عہد سے بہت پہلے روشناس
ہوچکا تھا - تاہم اس وقت سے پہلے کے بہت کم ترجمے اب
ملتے ہیں - موجودہ ترجموں میں سب سے پہلا وجہی کے ایک

معاصر احمد کا ہے احمد کوئی بلند پایہ شاعرنہیں تھا - تاہم اس کو محمد قلي کے دربار سے توسل تھا اور قصہ اُس نے بادشاہ هي کے ایما سے لکھا تھا - احمد کے ترجمے کا بھي کوئی مکمل مخطوطہ موجود نہیں ہے پروفیسر حافظ محمود شیراني کے پاس اس کے صرف چند اجزا باقي رہ گئے ہیں -

" چندر بدن و مہیار " کے بعد دوسرا اهم قصہ " میزباني نامہ سلطان محمد عادل شاہ " ہے اس کا مصنف ایک آزاد خیال شاعر حسن شوقی ہے - جس کا تعلق دکن کے تقریباً تمام شاهي درباروں کے ساتھ رہ چکا تھا - وجهي کی طرح حسن بھی ادبي تقلید سے آزاد تھا - اِسي سے اُس نے اپنے هي زمانے کے ایک اهم واقعے کو قصے کے پیرائے میں بیان کیا ہے - محمد عادل شاہ (۱۰۱۷ - ۱۰۳۷) کی شادي اُس کے وزیر مصطفی خاں کي لڑکی کے ساتھ حسن کی زندگی کا ایک خاص واقعہ تھا - کسی شاعر کے لیے اِس سے بہتر موضوع اور کیا ملسکتا تھا - حسن نے نہایت ادبی انداز میں رسوم شادی ، معاشرت اور لوازم عیش کے خاکے پیش کیے هیں - اس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو اورنگ‌آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے یہ اس قابل ہے کہ نہایت اهتمام کے ساتھ شائع کیا جائے -

دکن کے مہتمم بالشان قصوں کي ابتدا ، غواصی سے هوتی ہے جو محمد قلي هي کے دربار کا شاعر تھا - لیکن وجهي کے بعد چمکا - غواصي سب سے پہلا شاعر ہے - جس نے حقیقي قصہ گوئي کا ذوق پیدا کیا - مسلسل اور مستقل بیانات ، نفیس مناظر اور جزئي امور کے تفصیلی بیانات کے ذریعے قصے کو خالص ادبی

رنگ میں رنگنے کی اُس نے بیش از بیش کوشش کی - اور اِس میں اُسے قابل لحاظ کامیابی ہوئی - غواصی کا اثر فوراً پھیل گیا اور آگے چل کر ابن نشاطي اور نصرتي جیسے بلند پایہ افسانہ نگار پیدا ہو سکے -

غواصي نے اپنی یادگار دو قصے چھوڑے ہیں - " سیف الملوک و بدیع الجمال " اور " طوطي نامہ " " سیف الملوک " کا ماخذ " الف لیلیٰ " کا ایک مشہور قصہ ہے لیکن غواصي کے قلم نے اُس کو ایک لازوال انفرادیت دیدي ہے - " طوطی نامہ " کي داستان بھي دنیا کي مختلف زبانوں میں بارہا دہرائي جا چکی ہے - پھر بھي غواصي کے اس کار نامہ کو بعد کے ترجموں کے لئے ایک ماخذی اہمیت حاصل ہو گئي ہے -

فارسي ماخذ کے قصوں میں " بہرام گور " سے متعلق قصے خاص اہمیت رکھتے ہیں - انگلستان کی نیم افسانوي شخصیت شاہ آرتھر اور اس کے نائٹوں کی طرح ایراني بادشاہ بہرام گور کي شخصیت بھی کئي قصوں کے تصنیف کے بابت ہوئي ہے - اردو میں بہرام کے متعلق سب سے پہلا قصہ " بہرام اور حسن بانو " ہے جس کي ابتدا امین نے سنہ ۱۰۳۷ھ میں کی تھی - لیکن اُس کي تکمیل گیارہ سال بعد دولت کے ہاتھوں ہوئی - دولت کے آٹھ سال بعد ملک خوشنود نے اس کو ایک دوسرے ماخذ یعنی امیر خسرو کي " ہشت بہشت " سے اُردو میں منتقل کیا - ملک خوشنود نے ترجمے کا عنوان بھي " ہشت بہشت " ہی رکھا - گولکنڈہ کے آخري بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کے دربار کے بلند پایہ شاعر نے بھي اپنی مثنوي " بہرام و گل اندام " میں بہرام گور کي شخصیت

پر طبع آزمائی کی ہے - لیکن طبعی کا قصہ نہ تو امیر خسرو کی " هشت بہشت " کا ترجمہ ہے اور نہ " بہرام و حسن بانو " کا چربا - یہ ایک طرح بہرام کی حیات اور اُس کی مہمات کی داستان ہے - طبعی بڑا قادر کلام شاعر تھا - اِس لیے اُس کا قصہ اگلے تمام قصوں پر اپنی ادبیت کے لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے - پنجابی زبان میں امیر خسرو کی " هشت بہشت " کے توسط سے یہ قصہ پہونچا -[1] اور ایک سے زیادہ لباس اس میں جلوہ گر ہوا - غدر سے گیارہ سال بعد یہ دهلی میں از سر نو لکھا گیا [2] -

حقیقی مہماتی قصوں میں محمد عادل شاہ کے درباری شاعر صنعتی کا کارنامہ " قصہ حضرت تمیم انصاری " (سنہ ۱۰۵۰ع) خاص طور پر قابل ذکر ہے - اس طرز کے قصوں میں یہ دلچسپ مطالعہ ہے - صنعتی اپنے موضوع کی تلاش میں خلافت راشدہ تک پہنچ جاتا ہے - اور داستان امیر حمزہ کی طرح صحابی رسول حضرت تمیم انصاری سے متعلق ایک فرضی سلسلۂ واقعات مہمات کی مدد سے مختصر سا قصہ تیار کر لیتا ہے -

ملک خوشنود کے قصے " هشت بہشت " کا اوپر ذکر ہو چکا ہے - اِس شاعر نے امیر خسرو هی کی ایک دوسری مثنوی " یوسف زلیخا " کو بھی اُردو میں منتقل کیا تھا - " لیلیٰ مجنوں " کی عشقیہ داستان کے بعد سب سے زیادہ مقبول

---

۱ کتلاگ آف هی هندستانی میانیوس کرپٹس انڈیا آفس لائبریری ۳۳ -

۲ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ هو " مجلۂ مکتبۂ " (حیدرآباد دکن) جلد ۲ شمارۂ ۲ -

یہ "احسن القصص" ہے' جس کے اشارے شعرا نے قرآن سے لیے اور پھر فروعات کے اضافے سے ایک مکمل داستان مرتب تیار کرلی - اِس قصے پر بھی تقریباً ہر زمانے میں طبع آزمائی کی گئی - سنہ ۱۰۹۱ع میں گجرات کے ایک شاعر محمد امین نے معلوم ہوتا ہے کہ ملک خوشنود ہی کے قصے کو اپنے طور پر لکھا تھا -

دکنی افسانہ نگاری کا معراج کمال ابن نشاطی اور نصرتی کے قصے ہیں - یہ دونوں شاعر ایک دوسرے کے ہم عصر تھے - لیکن اِن میں سے اول‌الذکر کا تعلق عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ - ۱۰۸۳) کے دربار سے تھا - اور آخر الذکر عبداللہ کے بوڑھا پوری معاصر علی عادل شاہ ثانی کے دربار کے ممتاز شعرا میں سے تھا - یہ دونوں باکمال شاعر اپنے زمانے کی بلند پایہ شخصیتیں ہیں - انہوں نے قصہ گوئی محض تفریح طبع کا سامان فراہم کرنے کی خاطر کی - اور اس فن کو عروج کمال تک پہونچا دیا - قصے کی فروعات اور اپنے حدود کے اندر واقعات اور کردار کے استقلال اور پیدا کردہ فضا کے ساتھ ان کی موافقت' بیانات کے حسن' نفسیاتی جھلکوں کی بدولت ابن نشاطی کا قصہ " پھولبن " اور نصرتی کا قصہ "گلشن عشق" اگلے تمام قصوں پر فوقیت رکھتے ہیں -

" پھولبن " سنہ ۱۰۶۶ ھ کی تصنیف ہے - اس کے دو سال بعد نصرتی نے اپنا قصہ لکھا - غالباً اس کو ابن نشاطی کے قصے سے استفادے کا موقع ملا تھا - دونوں قصے اپنی فضا کے اندر اچھے ہیں - لیکن واقعات قصہ کی حد تک؛ نصرتی کا کارنامہ نمایاں

امتیاز رکھتا ہے - اسلوب اور بیانات کی وسعت میں یہ ابن نشاطی کے قصے کا مقابلہ نہیں کر سکتا -

دکنی سلطنتوں کی بربادی سے پہلے چند اور قصے بھی لکھے گئے - لیکن اُن میں سے ایک بھی مذکورۂ بالا قصوں کے رتبہ کو نہیں پہنچتا - فائز کا قصہ '' رضوان شاہ و روح افزا '' اور غلام علی کی '' پدماوت '' اہم ہے - اول الذکر قصہ اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا تھا - جس کے باعث وہ پنجاب[1] اور ہندوستان تک پہنچ گیا - خود دکن میں بھی یہ کئی دفعہ دہرایا گیا - '' پدماوت '' ٹھیٹ ہندی قصہ ہے - اپنے پلاٹ کی اپج کی بدولت یہ غیر معمولی طور پر مقبول ہوا - اس کا موجودہ مأخذ ملک محمد جائسی کا قصہ ہے ' جو سنہ ۹۴۷ ھ میں شیر شاہ سوری کے حکم سے لکھا گیا تھا - اردو میں یہ کئی دفعہ لکھا گیا - آخر میں رجب علی بیگ سرور کے مشہور قصے '' فسانۂ عجائب '' کا مأخذ بنا -

'' رضوان شاہ '' اور '' پدماوت '' کے علاوہ محمد علی عاجز کی تصنیف '' قصۂ ملکۂ مصر '' اور قاضی محمود بحری کی '' من لگن '' بھی قابل ذکر ہیں اِن میں سے ہر قصہ ایک خاص نوعیت کا ہے - قصۂ '' ملکۂ مصر '' کا مقصد فقہ کے چند مسائل کی توضیح ہے - اس کا مجمل خاکہ یہ ہے کہ مصر کی شہزادی یہ عہد کرتی ہے کہ وہ ایسے شخص سے شادی کریگی جو اُس کے سوالات کے تشفی بخش جواب ادا کرسکے گا - ناکام

---

[1] - '' پنجاب میں اردو '' ص ۱۱۷ و ۱۱۸ -

سعي کا انجام موت ہوگا - ہزاروں نوجوان اس سعي میں تلوار کے گھاٹ اُتارے گئے - آخرکار ہندوستان کا ایک عالم، عبداللہ نامي مصر پہنچتا ہے اور شہزادی کے سوالات نہایت عمدگي سے حل کرتا ہے - شہزادی اُس کي عقل و دانش سے بے حد متاثر ہوتی ہے - اور آخر میں دونوں کی شادي ہو جاتی ہے -

دینی اور شرعی مسائل کے سمجھانے کا یہ ایک اُبھي طریقہ ہے اس کي تقلید میں کئي قصے لکھے گئے - جن میں چھینا پٹن (میسور) کے اسحاق کا قصہ " زلیخاے ثانی[1] " بھی ہے - عاجز کے قصے کو دکن کے ایک اور شخص عبدالطیف نے اپنا لیا تھا - اِس تمام مقبولیت کے باوجود قصہ پن کے اعتبار سے اِس طرح کے قصے بہت ادنیٰ درجے کے ھیں -

محمود بحري کی " من لگن " بلند پایہ متصوفانہ مثنوي ہے لیکن اِس میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے -

دکن کی ادبی مرکزیت جو بیجا پور اور گولکنڈہ کی بربادي کے بعد سے کچھ عرصہ کے لئے ختم ہوچکي تھي - سنہ ۱۱۳۷ع میں نظام‌الملک کي فتح دکن کے بعد آہستہ آہستہ پھر عود کرنے لگی - لیکن حقیقت یہ ہے کہ گیارھویں صدی ھجري کا سا شاندار عہد موجودہ زمانے سے پہلے دکن کو پھر نصیب نہ ہوسکا - مغلوں کے دکن فتح کرنے کے بعد اور نظام‌الملک کي سلطنت کے قائم ہونے سے پہلے تک کا زمانہ انتشار کا زمانہ تھا -

---

۱ - ملاحظہ ہو، تفصیلي فہرست اُردو مخطوطات، کتب خانۂ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ (حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۲۹م) ص ۱۷۵ -

قدیم درباروں کے جو شاعر اور عالم بچے کھچے رهگئے تھے ' اُنھوں نے قدیم روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی - چنانچہ فائز ' قلم علی ' عاجز ' اور محمود بحری اسی عہد سے تعلق رکھتے ھیں - اِس میں شبہ نہیں کہ اِن کی ادبی شائستگی کا نشوونما اِسی قدیم فضا میں ہوا تھا - تاھم اِن کے کارناموں میں وہ ادبی سر بلندی نہیں پائی جاتی -

نظام الملک نے جب دکن کی سر زمین کو انتخاب کر لیا تو ایک گونہ امن پھر قائم ہوگیا - تاهم اگلی صحبتوں کا رنگ اب بگڑ چکا تھا - اِس لیے پھر نہ جم سکا - چنانچہ اِس نئی سلطنت کے قائم ہونے کے وقت جو شاعر ' جیسے وجدی ' ولی ' سراج وغیرہ ' زندہ بھی تھے وہ یا تو قدیم ادبیت کے گزرتے ہوئے نمونے تھے یا نئے عہد کے علم بردار - وجدی اگلی صحبتوں کی آخری یادگار ھے ' لیکن اُس کے قصے " پنچھی باچھا " " باغ جانفزا " اور " خسرو نامہ " درحقیقت فارسی قصوں خصوصاً فریدالدین عطار کی مثنویوں کے ترجمے ھیں - " منطق الطیر " کی طرح اُس کے ترجمے " پنچھی باچھا " کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی - اِس کا سبب دراصل قصے کی خوبی نہیں بلکہ اُس کے متصوفانہ خیالات ھیں - قصے کے اعتبار سے یہ کارنامہ بہت معمولی ھے -

ولی اور سراج دونوں بلا شبہ بلند پایہ شاعر ھیں - لیکن ولی نئے عہد کا علم بردار تھا - جس میں قصے اور مثنوی کے بجائے غزل ' قصیدے وغیرہ کو اهمیت تمام حاصل ہونے والی تھی - سراج بھی ولی ھی کا هم مشرب اور پیرو ھے - ولی سے لیکر

زوال لکھنؤ اور عصر اصغر کے آغاز تک اردو شاعری کم و بیش
اُسی ڈھّرے پر قائم رہی جو ولی نے ڈالا تھا - اِس میں کوئی
شبہ نہیں کہ دہلی اور لکھنؤ میں بھی بزمیہ اور قصہ‌دار مثنویاں
اور بلند پایہ مثنویاں لکھی گئیں - لیکن درحقیقت یہ دکن
ھی کی قدیم ادبی روایات کو برقرار رکھنے کی جستہ جستہ
کوششیں تھیں - منظوم قصہ نگاری کا عہد پھر واپس نہ آ سکا -
کیونکہ قصہ گوئی کے لیے شمالی ھند نے نئے پیرائے ایجاد کر لیے
تھے - ھند میں نثری افسانوں، طویل داستانوں اور اُس کے بعد
مرصع اسلوب کے قصوں کو بہت عروج ہوا -منظوم قصے بھی
ابتدائی زمانے میں لکھے گئے جن میں سے بعض اِس فن کے
بہترین نمونے ھیں - تاھم بہ حیثیت مجموعی منظوم قصہ نگاری
کا یہ دور نہ تھا - منظوم قصہ نگاری کا زرین عہد دکن کی
سلطنتوں کے عروج کے ساتھ ھی ختم ھوگیا -

اگرہ کی ہوائی رصد گاہ[1]

(از مسٹر کرشن چلدر ' ایم ' ایس ' سي) -

ہمارے صوبے کے اکثر لوگ ابھی اس امر سے ناواقف ہوں گے کہ آگرہ میں تاج محل وغیرہ تاریخی عمارتوں کے علاوہ ایک ایسي قابل دید چیز اور بھي ہے جو اپني نوعیت کے اعتبار سے دنیا میں دوسرا درجہ رکھتي ہے ' اگر ہم گوالیار کي سڑک پر ہوتے ہوئے آگرہ سے دھول پور کو روانہ ہوں تو شہر سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر کچھہ عمارتیں ملیں گي جو قرب و جوار کے گاؤں میں "ہوا گھر" کے نام سے مشہور ہیں ' یہي آگرے کی ہوائي رصد گاہ ہے -

یہ دنیا کے تمام مہذّب ممالک میں اپنے منظم موسمي تحقیقات علمي کے لئے مشہور ہے ' اِس رصدگاہ کا مخصوص کام یہ ہے کہ وہ ہوا کے متعلق مختلف قسم کي معلومات بہم پہونچائے ' - اُس کے مہتمم جناب گوري پت چٹر جي ہیں جو بہت هي معقول انسان ہیں - جو لوگ رصدگاہ دیکھنا چاهتے ہیں آپ اُنہیں بڑی خوشی سے اجازت دے دیتے ہیں - صرف یہي نہیں بلکہ وہیں کے کسي واقف‌کار ملازم کو بھي ہر چیز کے دکھانے کے لئے ساتھ کر دیتے ہیں -

---

(1) Upper Air Observatory Agra.
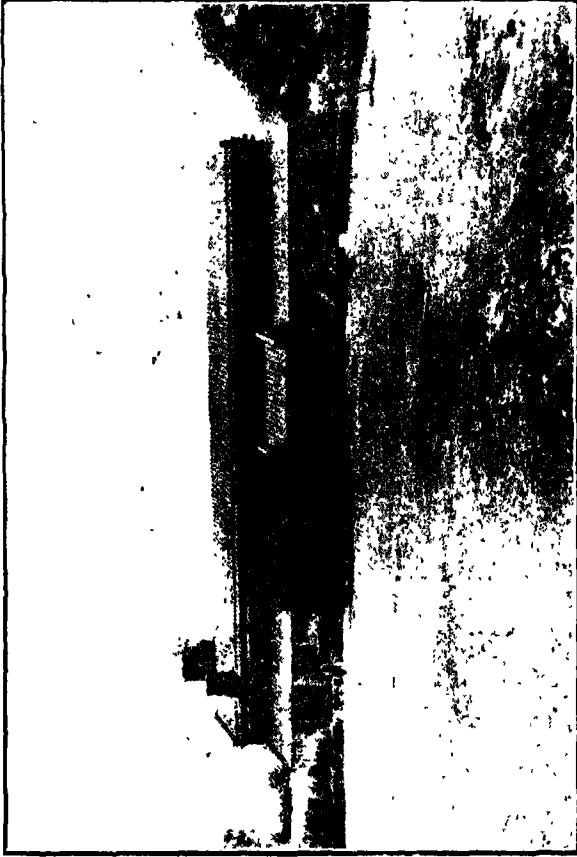
تصویر نمبر ۱
رصدگاہ کی خاص عمارت
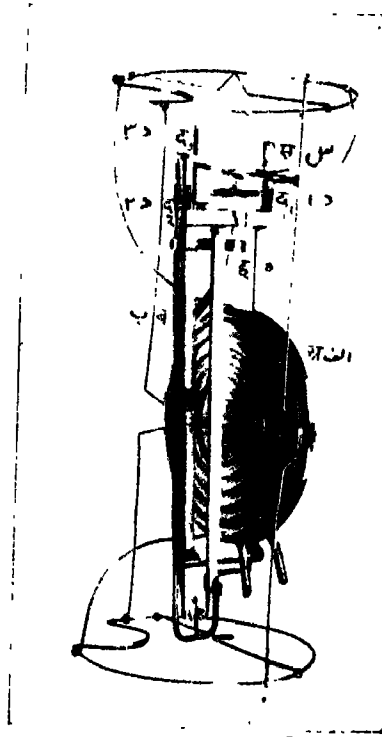
تصویر نمبر ۲
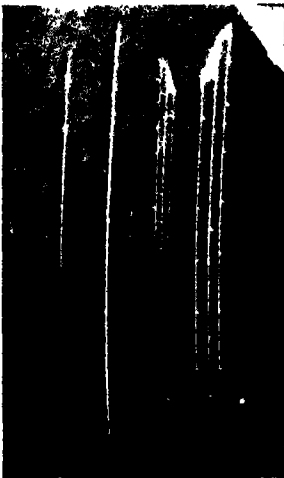
تصویر نمبر ۳
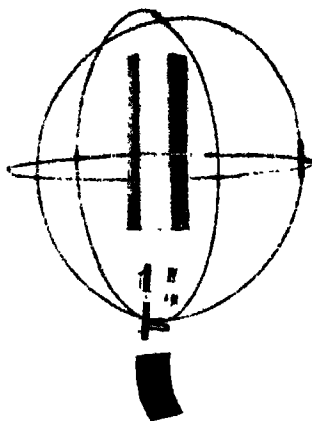
تصویر نمبر ۴
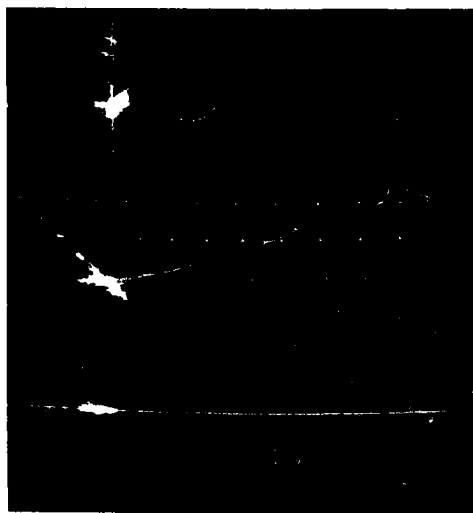
تصویر نمبر ۵
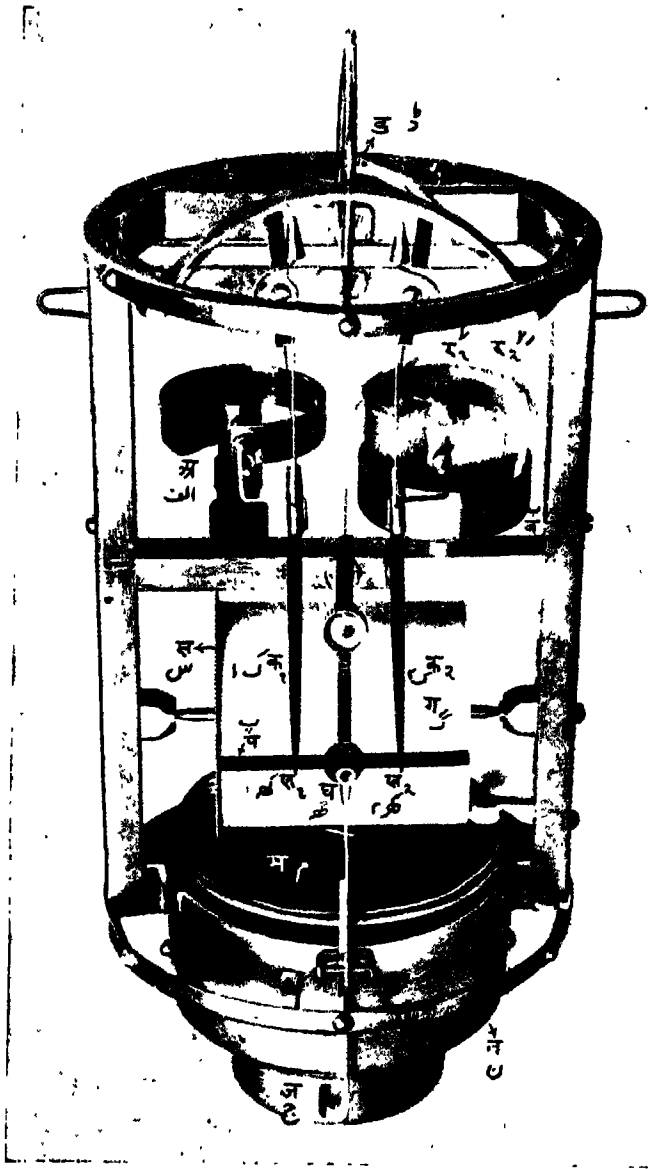
تصویر نمبر ۹
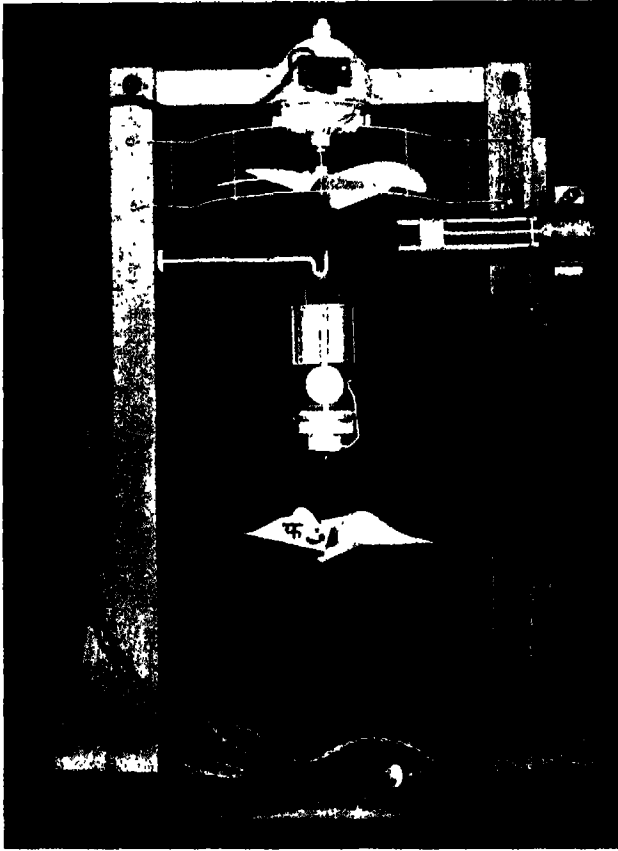
تصویر نمبر ۷

تصویر نمبر ۸
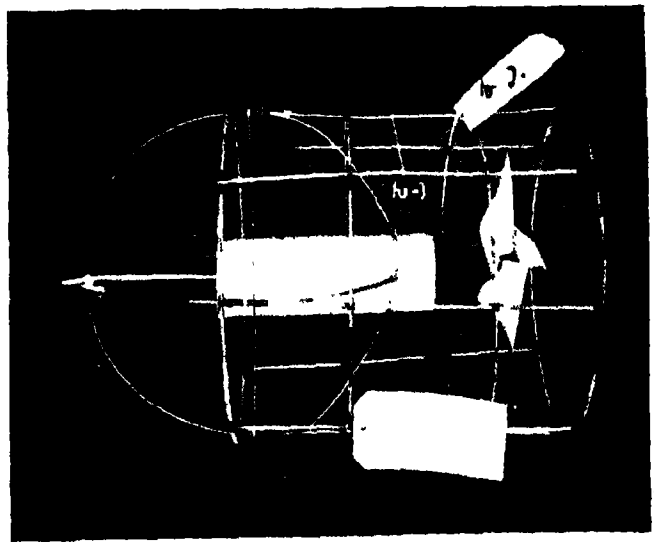
تصویر نمبر ۹
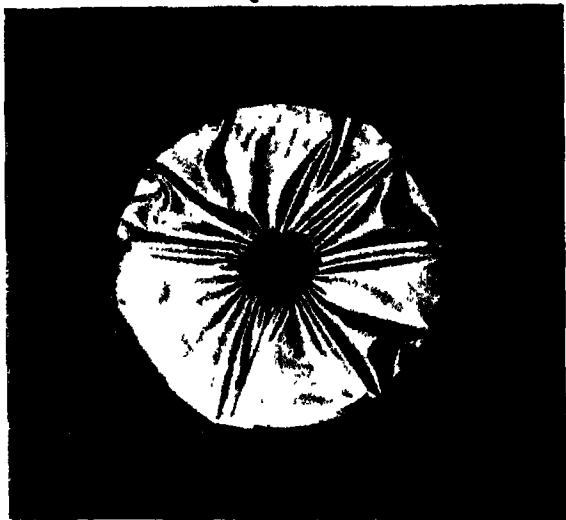
تصویر نمبر ١٠
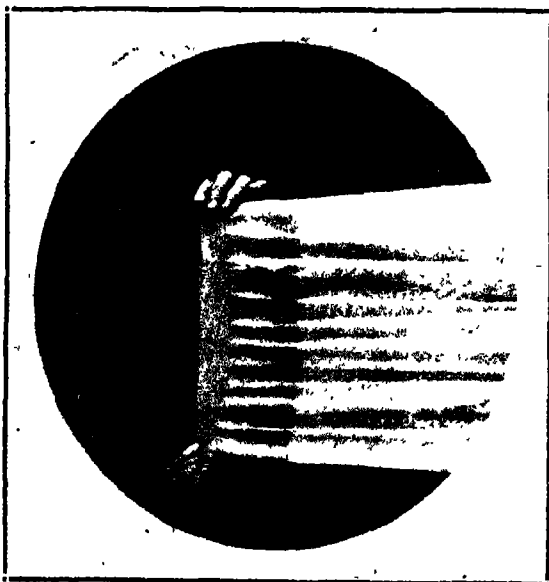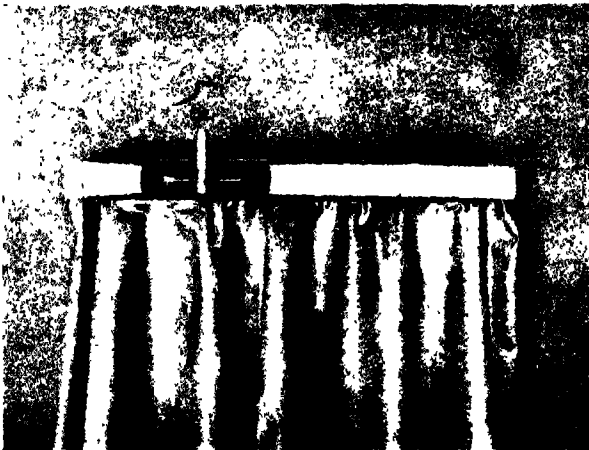
تصویر نمبر ١١

تصویر نمبر ۱۳

تصویر نمبر ۱۲

تصویر نمبر ۱۴
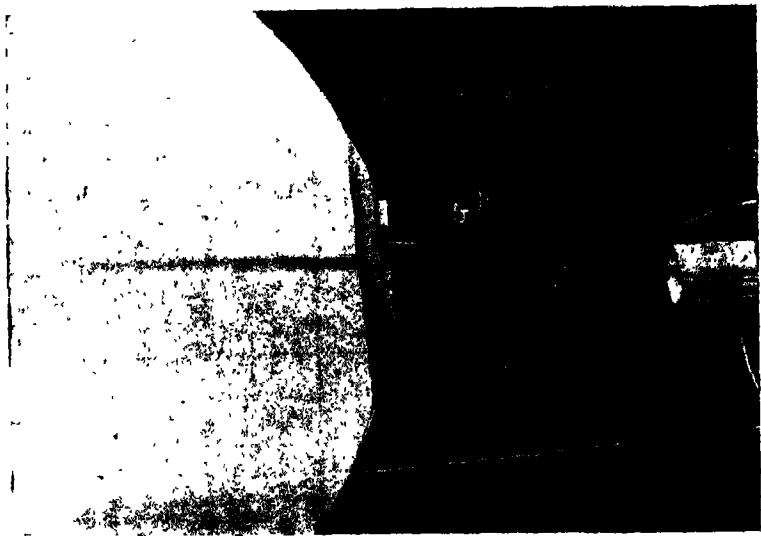
تصویر نمبر ۱۵

تصویر نمبر ۱۶
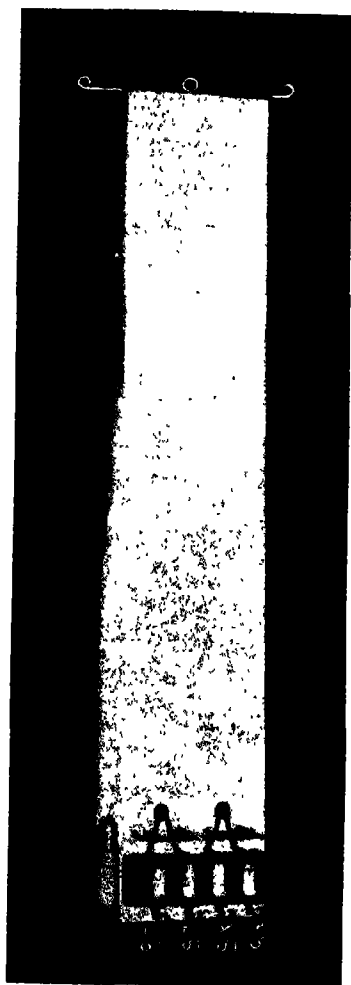
تصویر نمبر ۱۷

تصویر نمبر ۱۸
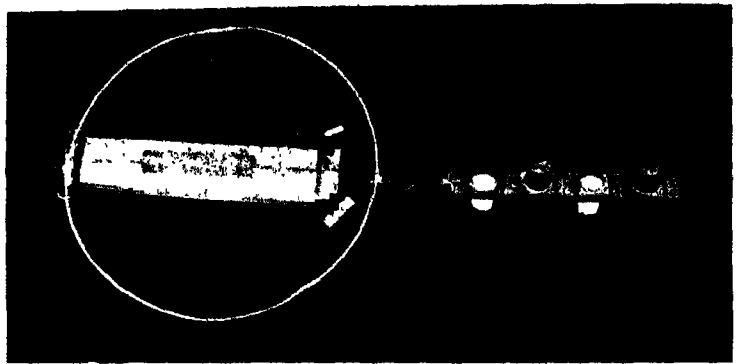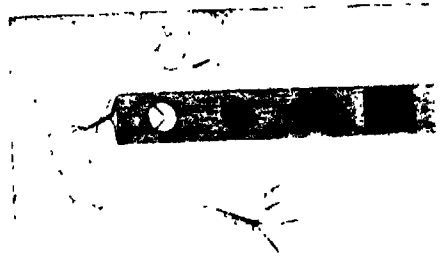
تصویر نمبر ۱۹

تصویر نمبر ۲۰
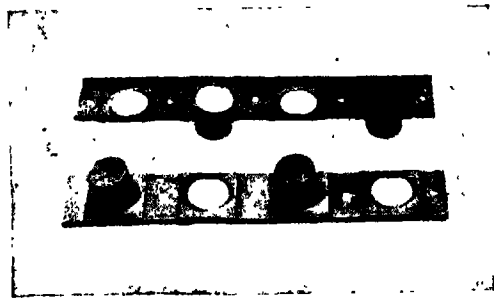
تصویر نمبر ۲۱
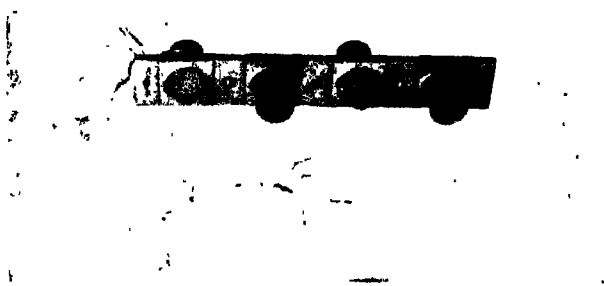
تصویر نمبر ۲۲

تصویر نمبر ۲۳
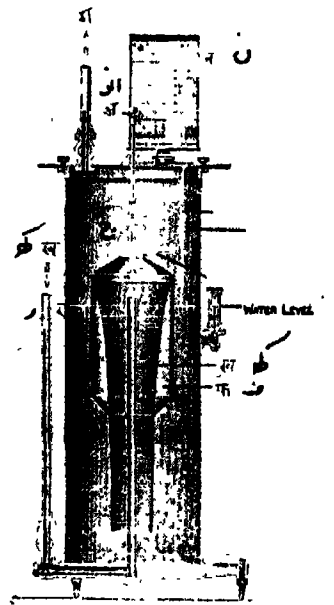
تصویر نمبر ۲۴
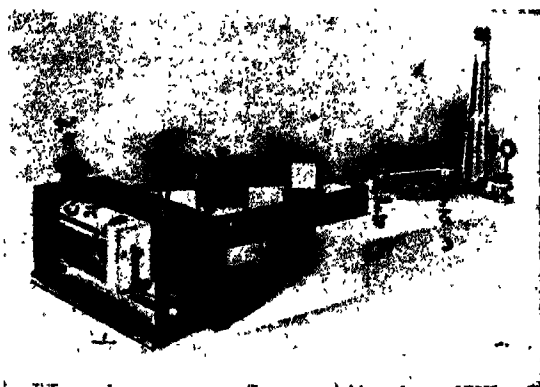
تصویر نمبر ۲۵
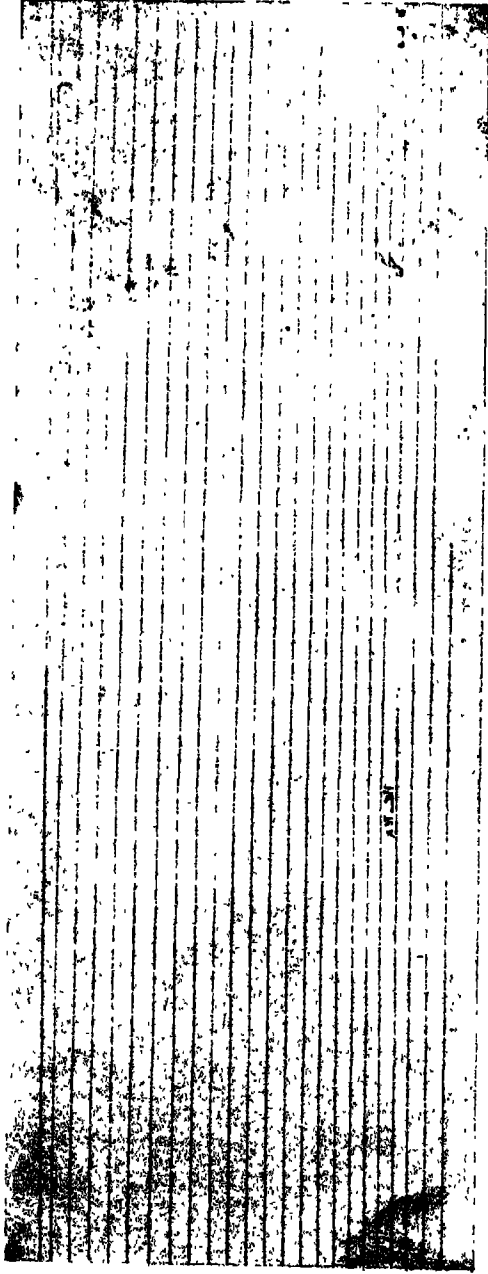
تصویر نمبر ۲۶

۷ مارچ سنه ۱۹۲۲ع کو ملنی شا زلزله پیما آلے کے ذریعه ایک کمزور زلزلے کی تحریر - زلزله 'الف' سے شروع هوا اور 'ب' پر ختم هوا هے

تصویر نمبر ۲۷

رصدگاہ کے ایک دوسرے قسم کے (اومری یونگ) زلزلہ پیما آلے کی تحریر -
یہ زلزلہ ۳ فروری سنہ ۱۹۳۱ع کو نیوزیلینڈ میں آیا تھا ۔ اس سے وہاں کا ایک شہر بالکل نیست و نابود ہو گیا اور ہزاروں
آدمیوں کی جانیں تلف ہو گئیں - تحریر الف سے شروع ہوئی ہے -

ان سب آلات کو دیکھکر اور اوپر کي هوا کے حالات معلوم کرکے واقعي سخت تعجب هوتا هے ' جب کبھي آپ آسمان کي طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتے هیں تو کیا دکھائی دیتا هے ؟ " ایک غیر محدود و بے پایاں خلا " - لیکن اگر آپ نے ایک مرتبہ بھی رصدگاہ کے ان آلات کو دیکھا هے اور هوا کي کچھ کہانیاں سنی هیں تو اُسي سلسلہ خلا کي طرف دیکھتے هي آپ کے دل میں بہت سے خیالات پیدا هو جائینگے - دیکھنے میں یہ خلا کیسا پرسکون اور ساکت و صامت هے لیکن بعض بعض اوقات کس قدر مہیب صورت اختیار کر لیتا هے ' اور کیسے کیسے هنگاموں کا مرکز بن جاتا هے - دیکھنے میں سیدھا سادھا هے لیکن در اصل بیحد پُر اسرار هے - اُس کے مخفي رازوں کا پتہ لگانے میں بہت سے ارباب علم نے اپني زندگي ختم کردی لیکن اس کے تمام رموز روشن و واضح نہ هو سکے - جتنا اس کی خصوصیتوں کا پتہ چلتا هے اتنا هي حیرت کا اضافہ هوتا جاتا هے - مئی کی جُھلسا دینے والي لو کے زمانے میں آپ کے اُوپر اتني ٹھنڈک هے جتنی شاید قطب شمالي میں بھي نہ هو -

هوائي رصدگاہ کا حال بیان کرنے سے پہلے مجھے یہ ضروري معلوم هوتا هے کہ میں ناظرین کو تھوڑا سا علم موسم[1] سے آشنا کرادوں - کیونکہ اوپر کي هوا کي تحقیقات ' علم موسم کا ایک خاص جز هے -

علم موسم در اصل عملی طبیعات[2] هے ' زمین کي رُت اور کرۂ هوا کے متعلق طبیعی قانون کی تحقیقات اس علم کا خاص

---

(۱) Meteorology.

(۲) Applied physics.

مقصد ھے - موسم کا ھمارے روز مرہ کے کاموں اور کھیتی باری پر
جو اثر پڑتا ھے وہ سب کو معلوم ھے - روزانہ موسم[1] یکساں نہیں
رھتا ، کوئی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت کیسا
موسم رھے گا ، لیکن فطرت کے تمام کام قانون کے مطابق ھوتے ھیں ،
اھل علم کا کام یہ ھے کہ فطرت کے ان چھپے ھوئے قوانین کا
سراغ لگائیں ، جب تک فطرت کے خاص قوانین کا پتہ نہیں چلتا
اُس وقت تک مختلف قسم کے واقعات کو دیکھکر عقل حیران ھوتی
رھتی ھے ، لیکن قوانین کا پتہ چلتے ھی سب حیرانی دور ھو
جاتی ھے ، اور سب باتیں خود ھی سمجھہ میں آجاتی ھیں ،
اُسی کے ساتھہ عالم کے پیدا کرنے والے کے کرشموں کا تھوڑا سا
تجربہ بھی ھو جاتا ھے ، علم موسم کے علما نے بہت سے پوشیدہ
قوانین ڈھونڈھ نکالے ھیں جن کی مدد سے ۲۴ گھنٹہ پہلے
آئندہ کا موسم معلوم ھو جاتا ھے - ھر مہذب ملک میں
موسمی مقیاس[2] کے محکمے قائم ھیں ، جو اپنے ملک کو
۲۴ گھنٹہ قبل موسمی پیشین گوییوں[3] سے مطلع کرتے رھتے ھیں -
ھندوستان میں بھی اس طرح کی موسمی پیشین گوئیاں ، پونا ،
کلکتہ اور کراچی سے شایع ھوا کرتی ھیں ، تمام ھندوستان میں
" علم موسم " کے متعلق تقریباً ۲۵۰ رصدگاھیں ھیں ، جن
میں ایک یا دو اور کہیں کہیں تین علم موسم کے ماھر[4] مقرر

Daily weather. (۱)

Meteorological Department. (۲)

Weather forecasting (۳)

Observers (۴)

هیں - ان میں تقریباً ۳۵ ہوائی رصد گاہیں ہیں جو برھما سے لیکر عرب تک پھیلی ہوئی ہیں ' ان مقامات سے حرارت[1] اور ہوا کے دباو[2] کے متعلق خبریں ' پونا ' کلکتہ ' کرانچی بذریعہ تار صبح آٹھ بجے تک پہونچ جاتی ہیں - یہ خبریں یہاں پہونچنے کے ساتھ ہی نقشے پر آثار لیجاتی ہیں ' اور پھر انھیں نقشوں سے پیشین گوئی کیجاتی ہے - بارہ روپیہ مہینہ چندہ دینے سے یہ پیشین گوئی روزانہ تار کے ذریعہ ہندوستان کے ہر مقام پر پہونچ سکتی ہے - انھیں پیشین گوئیوں کے ذریعہ بحری اور ہوائی جہازوں کی زندگی پہلے کی نسبت زیادہ محفوظ ہوگئی ہے ' بے تار کی خبر رسانی[3] کے ذریعہ یہ پیشین گوئیاں تمام جہازوں پر پہونچادی جاتی ہیں ' جس سے وہ آنے والے طوفانوں سے اپنی حفاظت کرسکیں اور جس طول البلد یا عرض البلد میں طوفان یا تیز ہوا کے امکانات معلوم ہوں ادھر نہ جائیں - اوپر کی ہوا کے بارے میں پوری معلومات حاصل کئے بغیر ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کرنا تو اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنا ہے ' ہوا کے گرداب پانی کے گرداب سے بھی زیادہ خطرناک ہیں ' اور اسی وجہ سے ہوائی جہاز بغیر موسمی پیشین گوئی حاصل کئے سفر نہیں کرتے - روز بروز موسمی علم کی قدر بڑھتی جارہی ہے اور اگر اس علم کے جاننے والوں کی ایسی ہی ہمت رہی تو امید کیجاتی ہے کہ انسان موسم پر بہت کچھ قابو پاجائیگا -

---

(۱) Temperature

(۲) Pressure

(۳) Wireless

تقریباً پچیس برس پہلے موسم کے بارے میں جو پیشین گوئیاں کی جاتی تھیں وہ صرف زمین کی سطح کی حرارت اور ہوا کے دباو کی معلومات کی بنا پر کیجاتی تھیں اور اسی لئے اکثر غلط ہوتی تھیں - لیکن جب لوگوں کی توجہ اوپر کی ہوا کی جانب مائل ہوئی اور اس کی تحقیق کیگئی تو معلوم ہوا کہ موسموں کا اوپر کی ہوا کی حرارت وغیرہ سے قریبی تعلق ہے چنانچہ طبیعین نے انہیں پچیس برسوں میں اوپر کی ہوا کے متعلق بہت سی عجیب باتیں دریافت کرلیں اور اب پیشین گوئی کے لئے بالائی ہوا کا علم ایک بہت ہی ضروری جزو ہوگیا ہے - تمام ملکوں میں ہوائی رصد گاہیں کھولی گئیں اور ہندوستان میں چ - ایچ فیلڈ صاحب کی کوشش سے انڈیا میٹرولجیکل ڈیپارٹمنٹ[1] کے ماتحت آگرہ میں ایک بہت بڑی رصدگاہ کھولی گئی - اس کے ماتحت اور چھوٹی چھوٹی رصدگاہیں بھی کھولی گئیں جو تمام ہندوستان ' برھما ' خلیج فارس اور عرب تک پھیلی ہوئی ہیں ان رصدگاہوں سے روزانہ ہایڈروجن گیس سے بھرے ہوئے غبارے اُڑائے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے بالائی حصۂ ہوا کی خبریں حاصل کرکے صبح آٹھ بجے تک پونا ' کلکتہ اور کرانچی پہونچا دیجاتی ہیں ' جہاں سے موسمی پیشین گوئیاں شائع کیجاتی ہیں -

جیسا کہ ابھی کہا جاچکا ہے ' روزانہ موسم اور ہوا کا بہت قریبی تعلق ہے اور ہوا کی کوئی مقررہ حد نہیں ' وہ تمام عالم پر آزادی سے چلتی رہتی ہے ' اس لئے روزانہ موسم کی

India Meteorological Department. (1)

معلومات کے لئے یہ ضروري ہے کہ تمام دنیا کے بالائي حصۂ ہوا کی جانچ کیجائے اور یہي وجہہ ہے کہ اس علم کي تحقیق کے لئے بین الاقوامی نظام کي ضرورت ہے - چنانچہ خوشی کي بات ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اس علم کی تحقیقات کے بارے میں متحدہ طور پر مدد دے رہی ہیں اور بین الاقوامي موسمی مقیاس کی کمیٹي بڑی کامیابي سے کام کر رہي ہے - ہندوستان بھي اس کمیٹی کا ممبر ہے -

ہندوستان میں آگرہ ایسا مقام ہے جہاں سال بھر میں تقریباً ۹۰ ڈگري (ف) حرارت گھٹتي بڑھتي رہتي ہے - جاڑے میں اتني سردی پڑتی ہے کہ حرارت کا درجہ ۳۰ ڈگری (ف) تک اور گرمی میں ۱۲۰ ڈگری (ف) تک پہنچ جاتا ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کي موسمي حالت میں بہت جلد جلد تغیرات ہوتے رہتے ہیں - یہاں ہر قسم کے بادل بھي دکھائي دیتے ہیں - انہیں وجوہ سے بالائي حصۂ ہوا کي تحقیقات کے لئے آگرہ مناسب مقام سمجھا گیا ہے یہ میں ابھي کہہ چکا ہوں کہ ہر رصدگاہ کا اصلی کام روزمرہ کی پیشین گوئی کے لئے اپنے مقام کے موسم کا حال تار کے ذریعہ پیشین گوئی کے مرکزی مقامات[۲] پر پہونچانا ہے - جن میں مندرجۂ ذیل باتیں لکھي جاتی ہیں :—

(۱) ہوا کا درجۂ حرارت -

(۲) ہوا کا دباؤ -

International Meteorological Committee (۱)

Forecasting Centres. (۲)

(۳) ہوا کا درجۂ برودت[1] -

(۴) زمین کی سطح سے لیکر ۶ کلومیٹر (۱میل = ۱۰۱ کلو میٹر کے) اوپر تک ہوا کی رفتار اور اُس کے آنے کی سمت[2] -

ان چار باتوں کے علاوہ بادل اور بارش کے متعلق اور بھی تھوڑی سی معلومات دی جاتی ہیں - پہلی تین باتوں سے ناظرین اچھی طرح واقف ہونگے، چوتھی بات معلوم کرنے کے لئے ہائڈروجن سے بھرے ہوئے ربڑ کے غبارے جن کا دور پھولنے پر ۱۰۰ انچ سے لیکر ۱۲۰ انچ تک ہو جاتا ہے، اُڑائے جاتے ہیں - ان غباروں کو ایک قسم کی دوربین سے جسے تھیوڈو لائٹ[3] کہتے ہیں دیکھا جاتا ہے - تھیوڈولائٹ کی مدد سے علم حساب کے رو سے فی ملٹ غبارے کی اونچائی اور اُفقی دوری[4] معلوم ہوتی جاتی ہے - غبارہ اُسی طرف جائیگا جس طرف ہوا چلتی ہے اور تھیوڈو لائٹ کے افقی زاویہ کو ملٹ ملٹ پر پڑھنے سے ہوا کی سمت معلوم ہوتی جاتی ہے اور آخر میں افقی دوری اور وقت سے ہوا کی رفتار مختلف اونچائیوں پر معلوم ہوتی جاتی ہے - جب آسمان صاف ہوتا ہے تو یہ غبارے اوپر آٹھ یا ۹ میل تک برابر دکھائی دیتے ہیں -

آگرہ بہت بڑی ہوائی رصدگاہ ہے اور یہاں مختلف طور کی سہولتیں حاصل ہیں، اس لئے یہاں معمولی غباروں کے علاوہ

---

(۱) Humidity.

(۲) Wind direction and Velocity up to 6 Kms.

(۳) Theodolite.

(۴) Horizontal displacement.

خاص قسم کے غباروں کے ساتھ آلات بھی باندھ کر اڑائے جاتے ھیں جن میں سے کچھ کا حال ذیل میں درج کیا جاتا ھے -

وزنی آلات کو اوپر بھیجنے میں زیادہ روپیہ خرچ ھوتا ھے ' یعنی صرف ایک چھٹانک وزنی آلہ کو اوپر لیجانے کے لئے غبارے اور ھائڈروجن ھی میں پچیس روپئے خرچ ھو جاتے ھیں اس لئے اس کام میں ھلکے سے ھلکے آلے کی ضرورت ھے - درجۂ حرارت معلوم کرنے کا کام دو ملی ھوئی دھاتوں سے لیا جاتا ھے - اگر انوار کا پتر پیتل کے پتر میں ملا دیا جائے تو اس ملی ھوئی دھات کا یہ خاصہ ھو جاتا ھے کہ گرم ھونے سے انوار کی طرف اور سرد ھونے پر پیتل کی طرف مڑنے لگتی ھے - یہ اتنی حساس ھوتی ھے کہ ایک ڈگری فارن ھائٹ کے درجۂ حرارت کے گھٹنے بڑھنے سے مڑنے لگتی ھے ' اس مڑنے کا حساب ' پارے کے مقیاس الحرارت سے کر لیا جاتا ھے - اس طرح کے مختلف اقسام کے دو دھاتوں[۳] کے بنے ھوئے تھرما میٹر بالائی ھوا کا درجۂ حرارت معلوم کرنے کے لیے استعمال میں لائے جاتے ھیں اور دباؤ کے معلوم کرنے کے لیے پارے کے باد پیما کے بجائے بے مائع باد پیما[۴] سے کام لیا جاتا ھے - جرمن سلور کے دو گول تھائی انچہ محیط کے ٹکڑوں میں گولائی پر پانچ یا چھ سکرئیں ڈال کر اور دونوں کو

---

(۱) Horizontal angle.

(۲) Mercury Thermometer.

(۳) Bi-metal Thermometer.

(۴) Aneroid Barometer.

سامنے رکھ کر کناروں پر ملا دیا جاتا ہے تاکہ دونوں ٹکڑوں کے بیچ کی ہوا نہ نکلے - اب باہر کی ہوا کا دباؤ کم ہونے سے اندر کی ہوا پھیلے گی اور گول ڈبیا پھول جائیگی یا دباؤ بڑھنے سے پچک جائیگی - اس گھٹنے بڑھنے کی ناپ پارے کے باد پیما سے کر لیجاتی ہے - ہوا کی رطوبت کو ناپنے کے لیے عورتوں کے بالوں کا استعمال ہوتا ہے ' بال نمی کو جذب کرنے والے[1] ہوتے ہیں یہ نمی پاکر بڑھ جاتے ہیں اور نمی کم ہونے پر سکڑ جاتے ہیں - اس گھٹنے اور بڑھنے سے رطوبت ناپی جاتی ہے -

ڈائنس میٹرو گراف[2] (تصویر نمبر ۲) - اس خود نما آلہ[3] سے ہوا کا درجۂ حرارت ' دباؤ اور رطوبت معلوم کی جاتی ہے اس کے موجد انگلینڈ کے مشہور ماہر علم موسم مسٹر ڈائنس صاحب آنجہانی ہیں - اس آلے کے ذریعہ سے قریب بیس میل بالائی حصۂ ہوا کے بارے میں معلومات حاصل ہو چکی ہیں اور بہت سے قدرتی قوانین روشنی میں آ چکے ہیں ' اس آلے میں ہوا کا دباؤ ناپنے کے لیے بے مائع باد پیما " ا " (تصویر نمبر ۲) رہتا ہے اور درجۂ حرارت ناپنے کے لیے دو دھاتوں کے پتر " ب " سانچے کے دو پتروں بے مائع باد پیما کے دونوں طرف ملے ہوئے ہیں ' ایک پتر پر ایک چوکھٹا " س " لگا ہوا ہے جس میں ایک کانچ کا ٹکڑا کالا کرکے پھنسا دیا جاتا ہے - دو دھاتوں کے

Hygroscopic. (۱)

Dines Meteorograph. (۲)

Self-registering. (۳)

پکر کا تعلق ایک سوئی " د ۱ " سے ہے جو کانچ کے ٹکڑے پر چلتی ہے - اس سوئی کے علاوہ دو اور سوئیاں ہیں ' ایک سوئی " د ۲ " کا تعلق بال ۷ سے اور تیسری سوئی د ۳ اسی طرح سانچے میں لگی ہوئی ہے ' اس د ۳ کا کام کچھ آگے چلکر سمجھایا جائیگا - جس وقت ہوا کا دباؤ کم ہونے لگتا ہے تو باد پیما ا جھولتا ہے اور کانچ کا سانچہ جس کا تعلق باد پیما سے ہے ایک طرف کھسکنے لگتا ہے - د ا جس کا تعلق دو دھاتوں والے پکر سے ہے درجۂ حرارت کے گھٹ جانے سے سیدھے اوپر کی جانب اور بڑھ جانے سے سیدھے نیچے کی جانب چلنے لگتی ہے - سوئی سے کالے کانچ پر نشان بن جاتا ہے - دباؤ کے گھٹنے بڑھنے سے کانچ داہنے بائیں چلتا ہے اور درجۂ حرارت کے گھٹنے بڑھنے سے سوئی اوپر نیچے چلنے لگتی ہے - اس طرح دباؤ اور درجۂ حرارت سے متاثر ہو کر کانچ پر ایک ٹیڑھی لکیر بن جاتی ہے ' اسی طرح رطوبت کے گھٹنے بڑھنے سے " د ۲ " سوئی اوپر نیچے چلتی ہے اور کانچ پر تحریر بناتی جاتی ہے - اس طرح کی ایک تحریر کا فوٹو تصویر نمبر ۵ ہے ' رصد گاہ میں آلے کے اڑانے سے پہلے مختلف درجہ ہائے حرارت ' دباؤ اور رطوبت کے مطابق کانچ کے ٹکڑے پر پیمانہ سا بنا لیا جاتا ہے جیسا کہ تصویر نمبر ۳ میں دکھایا گیا ہے - کانچ کے ٹکڑے کی لمبائی ایک انچ اور چوڑائی تین چوتھائی انچ ہوتی ہے ' تصویر پانچ گنا بڑی ہے -

آلے کے اڑانے سے پہلے اسے ایک المونیم کے ہلکے ڈھکنے میں بند کر دیتے ہیں جس کا منہ اوپر نیچے کھلا رہتا ہے - اس

کے بعد آلہ کو بانس کے ایک گول پنجرے کے بیچ میں باندھ دیتے ہیں (تصویر نمبر ۳) پنجرے میں چاروں طرف کچھ چمکتی ہوئی پنیاں اور چھپے ہوئے اشتہار باندھ دئے جاتے ہیں ' اشتہار میں آلہ کو آگرہ لانے والے کے لیے انعام اور سفر خرچ دینے کا اعلان درج ہوتا ہے - اس آلے کو ایک خاص طریقے کے والٹکس' (۱) کے غبارے میں باندھ کر اُڑا دیتے ہیں ' پورے آلہ کا وزن دو چھٹانک سے کم نہیں ہوتا لیکن غبارے میں اتنی گیس بھری جاتی ہے کہ ایک سیر بوجھ بھی اِس کے ساتھ اگر باندھ دیا جائے تو اوپر اُڑ سکے اتنی گیس بھر دینے سے یہ بڑی تیزی سے اوپر کی جانب اُڑتا ہے ' یہ غبارہ جتنا زیادہ اوپر چڑھتا جاتا ہے اتنا ہی وہاں کی ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے پھولتا جاتا ہے اور آخرکار قریب اٹھارہ یا بیس میل اوپر جانے کے بعد پھٹ جاتا ہے اور آلہ زمین پر گر پڑتا ہے - جب غبارہ اوپر چڑھتا ہے تو ہوا ' آلے تھیلے میں ہو کر اوپر سے نیچے گذرتی ہے ' اسی وجہ سے یہ آلہ ہوا کے درجۂ حرارت وغیرہ کو صحیح صحیح ظاہر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے - سورج کی کرنوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس کا چمکتا ہوا تھیلا کرنوں کا اثر آلے تک نہیں پہونچنے دیتا ' غبارہ ہوا کے ساتھ بہت دور تک چلا جاتا ہے اور] زیادہ تر اس طرح کے آلے آگرہ سے سو میل سے لیکر چار سو میل کی دوری تک گرتے ہیں ' بندھی ہوئی پنّیوں کو چمکتے ہوئے دیکھکر راهگیر اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انعام پانے کی لالچ

Valtex. (1)

سے اپنے ضلع کے کلکٹر کے پاس جہاں سے اُنھیں انعام اور سفر خرچ مل جاتا ھے ' لیجاتے ھیں - کلکٹر اس آلے کو آگرہ بھیجدیتا ھے -

جس وقت یہ آلہ واپس آجاتا ھے اُس وقت اُسی پر کے بلے ہوئے پیمانے کی مدد سے حرارت ' اور دباؤ کے درجے ' مختلف اونچائیوں پر نکال لئے جاتے ھیں - تصویر نمبر ٥ میں جو لکیریں پڑی ہوئی ھیں وہ درجۂ حرارت کی ھیں اور جو نقطے ھیں وہ دباؤ کے ھیں - ایک پوری لکیر سے ایک ھی درجۂ حرارت معلوم ہوتا ھے سب سے نیچی لکیر ' زمین کی سطح کا درجۂ حرارت بتاتی ھے اور اوپر کی لکیریں گھٹتے ہوئے درجۂ حرارت کی ھیں - زمین پر کی ہوا کا دباؤ کسی لکیر کے بائیں طرف کے نقطے سے معلوم ہوتا ھے اور داھنی طرف بڑھنے سے دباؤ کم ہوتا جاتا ھے - اسی طرح سب سے اوپر کی جانب رطوبت کا بھی پیمانہ بنا ہوتا ھے - اس طرح کا جو خودنما نقشہ حاصل ہوا ھے اس کی ایک تصویر یہاں دیجاتی ھے (تصویر نمبر ٥) سب سے اوپر رطوبت کی ناپ ملیگی اور سب سے نیچے صرف ایک لکیر ھے - " د م " سوئی جس کا بیان اوپر چھوڑ دیا گیا تھا یہ لکیر بناتی ھے - اس لکیر کا مطلب یہ ھے کہ آلہ کے ناپ شروع کرنے کے بعد اگر کانچ کا ٹکڑا کسی طرح اپنی جگہ سے ذرا بھی ھٹ جائے تو سوئی بھی اپنی جگہ سے ھٹ جائیگی اور آلے کے واپس آنے کے بعد شیشے پر دو لکیریں کچھی ہوئی ملینگی ' اور اگر دو لکیریں ہوئیں تو اس آلے کی پیمائش صحیح نہ سمجھی جائیگی ہوا کے دباؤ کا اونچائی سے تعلق ھے اور اسی تعلق سے یہ پتہ چل جاتا ھے کہ فلاں اونچائی پر درجۂ حرارت کیا ھے -

تصویر نمبر ۵ اس طریقے کے ایک آلے کی ایک تصویر ہے
جو آگرہ سے ۱۵ فروری سنہ ۱۹۱۳ع کو اڑایا گیا تھا اِس سے درجۂ
حرارت ، دباؤ اور رطوبت کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں اُن
کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے :—

اونچائی کیلو میٹر میں	دباؤ انچ	درجۂ حرارت	رطوبت فی صدی
۱	۵٫۲۶	۲٫۱۳	۷۵
۲	۴٫۲۳	۴٫۸	۹۱
۳	۲٫۱۰	—۳٫۲	۹۳
۸	۵٫۱۰	—۵٫۳۳	۱۸
۱۲	۷٫۵	—۰٫۵۰	۱۹
۱۶	٫۴	—۵٫۱۸	۴
۲۰	۵٫۱	—۸٫۱۱	×
۲۴	—۸٫۰۰	—۶٫۴۸	×
۲۶	—۹٫۰۰	—۷٫۴۲	×

بالائی حصۂ ہوا کا درجۂ حرارت بتانے والا یہ آلہ(۱) بالائی حصۂ
ہوا کے خشک جوفہ(۲) اور تر جوفہ(۳) کا درجۂ حرارت بتاتا ہے اور صرف

(۱) Upper Air thermograph.

(۲) Dry bulb.

(۳) Wet bulb.

ڈیڑھ یا دو میل بلندی تک کام میں لایا جاتا ھے ' تصویر
نمبر ۶ میں پورا آلہ دکھایا گیا ھے - اس آلے میں دو دھاتوں
کی شکل گول ھے - الف سے خشک جوفہ کا درجۂ حرارت اور
" ب " سے تر جوفہ کا درجہ حرارت معلوم ہوتا ھے - ان دونوں
" دو دھاتوں " کا تعلق دو پتلے پتروں ک ۱ اور ک ۲ سے ھے
جن کا سرا ' کھ ۱ " اور کھ ۲ کي طرف سوئي کي طرح نوکیلا
اور بیلن گ کی طرف مڑا ہوتا ھے لیکن بیلن کو چھوتا نہیں -
ان پتروں کے ذریعہ " دو دھاتوں " کا مڑنا اور بھي واضح ھو
جاتا ھے - دونوں نوکیلے سروں کے بیچ میں ایک اور سوئی
" کھ " ھوتی ھے - یہ تینوں سوئیاں ایک لمبي ' لیکن کم
چوڑی پتی " پ " کے ذریعہ دبائی جا سکتی ھیں - بیلن ایک
گھڑي کے ذریعہ گھومتا ھے جو ڈبیا " ن " کے اندر ھے - گھڑی
کے ذریعہ پہلے ایک ربڑ چڑھي ھوئي پھرکی[1] گھومتی ھے بیلن
کے دانت " س " اسی ربڑ سے ملے ھوئے ھوتے ھیں ' اس طرح
پھرکی کے گھومنے سے بیلن بھي گھومتا ھے " دو دھاتوں " پر ایک
باریک ململ باندھ دیجاتي ھے اور دو دھاگے کی بتیاں " را "
اور " ر ب " اس دھاگے کو بھیگا رکھتي ھیں ' یہ دونوں پتیاں
ایک پانی کی ڈبیا " ڈ " کے اندر ڈوبي رھتي ھیں ' بیلن پر
ایک پتلي سلولائیڈ[2] کا فلم لپیٹ دیا جاتا ھے - " پ "
پتی کے بیچ کا حصہ گول ھے جس سے ایک پیچ " ۷ " ملا ھوا
ھے اور اس کا تعلق ایک لیور " چ " سے ھے ' " چ " کا تعلق

---

(۱) Disc.

(۲) Celluloid.

ایک دندانے دار پہیہ سے ہے جو ایک چھوٹے سے پنکھے 'ف' (تصویر نمبر ۷) کے گھومنے سے گھومتا ہے - اس پنکھے کے گھومنے سے 'ع' پیچ ''پ'' پتی کو بار بار دباتا اور چھوڑ دیتا ہے۔ اس دبانے سے پتی کے نوکیلے سرے قلم پر نشان کرتے جاتے ہیں بیچ کی سوئی ''گھ'' ایک سیدھی لکیر کھینچتی جاتی ہے اور دونوں نوکیلے سرے درجۂ حرارت کے مطابق نقطے بناتے جاتے ہیں - آلے سے کام لینے سے قبل یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ ہر ایک درجہ[1] پر سوئیاں کتنی ہٹتی جاتی ہیں - تصویر نمبر ۸ میں اس طرح کی حاصل کی ہوئی تحریر دکھائی گئی ہے - بیچ کی سیدھی لکیر سے دونوں طرف کی دوری ناپ لینے سے دونوں طرح کے درجہ ہائے حرارت کا پتہ چل جاتا ہے -

اِس آلے کو ایک اوپر نیچے کھلے ہوئے ڈھکنے میں بند کرکے اور ایک بانس کے پنجرے کے بیچ میں باندھکر کلاؤن[2] بیلون کے نام کے ایک خاص قسم کے غبارہ کے ساتھ اُڑایا جاتا ہے - اس غبارہ میں یہ خاصّہ ہے کہ یہ حسب خواہش ہر بلندی سے گرایا جا سکتا ہے - اس کا پورا بیان آگے کیا جائیگا - غبارے کے اوپر چڑھنے سے آلے کا پنکھا گھومنے لگتا ہے اور گھومتے ہوئے بیلن پر سوئیاں نشان بنانے لگتی ہیں - اس غبارے کو تھیوڈو لائٹ سے دیکھا جاتا ہے جس سے ہر منٹ غبارے کی اونچائی معلوم ہوتی رہتی ہے - جس وقت غبارہ گرنے لگتا ہے وہ وقت سمجھکر ہوا میں آلے کے رہنے کا وقت معلوم ہو جاتا ہے - آلے کے گرنے کے وقت پنکھے

---

(۱) Degree.

(۲) Clown baloon.

کا گھومنا بند کرنے کے لئے ' کاغذ سے مڑے ہوئے اور چوکھٹے سے
لگے ہوئے کانٹے '' ق '' کو کام میں لایا جاتا ہے - (تصویر ۹) یہ کانٹا
آلے کے گرنے کے وقت '' ب '' کے اُٹھ جانے سے نیچے ہو کر اور پنکھے
میں پھنسکر اُسے گھومنے سے روک لیتا ہے - فرض کیجئے کہ ایک
آلہ دس منٹ ہوا میں رہا ' بیچ کی سیدھی لکیر (تصویر ۸)
گھڑي کے دس منٹ چلنے سے کھنچےگي - اس لکیر کو برابر دس
حصوں میں تقسیم کرنے سے ایک حصہ ایک منٹ کے برابر ہوا '
ٹیڑھی لکیروں کے کسی نقطے سے بیچ کی لکیر پر ایک آڑی لکیر
ڈال کر اُس کی لمبائی نکال لو - یہ پہلے ہی معلوم رہتا ہے کہ
ہر حصہ پر ہمارا دو دھاتوں کا پتر کتنا مڑتا ہے - اس طرح
درجۂ حرارت کا پتہ چل جاتا ہے ' کیونکہ آلے کو اُڑانے سے پہلے
سطح زمین پر کی ہوا کا درجۂ حرارت معلوم کر لیا جاتا ہے
اور ٹیڑھی لکیر کا پہلا نقطہ یہي درجۂ حرارت ظاہر کرتا ہے -
تھیوڈلو لائٹ کے ذریعہ غبارے کی فی منٹ اونچائی معلوم ہوجاتي
جاتي ہے ' اس کے بعد ہمیں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں
بلندی پر فلاں تر جوفہ اور خشک جوفہ درجۂ حرارت ہے ان دونوں
باتوں سے مختلف بلندیوں پر رطوبت کا بھي پتہ لگ جاتا ہے -

یہ غبارہ ہوائی رصدگاہ سے تھوڑي ہی دور پر گرتا ہے - اس
لیے جلد ہی مل جاتا ہے ' لیکن اس سے نتیجہ نکالنے میں وقت
لگتا ہے - اس کے موجد مسٹر گوری پت چٹر جي ہیں -

کلاؤن بیلون - جن آلوں کو کسی مقررہ بلندي سے گرانا ہوتا
ہے اُن کو اوپر اُڑا لیجانے کے لئے ایک خاص قسم کا غبارہ
کام میں لیا جاتا ہے جسے کلاؤن بیلون کہتے ہیں - یہ بہت

پتلے دلهري ربڑ کے بنائے جاتے هیں اور بہت پھول سکتے هیں ' اس میں گیس بھرنے کے لئے ایک چھوٹا سا منهہ هوتا هے جس کے پاس ایک دوسرا چهہ انچ کا ایک گول سوراخ هوتا هے ۔ اس بڑے سوراخ کے کنارے لپیٹ کر مضبوط کر دئے جاتے هیں (تصویر نمبر ۱۰) گیس بھرنے سے پہلے بڑے سوراخ کے دونوں سروں کو کھینچکر (تصویر نمبر ۱۱) دو لکڑی کے چپٹے ٹکڑوں کے بیچ میں فیتے سے باندهکر اور چار کاگ پھنسا کر فیتے کو تنگ کر دیا جاتا هے (تصویر ۱۲) فیتے کے دو سروں کے بیچ میں دو مثلث‌نما چھلوں کے ذریعہ ایک پتاس[1] میں بھگو کر سکھایا هوا دهاگا بندها هوتا هے (تصویر نمبر ۱۳) اور تاگے کے اندر کاغذ کي پتلي ایک انچ نلی " ک " (تصویر ۱۴) پرو دیجاتي هے - اس کاغذ کي نلی میں " U " کی طرح ایک نلي " ب " (تصویر نمبر ۱۵ یا ۱۶) پھنسا دیجاتي هے اس کانچ کي نلي میں تهوڑا سا گندهک کا تیزاب بھر کر ایک سرا موم اور ربڑ کي نلي سے بند کر دیا جاتا هے اور دوسرا سرا کاغذ کي نلي میں اتنا اندر کر دیا جاتا هے که پوتاس کے دهاگے کو چھولے - U نلي کے لگانے کا مقصد حسب ذیل هے -

تصویر ۱۴ ایک " U " نلی کی هے جس میں " ت ۱ " سے " ت ۲ " تک تیزاب بھرا هوا هے ' باقی نلي میں هوا هے - " ک " سرا موم اور ربڑ سے بند هے ، اور کھلا هوا " کھ " سرا پوتاس کے دهاگے کو چھوتا رهتا هے - اس طرح " ک " اور " ت ۱ " کے بیچ کی هوا رکی هوئی هے - اونچائي بڑهنے پر هوا کا دباؤ کم هوتا جاتا هے - اوپر جانے پر " ک " اور " ت ۱ "

---

(1) Potassium Chlorate.

کے بیچ کی ہوا کا حجم بڑھکر تیزاب کو "کھ" کی طرف ڈھکیلتا ہے اور یہاں تک کہ تیزاب "کھ" پر پہونچ کر دھاگے کو جلا دیتا ہے، دھاگا کھلتے ہی لکڑیاں الگ ہو جاتی ہیں اور بڑا منھہ کھلنے سے گیس نکل جاتی ہے اور غبارہ زمین پر گر پڑتا ہے -

بہت سے آلوں کو اوپر اُڑانے سے مختلف بلندیوں پر کے دباؤ کا علم حاصل ہو چکا ہے اسی کے مطابق اور گیس معادلات[1] - کے اصول سے نلی کے دونوں سرے اس طرح کاٹ دئے جاتے ہیں کہ صرف مقررہ اونچائی پر تیزاب "کھ" سرے تک پہونچتا ہے -

ملٹی پل[2] تمپریچر انڈیکٹر - یہ آلہ فوراً اشارہ کے ذریعہ سے بالائی حصۂ ہوا کے چار یا زائد درجۂ حرارت کو ظاہر کرتا ہے اور اس لیے موسم کی پیشین گوئی کے لیے بہت مفید ہے - ایسے چار درجہ ہائے حرارت ظاہر کرنے والے آلے کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے -

تصویر ۱۷ میں الف ۱ الف ۲ الف ۳، الف ۴ دو دھاتوں کے چار پتر ہیں، جو اوپر کی طرف نیچے کی جانب پتلے ہوتے گئے ہیں، ان کے بیرونی جانب انوار اور اندر کی جانب پیتل ہے جس سے درجۂ حرارت کم ہونے پر یہ پتر اندر کی جانب مڑتے ہیں، یہ پتر الومینیم کے ایک ہلکے ڈھانچے میں برابر کی دوری پر ایک لکڑی میں اس طرح جڑ دئے جاتے ہیں کہ

---

(۱) Gass Equation.

(۲) Multiple temperature Indicator.

ایک دوسرے کو چھو نہ سکیں - پتروں کے نوکیلے سروں سے تھوڑا سا اوپر سرکنے والی چار سوئیاں د۱، د۲، د۳ و د۴ ہوتی ہیں جن کا سرا لمبا ہوتا ہے - سلائیوں کا سرا، سلائیوں کے سرکنے سے پتیوں کو چھو سکتا ہے - دو دھاتوں کے چار پتروں کا برقی تعلق تانبے کے ڈھکے ہوئے تاروں کے ذریعہ ڈھانچے کے پیچھے کی جانب دھات کی پتلی نلیوں ی ۱، ی ۲، ی ۳، ی ۴ (تصویر نمبر ۱۸) سے کر دیا جاتا ہے - سرکنے والی سوئیاں الومینیم کے ڈھانچے میں جڑی ہوتی ہیں اس لیے برقی چکرا[1] کا دوسرا سرا الومینیم کا ڈھانچا ہو جاتا ہے - آلے کے اوپر الومینیم ہی کا ایک ڈھکنا چڑھا دیا جاتا ہے، جس میں تین چھوٹی بجلی کے خانوں[2] کی، ان کے ڈھکنے سمیت پھلانے کی جگہہ بھی رہتی ہے (تصویر نمبر ۱۹) بجلی کی بیٹری کے ایک سرے کا تعلق اس طرح الومینیم کے ڈھانچے سے ہو جاتا ہے اور دوسرا سرا تار کے ذریعہ الگ، لٹکتا رہتا ہے - یہ ہوا، آلے کے درجۂ حرارت ناپنے کا حصہ، اب اشارہ کرنے والے حصے کا بیان کیا جائیگا -

تصویر نمبر ۲۰ میں ایک لکڑی کی چپٹی تختی میں چار سوراخ دکھائے گئے، ان سوراخوں میں تانبے کے دو تاروں کے بیچ یوریکا[3] کا بہت باریک تار لگا ہوا ہے جو برقی رو سے گرم

---

(۱) Electrical circuit.

(۲) Cells.

(۳) Eureka.

هو کر سرخ هو جاتا هے ' سوراخوں کے دونوں سروں سے دو برقی
دراصل تار لگے هوتے هیں ' اس طرح تختی کے هر گوشه پر چار
تار هونے چاهئیں جیسا که تصویر میں دکھایا گیا هے ' ایک طرف
تو چار تار هیں لیکن دوسری طرف کے چاروں تار ملا کر ایک کر
دئے گئے هیں - چاروں سوراخوں کے ایک طرف پتلا کاغذ چپکا کر سرخ مسالا
جو تھوڑی سی گرمی پا کر مشتعل هو جاتا هے ' بھر دیا جاتا هے اور
دوسری طرف بھی پتلا کاغذ چپکا کر سوراخ بند کر دئے جاتے هیں تاکه
مسالا نه گرے ' یه تختی پیتل کے دو ڈھکنوں کے اندر بند کر دیجاتی
هے - (تصویر ۲۱) هر ایک ڈھکنے میں لکڑی کے سوراخ کے سامنے سوراخ
بنے هوتے هیں ' ایک ڈھکنے میں ایک سوراخ کو چھوڑ کر دو
پیتل کی گول ڈبیا پیدا دیجاتی هے - جن میں دھواں بھرنے کے
لئے سفید بارود بھری رهتی هے - (تصویر نمبر ۲۲) پاس کی دو ڈبیوں
کا منھ ایک طرف نہیں هوتا ' اس لئے آگ لگتے وقت شعله
کی لپک دوسری ڈبیا کے منھ پر نہیں جا سکتی - تار کے چاروں
گوشوں (۱ ' ۲ ' ۳ ' ۴) کو ی ۱ ' ی ۲ ' ی ۳ اور ی ۴ نلی میں
داخل کر دیا جاتا هے اور پانچویں تار کا سِرا بیٹری کے لٹکتے
هوئے حصے میں داخل کر دیا جاتا هے - (تصویر ۱۹) اس کے بعد
پورے آلے کو بانس کے ایک گھیرے میں باندھ دیا جاتا هے -

آلے کو هوا میں اُڑانے سے پہلے اسکی تعمیر[1] کر لیجاتی هے '
مثلاً همیں معلوم کرنا هے که کس اونچائی پر ۲۰ ڈگری ۱۵ ڈگری
۱۰ ڈگری اور ۵ ڈگری حرارت موجود هے ' تو پانی کی حرارت

Calibration. (۱)

برف ملا کر ٥ ڈگری کر لی اور اُس میں آلے کے حرارت پیما حصے کو اُلٹا کرکے اس طرح ڈبو دیا کہ سلائیاں پانی سے باھر رھیں اب پہلی سلائی را کو کھسکا کر آلہ دو دھات کے پتّر سے مس کر دیا ' اس طرح پانی کا درجۂ حرارت ١٠ ڈگری ١٥ ڈگری ٢٠ ڈگری کر کے یکے بعد دیگرے بقیہ تین سلائیوں (٢ ' ٣ ' ٤) کو دو دھات کے پتروں الف ٢ ' الف ٣ ' الف ٤ سے مس کر دیا اور آلے کو پانی سے باھر نکال لیا ' جہاں درجۂ حرارت کے بڑھ جانے سے پتر ' سلائیوں سے دور ھو جائینگے ' اس طرح ایک پتر ایک ھی مقررہ درجۂ حرارت پر سلائی کو چھوتا رھے گا -

آلے کو غبارے سے باندھ کر ھوا میں اڑا دیتے ھیں ' جس وقت غبارہ مقررہ درجۂ حرارت کی سطح پر پہونچ جاتا ھے ' اُس وقت پتر ' سلائیوں کو چھو لیتے ھیں اور برقی[١] دور کے پورے ھونے سے سرخ مسالے میں آگ لگجاتی ھے اور پھر اُس سے دھوئیں کے مسالے میں بھی آگ لگجاتی ھے اور بہت سا دھواں پیدا ھو جاتا ھے ' تھیوڈو لائٹ سے یہ دھواں صاف معلوم ھوتا ھے اور اس طرح اُس درجۂ حرارت کی سطح کی بلندی فوراً معلوم ھو جاتی ھے ' آگ لگجانے سے بوریکا کا باریک تار جل جاتا ھے اور برقی دور ٹوٹ جاتا ھے لیکن بیٹری خراب نہیں ھونے پاتی ' اسی طرح دوسرے پتر بھی اپنے اپنے درجۂ حرارت پر سلائیوں کو چھوتے ھیں اور دھواں پیدا ھو جاتا ھے - اس طرح حسب خواھش درجۂ حرارت کی بلندیاں معلوم ھو جاتی ھیں -

---

(١) Electrical circuit

اب اُن خودنما آلوں کا حال بیان کیا جائیگا جو زمین کی سطح پر متھاسی[1] عناصر کے ناپنے کے لئے رصدگاہ میں استعمال کئے جاتے ہیں -

تصویر نمبر ۲۲ بیٹس پول ہٹ[2] کا ہے - یہ چھوٹا سا مکان رصدگاہ کی خاص عمارت سے تقریباً ۲۰۰ فٹ کی دوری پر ہے ' اس میں ہوا کی رفتار اور اُس کا رخ ناپنے کا ایک خودنما آلہ لگا ہوا ہے - ہوا کے چلنے سے جو کسی پر خاص دباو پڑتا ہے اُسی کے اُصول پر یہ آلہ کام کرتا ہے -

تصویر ۲۳ میں زمین سے ۱۰ فٹ کی اونچائی پر ایک ہوائی پلکھا " ک " لگا ہوا ہے ' جس کا دوسرا سرا بیضاوی اور کھوکھلا ہے - ہوائی پلکھے کا ہوا کے ساتھ گھومنے کے باعث یہ بیضاوی سرا ہمیشہ ہوا کی طرف رہتا ہے - اس لئے ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اس میں ہوا بھر جاتی ہے اور اس میں سے ہو کر ایک لمبی نلی " کھ " میں چلی جاتی ہے - جس کا ایک سرا کھوکھلے بیضاوی سرے سے اور دوسرا خاص آلے سے ملا ہوا ہے ' ہوا کے اندر جانے سے نلی کے اندر کی ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور اس طرح جتنی زیادہ ہوا کی رفتار ہوگی اتنا ہی نلی کے اندر زیادہ دباؤ ہوگا - ہوائی پلکھے کے کچھ نیچے ایک اور لمبی نلی ' گ '' شروع ہوتی ہے جس کے

Meteorological Elements. (1)

Bates Pole Hut. (2)

بالائي حصے میں آر پار چھوٹے چھوٹے سوراخ ھیں ' اس نلی میں ھو کر ھوا چلنے سے نلي کے اندر کی ھوا کا دباؤ کم ھو جاتا ھے - اس نلی کا تعلق بھي خاص آلے سے ھے -

تصویر ۲۴ خاص آلے کے اندرونی حصے کي ھے ' جو چھوٹے سے گھر (تصویر ۲۳) کے اندر لگي ھوئی ھے - "ڈ" گول کھوکھلے برتن کا اندرونی حصہ ھے جس میں "ر" کے نشان تک پانی بھرا ھوا ھے - پانی میں ایک کھوکھلا برتن "ف" الٹے ملھ تیرتا ھے ' لمبي نلي "کھ" (تصویر ۲۳) اس تیرتے ھوئے برتن کے اندر تک چلی آئی ھے - "ف" کا تعلق ایک ھوا بلند[1] سوراخ کے ذریعہ ایک قلم "ا" سے ھے ' ایک بیلن[2] "ن" پر جو گھڑي کے ذریعہ ۲۴ گھنٹے میں ایک پورا چکر لگاتا ھے ایک نشان لگانے کے لیے خانہ دار کاغذ لگا دیا جاتا ھے - کاغذ پر وقت کے نشان ' ھوا کي رفتار اور سمت کا پیمانہ چھپا ھوتا ھے ' قلم اسي کاغذ پر لکھتا جاتا ھے ' چونکہ بیلن گھومتا ھے اس لیے اُس سے لپٹا ھوا کاغذ بھي گھومتا ھے اور "ف" سے لگا ھوا اور اپني جگہہ پر رکا ھوا قلم "ا" ھوا کي رفتار کے مطابق اوپر نیچے چلتا ھوا لکھتا جاتا ھے -

دوسري نلي "ک" (تصویر نمبر ۲۳) کا تعلق "ڈ" کے بالائي حصہ "ج" سے ھے (تصویر نمبر ۲۴) ھوا کے چلنے سے "کھ" نلي کے ذریعہ "ف" برتن کے اندر ھوا کا دباؤ بڑھا اور ساتھ ھي ساتھ "گ" نلی کے ذریعہ "ڈ" کے اندر کا

---

(۱) Air-tight.

(۲) Drum.

دباؤ کم ہوگیا - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "ف" اوپر کو آسانی سے اٹھ سکتا ہے، جتنی ہوا کی رفتار تیز ہوگی، اتنا ہی زیادہ "ف" اوپر کو اٹھے گا، اور ساتھ کا لگا ہوا قلم بھی اوپر کو اٹھے گا - اسی لیے خانہ دار کاغذ پر ہوا کی رفتار کا پیمانہ نیچے سے اوپر کی جانب رہتا ہے اور ہوا کے پنکھے کا تعلق ایک پتلی چیز کے ذریعہ ایک دوسرے قلم سے کر دیا جاتا ہے، جو ہوا کی رفتار کے نشانات بناتا جاتا ہے -

بھٹس پول ہوس کے نزدیک ہی تقریباً ۲۰ فٹ نیچے ایک تہ خانہ میں دو زلزلے کی رفتار ناپنے کے آلے لگے ہوئے ہیں جو مندرجہ ذیل اصولوں پر بنائے گئے ہیں -

زمین کے اندر بڑی بڑی چٹانوں کے ٹوٹنے یا بہت سی مٹی کے ایک ساتھ کھسکنے کے باعث زلزلے آتے ہیں، خصوصاً ۹۰ فیصد زلزلے کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کی وجہ سے آتے ہیں - زلزلے کے مرکز سے چاروں طرف اسی طرح زمین میں لہریں دوڑتی ہیں جس طرح پر سکون پانی میں پتھر پھینکنے سے لہریں پیدا ہو کر چاروں طرف پھیلنے لگتی ہیں اب اگر کوئی چیز زمین میں بہت گہری گڑی ہو تو زمین کے ہلنے سے وہ چیز بھی ہلے گی - اسی اصولوں کے مطابق یہ زلزلے کی رفتار ناپنے والے آلے کام کرتے ہیں - تقریباً ۲۰ فٹ زمین کے نیچے سے آٹھ فٹ اوپر تک ایک ستون اینٹ اور چونے کا بنا ہوا ہے، زمین کے ہلنے سے یہ ستون بھی ہلے گا اور اس کے اوپر لگا ہوا (تصویر ۲۵) افقی رقاص[1] "د" بھی ہلے گا - اس رقاص کی مدد سے بہت

Horizantal pendulum. (1)

ھی ھلکا زلزلہ بھی ۲۰۰ گنا زیادہ نمایاں ہوتا ھے - اسی رقاص میں لکھنے والا حصہ[1] لگا دیا جاتا ھے ' جس کے ذریعہ زلزلے کے نشانات درج ھو جاتے ھیں - ان نشانات کی مدد سے آلے کے ذریعہ زلزلے کے مرکز کی دوری فوراً معلوم ھو جاتی ھے تصویر ۲۱ ملنی شاہ زلزلے کی رفتار معلوم کرنے والے آلے کی ھے ' اِس آلے میں نشانات فوٹو کے ذریعہ حاصل ہوتے ھیں ' رقاص " د " کے آگے ایک چھوٹا سا شیشہ " س " لگا ھے ' " ب " سے بجلی کی روشنی شیشے پر پڑتی ھے اور اس سے منعکس ھو کر " ل " کے تال سے ھوتی ھوئی " ن " کے بیلن پر ایک نقطہ کی شکل میں پڑتی ھے بیلن پر فوٹو کے ذریعہ تصویر چھاپنے کا برومائڈ کاغذ لپٹا رھتا ھے جسے تیھولمپ کرنے سے نشان نمایاں ھوجاتا ھے (تصویر ۲٦) اس طرح کے آلے بہت ھی حسّاس ہوتے ھیں زلزلے مہینے میں کئی بار آتے ھیں لیکن وہ اتنے کمزور ھوتے ھیں کہ ھمیں بغیر آلے کی مدد کے محسوس نہیں ھوتے -

ان آلوں کے علاوہ اور بھی بہت سے قسم کے حرارت ' د باؤ ' رطوبت اور دھوپ کے درجے ناپنے والے خود نما آلے ھیں جن کا بیان اس چھوٹے سے مضمون میں نہیں ھو سکتا ' کیونکہ اگر ان آلات ھی کے بارے میں لکھا جائے تو ایک بہت ھی عجیب کتاب طیار ھوسکتی ھے ' اور اِن آلات کے ذریعہ قوانین قدرت کی معلومات کا بیان تو بے حد تعجب خیز اور دلکش ھوگا -

علم مقیاس روز بروز ترقی کرتا جا رھا ھے اور اس سائنس کے ایک ایک موضوع پر دنیا کے تمام مہذب ممالک میں سیکڑوں

---

(1) Recording part.

اهل علم تحقیقات کر رہے ہیں' انہیں تحقیقاتوں میں مدد دینے کے لیے یہ آلات ایجاد ہوئے اور نئے نئے قسم کے ہوتے جا رہے ہیں' اگرچہ ابھی تک قدرت کے اہم اصولوں کا پتہ نہیں لگ سکا ہے تاہم بہت سے اٹل قوانین روشنی میں آ چکے ہیں اور انہیں کے ذریعہ موسمی پیشین گوئیاں ممکن ہو گئی ہیں - کچھ بھی سہی جس وقت اهل علم کو اس سائنس کا پورا راز منکشف ہو جائیگا اس وقت انسان کی حکومت مقیاسات پر بھی کئی گنا بڑھ جائیگی -

(ترجمہ)

"مراۃالہند"

از پنڈت منوہر لال زتشی' ایم - اے

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنہ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو برطرف کرکے اودھ کا صوبہ اپنی مملکت میں ملا لیا سنہ ۵۷ء میں غدر شروع ہوا اور دو سال سے زیادہ اس شورش میں گزر گئے - دلی کي طرح لکھنؤ بھی غدر کا مرکز تھا اور مورخین کا بیان ہے کہ اودھ میں صرف ہندوستانی فوج نہیں بلکہ ہندوستانی رعایا بھی غدر کے ہنگامہ میں شریک تھی کیونکہ شاہان اودھ کی بے عنوانیوں کے باوجود الحاق اودھ سے لوگ ناخوش تھے اور کمپنی کے اس فعل کو برا سمجھتے تھے - سنہ ۵۹ء میں پھر امن و امان قائم ہوا اور بندوبست محکمۂ مال' عدالتہاے دیوانی و فوجداری' مدارس، سرشتۂ تعلیم اور اسي طرح کے مختلف ذرائع سے نئے خیالات اودھ میں پھیلنے شروع ہوے - لکھنؤ میں لا مارٹینیر کالج (La Martiniere College) قائم ہوا جس میں اس وقت اینگلو انڈین اور یوریشین طالب علموں کے علاوہ ہندوستانی لڑکے بھي تعلیم پاتے تھے - اس کے بعد کیننگ کالج (Canning College) قائم ہوا جس میں اسکول کے کلاس بھي کھلے ہوئے تھے - متوسط درجے کے ہندوستانیوں میں جو اکثر نوکري پیشہ تھے نئے خیالات اور نئی تعلیم کی اشاعت ہونے

لگي - بزرگوں سے میں نے پنڈت شیو نرائن عرف بہار کا نام سنا ہے اُس زمانے کے لوگ اُن کو خیالات مغربی کا پیشرو اور مصلح قوم سمجھتے تھے پنڈت شیو نرائن کشمیری پنڈت تھے اور اُنھوں نے پہلے اپنی برادری کی اصلاح اور بہبودی کے واسطے ایک ماہانہ رسالہ " مراسلۂ کشمیری " کے نام سے جاري کیا - پنڈت سری کشن جو اس زمانے میں جوتیشلي کي عدالت کے ایک ممتاز وکیل تھے اور پنڈت پران ناتھ جو کیننگ کالج میں ماسٹر تھے ، پنڈت شیونرائن کے معین و مددگار تھے - اور ان کے انتقال کے بعد اِن دونوں صاحبوں نے پنڈت شیو نرائن کی تحریک کو جاري رکھا - پنڈت شیونرائن اور ان کے مددگار تنگ خیال نہ تھے " مراسلہ کشمیر " کے علاوہ اُنھوں نے ایک انجمن عام ہندوستانیوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت " جلسۂ تہذیب " کے نام سے قائم کی جس میں کتب خانہ کے علاوہ لکچروں اور علمی مجالس کا بھي انتظام تھا یہ انجمن محض کتب خانے کي حیثیت سے اب بھي لکھنؤ میں قائم ہے مگر گم نامی اور کس مپرسی کي حالت میں ہے - یوں کہئے کہ اپني گذشتہ عظمت کے مزار پر چراغ جلائے ہوئے ہے اِس انجمن کے علاوہ ایک رسالہ مرآۃ الہند کے نام سے شایع کیا گیا جو کسی خاص برادري یا مذہب سے مخصوص نہ تھا بلکہ اُس کا تعلق کُل ہندوستانیوں سے تھا - میرے پاس اکتوبر سنہ ۱۸۷۵ع سے لے کر ستمبر سنہ ۱۸۸۱ع تک اس رسالہ کے بہتر نمبر موجود ہیں اور میں ہندستاني کے ناظرین کو دکھلانا چاہتا ہوں کہ غدر کے محض سترہ اٹھارہ برس بعد انگریزي تعلیم کی تھوڑي سي اشاعت کے اثر سے اس وقت لکھنؤ کے پڑھے لکھے طبقے میں

کس طرح کے خیالات پھیلے ہوئے تھے اور آج سے پچاس پچھن برس پہلے سیاسي ' سوشل اور اقتصادی صیغوں میں هندوستاني کن اصولوں کو اور کس روش کو اپنی قوم اور اپنے ملک کے لیے اچھا سمجھتے تھے - آج کل انگلستان اور نیز هندوستان کے بعض اخباروں نے ایک دستور جاري کیا هے که وہ اپنے پرانے نمبروں میں سے سو یا پچاس برس پہلے کے اقتباسات شائع کرتے هیں تاکه پڑھنے والوں کو معلوم هو که سو یا پچاس برس پہلے لوگوں کے کیا خیالات تھے اور اب کیا خیالات هیں ' اُس وقت سیاسي اصول کیا تھے اور اب کیا هیں اُس وقت لوگوں کو کن باتوں کا شوق تھا اور ملک کی بہبودي اور قوم کي ترقی کے کیا وسائل تھے - مراۃالهند کي پراني جلدیں اِس لحاظ سے نہایت دلچسپ اور کارآمد هیں اور اُن کا مطالعہ نہایت سبق آموز هے -

رسالہ کے سر ورق پر پہلي سطر کی عبارت هے " رسالہ متجاریہ مہتمساں مراسلہ کشمیر " اور انگریزي الفاظ میں اس کا ماٹو هے Read & Improve - پڑھو اور فائدہ اٹھاؤ - " اشتہار رسالۃ هذا " کے عنوان کے نیچے تیسرے صفحے پر غایت و غرض رسالے کي یوں بیان کي گئي هے -

" غرض خاص اس رسالے کي یہ هوگي که هندوستان کی ترقي و رونق هو جملہ ساکنان هندوستان کو دولت و عزت کامل حاصل هو علم و هنر و تہذیب و اخلاق کي یہاں خوب ترقي هو فیمابین کل اقوام کے محبت و اتفاق پیدا هو هم لوگ اپنے حالات و خیالات کو بہ آساني سرکار تک پہونچا کر هر ایک طرح کي ایسی مدد سرکار سے حاصل کر سکیں جو منصف اور نیک نہت

حاکم کي طرف سے اپنی رعیت کے نسبت فرض ہے اور سرکار کے منشاء و خیالات صحیحہ سے صاف طور سے ہم سب کو آگاہی ہوتی رہے" -

معاونان و خیر اندیشان ہند سے درخواست کي گئی ہے کہ اقسام ذیل کے حالات و مضامین سے آگاهي دیا کریں " تجارت - کیفیت رئیسان - تعلیم علوم - پیشہ و حرفہ و ہنر و دستکاري - تاریخ - کمیٹی و جلسہ ہاے مفید عام - کیفیت ممالک غیر - رسم و رواج اور عادات لوگوں کے" وغیرہ - مضامین دو قسم کے ہیں اڈیٹوریل اور مراسلات ، مگر اڈیٹر کا نام کسي جگہ ظاهر نہیں کیا گیا ہے - اشتہارات بھي تھوڑے بہت چھپتے تھے چنانچہ دوسرے هي نمبر میں ایک " اشتہار اکسیر عجیب " کا درج ہے یہ اشتہار نمک سلیمانی اور چورن کا ہے جو " داناے عصر فلاطون دهر درویش کامل فقیر باذل میر الفت علی شاہ صاحب رمّال لکھنؤ نے کہ فن رمل میں بھي یگانہ آفاق ہیں واسطے فائدۂ عام کے طیار فرمایا ہے واضح ہو کہ یہی نمک اور چورن حکیم ارسطو نے واسطے سکندر کے نہایت مفید سمجھ کر بنایا تھا قیمت نمک في تولہ ا - اور قیمت چورن کی فی تولہ ۲ پیسہ " معلوم نہیں اِس اِسطو کے چورن کي بکري کیسی ہوئي -

ان پرانی جلدوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ہندوستانیوں کو جنگ روم روس اور محاربہ افغانستان سے خاص دلچسپی تھي - " مرأةالہند ، گو ماهانہ رسالہ تھا مگر اُس میں خبریں بھی چھپا کرتي تھیں اور ممالک غیر کی خبریں اکثر روم اور افغانستان کے متعلق ہوتی تھیں - زمانہ حال کے

بہ‌نسبت ہندوستانی ریاستوں پر زیادہ نظر تھی اور اکثر کشمیر ' اندور ' پٹیالہ وغیرہ کے رئیسوں کی تعریف اور تنقید میں مضامین چھپا کرتے تھے - پرنس آف ویلس کا دورہ ہندوستان میں اسی زمانہ میں ہوا تھا اِس دورہ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ نہایت دلچسپ ہیں - ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو -

" علی‌ہذالقیاس ہمارے نزدیک اس سیر و سفر سے انگلستان کا فائدہ اس قدر ہے کہ انگریزوں کی وقعت اور آبرو ' شاہزادہ صاحب کی شائستگی اور جوش اخلاقی کی وجہ سے ہندوستانیوں میں زیادہ ہوگی اور جو حال انگریزوں کی کج خلقی کا عموماً ہندوستانیوں کے دل پر ہے وہ کسی قدر کم ہو جائیگا یہ سمجھ کر کہ انگلستان کے شاہزدہ اور امیر اور رئیس مثل ولیعہد بہادر کے ہیں کے اور برخلاف ان کے شاید وہ انگریز جنھوں نے ہندوستان میں ہندلستانیوں کو گالیاں دینا اور ان کو بہ‌نسبت اپنے عموماً حقیر سمجھنا اپنا شیوہ کر لیا ہے انگلستاں کے شُرفازادوں میں سے نہیں ہیں رہا ہندوستان اس کا فایدہ تو درکنار ہم کو خوف ہے کہ کہیں نقصان نہ ہو جائے اب ہماری صرف یہ بحث ہندوستانیوں سے متعلق ہے اور خاص ہندوستانی ریاستوں سے جہاں لکھو کہا روپیہ کا سامان فراہم ہو رہا ہے اور جا بجا سے مختار اور وکیل ولایتی مال خریدنے کے واسطے کلکتہ اور دیگر صدر مقامات پر بھیجے جاتے ہیں اس خیال سے کہ ولیعہد بہادر ایسے کم سن ہیں کہ مثل بچوں کے ولایتی کھلونے دیکھ کر بہل جاوینگے یا اپنے اوپر قیاس کرکے وہ مثل ایسے ہندوستانی رئیسوں کے ہیں کہ ولایتی شیشہ آلات کی چمک دمک دیکھ کر خوش

ہو جاویلگے - یاد رہے کہ اگر ہندوستان میں کروڑھا روپیہ بھی
صرف ہوں تو وہ سامان مہیا ہونا ممکن نہیں جو انگلستان یا
فرانس کے مختلف کھیل گھروں میں اس وقت موجود ہے اور وہ
شخص جس نے یہ سامان دیکھے ہیں اس کی نظر میں ولایتی
اسباب سے ہندوستانی مکانات کی زیبائش کیا جتنے کی روپیہ صرف
کرکے بیوقوف بننا کس نے کہا ہے اور اپنی آپ تحقیر کرانا
عقلمندی کا کام نہیں ہے - بفرض محال اگر ولیعہد بہادر یہ
سمجھے بھی کہ ہندوستانیوں کو ہماری بڑی محبت ہے ہماری
تواضع و تکریم میں انہوں نے لاکھوں روپیہ جا بیجا پھونک دیا
اس کے ساتھ یہ خیال بھی ضرور کرینگے کہ ہندوستانیوں میں
اب تک وہ ظاہری زیبائش جس کے سبب سے یہ ملک برباد
ہوا نہیں گئی........اس موقع سیر و سفر ولیعہد بہادر پر کیا
ایسا ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان میں شہزادہ صاحب کی
تواضع و تکریم ایسی چیزوں سے کی جاے جو خاص ہندوستان
کی پیداوار ہوں یہ ایک عمدہ وسیلہ ہندوستانی صنعتوں کی
نشوو نما کا ہوگا اور انعام و اکرام کی امید سے عمدہ ترین اشیا
خود ہندوستان میں بہم ہو جائیں گی بلکہ یہ ایک کرشمہ دوکار
کا نقشہ ہوگا یعنی ہندوستانی صنعتوں کی ترقی جس سے ہندوستان
کا روپیہ غیر جگہہ بھی نہ جانے پاے گا دوسرے ولیعہد بہادر کی
عمدہ ترین دلبستگی کہ ہر ریاست اور ہر شہر میں ایک عجائب خانہ
یا نمائش گاہ پیش نظر ہوگا جس کے ذریعہ ہندوستان اور ہندوستانیوں
کا تجربہ بہ آسانی ہو سکتا ہے بلکہ خاص فائدہ سیر و سفر کے
بجز اس کے اور کسی صورت سے عمدہ طور پر ممکن بھی نہیں
ہے" (مراۃالہند نمبر ۱ صفحہ ۱۶)

آپ نے دیکھا سدیشی کی گرمی بازار آج کل ہے مگر اس کا چرچا سنہ ۷۵ میں بھی تھا اور پرنس آف ویلس کے دورہ کے ضمن میں تھا ایک اور جگہہ اسی ضرورت کو وضاحت کے ساتھہ یوں بیان کیا ہے -

" ایک طرف سے یہ صدا آتی ہے کہ ہاے ہندوستان کو روز بروز افلاس گھیرے لیتا ہے دوسرے جانب سے یہ آواز آتی ہے کہ اب رذیلوں کی قدر ہے اشراف کی مٹی خراب ہے روزگار علقا ہے پڑھے لکھے روٹیوں کو محتاج ہیں تیسری جانب سے یہ فریاد سنتے ہیں کہ افسوس خدا نے ہم کو ہند میں کیوں پیدا کیا کاش چمار یا مہتر ہی بنانا مگر انگلستان میں پیدا کرتا کہ جس میں یوں ذلیل و رسوا نہ ہوتے غرض کہ جس کے پاس جائے اور جس کی سنئے وہ ایک نہ ایک اپنا دکھڑا لے بیٹھے گا غور جو کیا جاتا ہے تو وہ ان کی شکایتیں بالکل صحیح نظر پڑتی ہیں یہ بات تو مسلم ہے کہ ہندوستان بالکل مفلس ہوگیا اور اس کی رجہہ یہ ہے کہ ہند کی تجارت بالکل بند ہے پہلے مرفہ حالی کی وجہ یہ تھی کہ ہند کا روپیہ ہند ہی میں صرف ہوتا تھا اب اس کی آمدنی انگلستان کو کھنچی جاتی ہے پھر مرفہ حالی ہو تو کہاں سے ہو اور رعایا کس طرح سے خوش ہو' ہر ایک نوع کی آسودگی زر پر منحصر ہے ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ انگلستان کی تجارت بند کی جائے اور ہند کی تجارت کو فروغ دیا جائے مگر یہ بھی تو نہیں کہ ہندوستان کو قلاش اور مفلس کر دیا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہر ایک موضع میں جیسے کہ اب مدرسہ مقرر ہیں حرفت و

صنعت کے مدرسہ قائم کئے جائیں اور اس مختصر تعلیم کے بعد جو ان کو صنعت و حرفت سیکھنے میں ضرور ہو ان کو صنعت کاری کی تعلیم دی جاے مثلاً گھڑیاں بنانا کلیں بنانا وغیرہ وغیرہ اشیا جو انگلستان میں طیار ہوتی ہیں اور جو ہندوستانیوں کے صرف میں آتی ہیں ان کو سکھلایا جائے کہ یہاں کے لوگ اپنی ضروریات کے پورا کرنے میں انگلستان کے محتاج نہ رہیں اور ہند کے خزانہ کو خالی ہونے سے بچائیں (مرۃالہند اپریل سنہ ۱۸۷۷ع صفحہ ۷) -

جب سے لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کرنے کی کوشش کی اس وقت سے مختلف صوبوں کی کتربیونت کا سلسلہ جاری ہے سرحد کا صوبہ پنجاب سے الگ سندھ کا صوبہ بمبئی سے علحدہ اور اب اڑیسہ بہار سے منتظر - مگر جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت حالت دوسری تھی چنانچہ سنہ ۷۶ میں اودھ کی چیف کمشنری توڑی گئی اور اودھ کا صوبہ ممالک مغربی و شمالی میں ملایا گیا اودھ والوں نے غل غپاڑا مچایا مگر بے سود - دیکھئے مرۃالہند اس مسئلہ پر کس مزہ کا مضمون لکھتا ہے -

"بعد جشن نوروزی اور دربار شاہنشاہی واقع یکم ماہ حال چوتھی تاریخ کو کل تعلقداران اودھ کو یہ حکم سنایا گیا ہے کہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر تعلقداران اودھ کے دوستدار اور محب صادق کا انتظام اب ترمیم ہوا اور صوبہ اودھ شامل ممالک مغربی و شمالی کے کر دیا گیا اگر لکھنؤ اور الہ آباد کے ملنے سے صرف اتنی غرض ہے کہ محکمہ چیف کمشنری تخفیف میں آئے اور الہ آباد یا لکھنؤ دونوں میں ایک مقام صدر قرار دی

جائے تو سردست یہ انتظام بھی نقصان سے خالی نہیں چونکہ
سرجارج کوپر صاحب بہادر کو لکھنؤ اور ارباب لکھنؤ سے ایک
دلی انس اور محبت ہے اس سبب سے ہم کو یہ اُمید قوی
ہے کہ حضور متحشم الیہ یقیناً لکھنؤ ہی کو صدر قرار دیں
اور الہ‌آباد اپنی اصلی حالت پر آجائے اگر ایسا انتظام ہو تو
چنداں مضائقہ نہیں خدانخواستہ اگر معاملہ برعکس ہوا تو
چوک کی سیر - حسین‌آباد کی روشنی - چھتر منزل کے جلسوں -
امام باڑوں کی تعذیہ‌داریوں - آٹھوں کے میلوں عیش باغ کے جمگھٹوں
کو ابھی سے سلام ہے - سچ ہے کہ بہ‌نسبت سابق کے لکھنؤ ایک
تو یوں ہی اُجڑا معلوم ہوتا ہے مگر بوجہ حب وطن از ملک
سلیماں خوشتر تاہم یہاں کے باشندوں کی نظر میں اس اُجڑے
حال پر بھی لکھنؤ کا ہر ایک کوچہ وبازار اب تک اور شہروں
کے مقابلہ میں گلذار دکھائی دیتا ہے اب بھی کپتان کے کلوے
کی برفی کے مقابل میں ہندوستان بھر میں بھی کہیں ایسی برفی
نصیب ہے پارچہ والی گلی کا دوسہرا تماکو کسی نے اور کہیں
پیا ہے اگر یورپ کے شہزادے ایک دفعہ بھی اس کو پی لیں
تو پھر ہواناسگار اور منلا چرٹ کا مزہ بالکل دل سے بھول جائے
ہم کو زیادہ تر خیال اس کا ہے کہ جب کہ چوک میں بجائے
سفید پوش وضعداروں کے دن کو تو اُن کی روحیں پھرا کریں گی
اور شب کو سریلے راگ اور گھنگروں کی جھنکار کی عوض میں سہاگ
اور کتے سر بھرتے ہونگے اس وقت یارلوگوں کا زندہ رہنا معلوم -
زندہ رہنا کیا ارے صاحب ہم لوگوں کی تو ایک عرصہ تک
روحیں بھی مرقد میں چونک چونک کر اٹھیں گی - افسوس کہ
پھر لکھنؤ اور ملیح‌آباد کا سفیدہ کس کے کھانے میں آئے گا اور

بہ فرض محال اگر کسی نے کھایا بھی تو کیا مثل ہمارے قدر کرے گا استغفراللہ - ہمارا سا منھ ہماری سی طبیعت ہمارا سا دل کہاں سے لائے گا - ہاں شاید عید بقرعید یا بڑے دن کو دو چار یا دس بیس آم ڈالیوں میں لگ جائیں آگے خیرصلاح - اللہ بس باقی ہوس - ہائے لکھنؤ ہائے لکھنؤ - ہائے لکھنؤ " (مرۃالہند جنوری سنہ ۷۷ صفحہ ۸) -

لارڈ لٹن کے حکومت کے زمانہ میں ہندوستانی اخباروں کی روک تھام کے لیے نیا قانون نافذ کیا گیا - ہندوستانی اخباروں نے اس قانون کی مخالفت کی بہت کچھہ شور و شر مچایا چنانچہ مرآۃالہند نے بھی آزادی کے ساتھہ اپنی رائے کا اظہار کیا -

" انگلستان کے لڑکے کوے کو لوہے کے پنجرے میں نچاتے ہیں پنجرے کے پیندے کو آگ سے خوب گرم کرتے ہیں کوے کے پانوں جب جلنے لگتے ہیں تو وہ اچکتا ہے اور سب طرف بند ہونے کی وجہہ ہے پھر پنجرے میں پنجوں کے بل گر پڑتا ہے نہ پھر ٹوک سکتا ہے اور نہ اٹھہ سکتا ہے اس متواتر حرکت مجبوری کو لڑکے کوے کا ناچ کہتے ہیں آج کل ہمارے دیسی اخبارات کے اڈیٹروں کی کیفیت بعینہ یہی ہورہی ہے عجب مخمصہ میں جان ہے - ناظرین اخبار کو بجز پولیٹکل اخبارات کے کوئی اور خبر بھاتی نہیں اور سرکار عالی وقار کو ہم لوگوں کی یہ حرکت بھی خوش آتی نہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے نازک پولیٹکل معاملات کو اپنے ہندوستانی ڈھنگ پر اس طرح بیان کریں کہ رعایا کے دل میں سرکار کے طرف سے کسی قسم کی بدگمانی پیدا ہو پس اگر گویم بشکل وگر نہ گویم مشکل

لگهه نیک نیتي سے لکھئے لکھتے لکھتے قلم رک جاتا ہے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ خدا معلوم همارے الفاظ کے معنی حکام وقت کیا سمجھینگے مگر کیا کریں خاموش بھی نہیں رها جاتا جب ایک مشکل کام اپنے ذمہ لیا اس کی دقتوں اور مشکلوں سے کہاں تک کنارہ کشی کریں اور جو نقص کسی امر میں صریح معلوم هوتا ہے اس سے کہاں تک چشم پوشي کریں باوجود اس قیل و قال اور تس[1] پیچم تس پہنچا کے (یعنی مراسلات نواب گورنر جنرل بہادر بنام نواب سکرٹری هند اور مراسلات نواب سکریٹری بہادر بنام نواب گورنر جنرل هند بہادر) بخدا آج تک یہ عقدہ نہ حل هوا کہ بخلاف معمولی کارروائي اور ضابطۂ قدیم کے دیسی اخبارات کے قانون جاری کرنے میں اس قدر عجلت اور اضطراب کیوں ظاهر کیا گیا کہ چٹ تهري منگنی اور پٹ تهرا بیاہ ایک هی اجلاس میں سب مدارج اور مراحل طے کرکے بذریعہ تار برقي منظوری نواب سکریٹري هند بھی منگوالی......" (مراۃالہند اگست سنہ ۱۸۷۸ع صفحہ ۱) -

اُس زمانہ کے معیار کے مطابق مراۃالہند کا لہجہ آزادانہ اور متین تھا مگر اس کے مضامین پڑھ کر یہ خیال بار بار آتا ہے کہ اس کے لکھنے والوں کو شاهي زمانہ کي بے ضابطگیاں اور غدر کي شورش بھولی نہ تھی اُن کے پولیٹکل معیار سے ملک کو سب سے زیادہ ضرورت امن کی تھي اور اس کی وہ بڑی قدر کرتے تھے - مراۃالہند کے پہلے نمبر میں ایک مضمون اودھ کے

---

(۱) یعنی مراسلہ Despatch

مشہور تعلقدار راجہ مان سنگھ کے بارے میں ہے اس میں زمانۂ شاہی کے نظام سلطنت کا بیان ان الفاظ میں کیا گیا ہے -

" یہ راجگان اودھ اپنی اپنی ریاستوں میں مثل چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کے رہا کرتے تھے - ہر راجہ دس پندرہ ہزار آدمی و گولی باروت سے طیار اپنے مکان کو جنگلوں سے محصور کرکے ایک قلعہ قدرتی سمجھتا تھا علاقہ اس کا واسطے رسد رسانی اپنی فوج کے کافی اس کے قرب و جوار کے راجہ واسطے اس کی امانت کے ہر وقت طیار امیٹھی - کھجور گاوں - کالا کانکر - تلسی پور - بلرام پور - گونڈہ - محمودآباد - سندیلہ - ڈونڈیا کھیرا یہ سب رئیس اپنے اپنے قلعوں میں مثل بادشاہوں کے بسر کرتے تھے بات بات میں لڑ پڑتے تھے اگر عامل وقت کو ضعیف پایا تو ان کی بن آئی جو کچھ روپیہ علاقہ سے تحصیل ہوا اس کو تصرف کیا " -

سوشل اصلاح کے مسائل پر بھی مراۃالہند میں مضامین نظر آتے ہیں - شادی - صغرسنی - تعلیم نسواں - تخفیف مصارف شادی ان مسئلوں پر اکثر بحث کی گئی ہے اور ہر جگہہ نئے خیالات اور نئی روشنی کی حمایت ہے مگر متانت اور سنجیدگی کے ساتھ - جس زمانہ میں بنارس کا ہندو کالج اور اس کا اسکول مسز بسنت کے زیر انتظام تھے تو انہوں نے طلبا کی شادی صغر سنی کے روک توک کے لیے کچھ انتظام کیا تھا اور صوبجات متعددہ میں سر رشتہ تعلیم کے طرف سے بھی اس طرح کا انتظام کیا گیا ہے جون سنہ ۱۸۷۸ع کے مراۃالہند سے معلوم ہوتا ہے کہ " ایک نئی تدبیر جو اس رسم کے دفع کرنے کے بارہ میں بنگال

میں جاری ہونے والی ہے وہ یہ ہے کہ جناب گیرٹ Garrett صاحب بہادر انسپکٹر مدارس نے محکمہ ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم احاطہ بنگال کو ایک چٹھی سرکاری طور پر اس مضمون کی بھیجی ہے کہ شادی صغر سنی کو روکنے کے واسطے ایک سرکلر اس قسم کا جاری کیا جائے کہ جو اهل بنگال یا بہار اپنے لڑکے کی شادی صغر سنی میں کرے گا اس کا لڑکا انٹرنس (Entrance) کا امتحان نہیں دینے پائے گا چنانچہ ڈائرکٹر صاحب ممدوح نے ایک سرکلر اس بارہ میں نائب مہر مجلسان کمیٹی ہاے سرشتہ تعلیم بنگال اور بہار کی خدمات میں ارسال فرمایا ہے کہ صاحبان والا شان تجویز گیرٹ صاحب بہادر پر غور فرما کر اپنی اپنی راے بہ اتفاق ممبران کمیٹی اس بارہ میں ظاہر کریں کہ آیا یہ تجویز صاحب موصوف کی فائدہ بخش ہوگی یا نہیں '' اس خبر کو چھاپنے کے بعد مراۃالہند لکھتا ہے کہ '' یہ تجویز گیرٹ صاحب کی قابل تحسین و آفرین ہے گو بالفعل بتمامہ فائدہ بخش نہوگی الا رفتہ رفتہ اس کا اثر قلوب اهل بنگال اور بہار پر ہو جائے گا......غرضکہ جس طرح یہ قاعدہ بنگال اور بہار میں جاری ہونے والا ہے اسی طرح اگر حکام اضلاع مغربی و شمالی اور صوبہ اودہ بھی اپنے اپنے ضلعوں میں اس تجویز کی بنا ڈالیں اور اس کے بارہ میں جلسہ منعقد کریں ہر آئینہ خالی از منفعت نہ ہوگا '' اسی طرح تخفیف مصارف شادی کے بارہ میں مراۃالہند ستمبر سنہ ۱۸۷۷ع کے نمبر میں لکھتا ہے کہ '' جملہ ترقی خواہان ملک ہند و اراکین انجمن انسداد قبائح و بد مصرفی شادی کو مژدہ ہو کہ حسب‌الطلب صاحب چیف کمشنر بہادر ملک اودہ بتاریخ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۷۷ع

منشي پيارے لال صاحب صدر انجمن هند شهر لکھنؤ میں تشریف لائے اور بعد جلسہ هائے کایستھ صاحبوں کے بغرض انتظام هر فرقہ کے استدعا مدد کي لوکل گورنمنٹ سے کی چنانچہ بنظر بهتری رعایا و روسا کے گورنمنٹ نے بعد ملاحظہ کارروائي هائے دیگر صوبہ جات هند کے مدد دینا قبول فرمایا بہ استماع اس خبر فرحت اثر کے آنریبل سر مہاراجہ دگبجے سنگھ صاحب بہادر - کے سي - ایس آئی پریسیڈنٹ انجمن هند والی بلرام پور نے بہ تاریخ ۱۶ ماہ اپریل سنہ ۱۸۷۷ع اپني کوٹھی میں ایک جلسہ خاص اهل برادری چھتري صاحبوں کا بہ شرکت راجہ لال مادھو سنگھ صاحب راجہ گڈھ امیٹھي و راجہ اجیت سنگھ راجہ پرتاب گڈھ و رانا شنکر بخش سنگھ صاحب رئیس اعظم کھجور گانوں و دیگر راجگان و روسا و تعلقداران منعقد فرما کر مطابق کارروائي جناب مہاراجہ صاحب کاشي نریس و جناب مہاراجہ صاحب بہادر والي وریانگرام و جناب مہاراجہ صاحبان ریاست هائے ڈمراوں و هتوا و ٹکاری وغیرہ بہ موقوفی قرار داد و دیگر قبائح شادي کے دستورالعمل تخفیف مصارف شادي مرتب فرمایا اور بہ تاریخ ۲۰ ماہ اپریل سنہ ۱۸۷۷ع ایک عظیم‌الشان جلسہ بہ مقام بارہ دري قیصر باغ جناب کرنل ریڈ صاحب بہادر کمشنر قسمت لکھنؤ نے بایمائے جناب لفٹننٹ گورنر بہادر منعقد فرمایا - اس جلسہ میں جملہ شاهزادگان و رئیسان لکھنؤ و راجگان و مہارجگان تعلقداران اودھ تشریف فرما تھے سب صاحبوں نے بعد سماعت نقصانات بیجا مصارف شادی کے اغراض کمیٹی کو بکمال خوشي منظور فرمایا اور دستورالعمل مرتبہ چھتري صاحبان منظور هوکر نفاذ پایا - اسی طور پر چند مجالس خاص و عام هو کر بہ منظوری لوکل گورنمنٹ ملک اودھ کے لئے ایک صدر انجمن

قائم ہوکر خاص شہر لکھنؤ کا انتظام تخفیف خرچ شادی ذمہ جلسہ تہذیب شہر لکھنؤ کے ہوا اور پریسیڈنٹ جلسہ تہذیب شہر لکھنؤ کے جناب صاحب سٹی مجسٹریٹ بہادر لکھنؤ بہ ایمائے لفٹننٹ گورنر بہادر صاحب کمشنر بہادر ہوئے "۔

پولیٹکل اور سوشل مضامین کے علاوہ زراعت کے مختلف شعبوں پر اور سائنس کے مختلف مسائل پر مرآةالہند میں تحریریں درج ہوا کرتی تھیں مثلاً مادہ کیا چیز ہے۔ باراں رحمت الہی۔ آفتاب اور روشنی کا بیان وغیرہ نیوٹن نے سیب کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھ کر کشش ثقل (Gravitation) کا مسئلہ حل کیا تھا ہندوستان کا میوہ آم ہے غالباً اسی رعایت سے مئی سنہ ۱۸۷۸ع کے مرةالہند میں جو مضمون اس موضوع پر شایع ہوا ہے اس کی سرخی ہے ٹپکا زمین پر کیوں ٹپکا سورج یا چاند کی طرف کیوں نہ لپکا۔ سائنس کے بعض مضامین پنڈت رتن ناتھ درسرشار مصنف فسانہ آزاد کے لکھے ہوئے ہیں شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت سرشار اس زمانہ میں لکھیم پور کے ایک اسکول میں ماسٹر تھے اور انہوں نے ایک جغرافیہ کی کتاب شمس الضحی نامی تصنیف کی تھی جس کا اسلوب بیان نہایت سلیس اور دلکش ہے جب منشی نولکشور کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور انہوں نے اودھ اخبار کی اڈیٹری کا قلمدان پنڈت رتن ناتھ کے سپرد کیا تو وہ ملازمت سرکاری سے مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے آئے۔ علاوہ ان سائنٹفک مضامین کے پنڈت رتن ناتھ در نے مرآةالہند میں اور مضامین بھی لکھے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر نوع کے مضمون میں اپنا رنگ قایم رکھا ہے۔ پہلے نمبر میں ایک مضمون

ہندوستان کی نااتفاقی پر لکھتے ھیں دیکھئے، تمہید کیسی پر لطف ھے -

" جوانے پاک بازو پاک رو بود
که با پاکیزه روے در گرو بود
چنیں خواندم که در دریاے اعظم
بہ گردابے در افتادند با ھم
چو ملاح آمدش تا دست گیرد
مبادا کاندراں حالت بمیرد
ھمیں گفت از میان موج تشویر
مرا بگذار و دست یار من گیر

ایک دن ٹھیک دوپہر کو جس وقت چیل انڈا چھوڑتی تھی میں ترائی کے ایک لق و دق جنگل میں جا رھا تھا سنسان بیابان ھو کا عالم دفعتاً کان میں بھنک پڑی که کوئی آدمی اپنی سریلی اور رسیلی آواز سے اشعار مندرجه بالا الاپ رھا ھے اس وقت دھوپ اس شدت کی پڑتی تھی که کھوپڑی چٹخی جاتی تھی دس پانچ قدم آگے بڑھ کے کیا دیکھتا ھوں که ایک چشمه سار کے قریب ایک سایه دار پیپل کے پیڑ کے نیچے جس کے پتوں کی دھانی دھانی رنگت سبزان ھند کی یاد دلاتی تھی اور جس کی عظمت و رفعت ذھن رسا کا حوصله پست کرتی تھی ایک جوان رعنا شمائل زیبا طلعت - برس پچیس اک کا سن - صندلی تہبند باندھے - سبزۂ بیگانه کو اپنا مسکن بنائے دوزانو بیٹھا لہرا لہرا کر گا رھا ھے - ارد گرد میلا سا لگا ھے - ٹھٹھ کے ٹھٹھ - یه دیکھ کر بھیڑ کو کاٹ کر میں دوڑانا ھوا اس جوان

پاکیزہ جمال و خوش گلو کے قریب فرش زمردین پر جا بیٹھا حیرت تھی کہ جنگل میں منگل یہ مثل آج صادق آئی جس وقت یہ مصرع جگر خراش -

مرا بگذار و دست یار من گیر

اُس کے منھ سے نکلتا تھا اس وقت دل کا عجب حال ہوتا تھا آنکھوں سے اشک جاری اور ایک غشی سی طاری - وہ مرد باخدا تو وہاں سے واللہ اعلم کس طرف روانہ ہوا مگر یہ مصرع مجھے اب تک ورد زباں ہے یہی سوچتا ہوں کہ یا بار خدا یا اگر ہندوستانیوں میں باہم ایسا اتفاق ہو سبحان اللہ "

ایک مضمون میں روسا لکھنؤ کے اشغال روزمرہ کی کہانی درج ہے ملاحظہ ہو -

" حال یہ ہے کہ نو بجے تو خواب سے جاگے اور بمجرد آنکھ کھلنے کے ارشاد ہوا کہ حقہ لاؤ خدمت‌گار جھٹ پٹ حقہ طیار کرکے لایا اوسے لیتے لیتے پیا کئے جب وہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا تو جمائیاں لیتے ہوئے اُٹھے اور فرمایا میاں الہی بخش افیوں جلد طیار کرو میں اس وقت بہت بے چین ہوں کل رات کو تو افیوں نے ایسا کم نشہ کیا کہ رات بھر نیند نہیں آئی اور ہاتھ پیر ٹوٹا کئے ہر وقت یہی جی میں آتا تھا کہ تمہیں جگواؤں اور تھوڑی افیوں پھر بلوا کر پیوں چونکہ رات زیادہ بڑھ گئی تھی لاچار اسی بے چینی کے عالم میں پڑا رہا اُنھوں نے جواب دیا حضور بصحت‌الخلا تشریف لے جائیں افیوں طیار ہے - اچھا لوٹا رکھواؤ ہم بھی اُٹھتے ہیں حقہ بھی بھر کر رکھوا دینا دس بجے چوکی پر سے حقہ اور لوٹا ہاتھ میں لیے ہوئے برآمد

ہوئے اور انہوں نوش کی حکم ہوا کہ ہمارے بٹیروں کی کابک
لاؤ اور شیر علی بٹیر باز کو بلاتے لانا دیکھوں تو کہ اُنہوں نے
رات کو بھوک بھی دی یا نہیں - ایسا نہ ہو کہ بھول گئے
ہوں تو پھر پرسوں پالی میں ساری شیخی کر کری ہو - یہ کہہ
کر بیٹھ گئے اور منہہ دھونے کو پانی طلب کیا پھر فراغ پان
نوش کیا - خدمت گار نے حقہ بھر کر رکھ دیا اب بٹیروں کے
طرف متوجہ ہوئے - دوست احباب جمع ہوئے چوسر یا گنجیفہ ہونے
لگا اتنے میں بارہ بجے آدمی نے دست بستہ ہو کر عرض کیا
کہ حضور خاصہ طیار ہے فرمایا بازی تمام ہو لے تو چلتے ہیں
ایک بجے کے قریب اندر گئے اور کھانا نوش کیا تو اب گویا
چوہے نے پارہ پیا - اب کب بیٹھا جاتا ہے پان کھاتے ہوئے خسخانہ
پہونچے پلکھا کھچنے لگا پھر آرام کیا چار بجے اگر آنکھ کھل
گئی اور کسی نے پوچھا کہ دن کتنا ہوگا ذرا تٹی تو ہٹاؤ
تٹی ہٹانے کے ساتھ ہی دن تو دیکھنا بھول گئے بند کرو صاحب
بند کرو اف اوہ کس قدر دھوپ ہے کہ منہہ پھنکا جاتا ہے
چلانے لگے - اگر کسی نے کہا کہ اے حضور چار بج گئے اُٹھئے
تو فرماتے ہیں کہ چاہے چار بجیں یا پانچ بجیں ہم تو جب
تک یہ دھوپ کی گرمی ہے نہ اُٹھیں گے - خلاصہ یہ کہ دو گھڑی
دیر رہے جمائیاں لیتے ہوئے اُٹھے اور منہہ دھو کر حقہ کی طرف
متوجہ ہوئے کہ مرغباز مرغ لیکر آیا اور اس نے بیان کرنا شروع
کیا کہ حضور کے نمک کی قسم دن‌سور ایسا لڑا کہ طرف‌ثانی
کے مرغ کا بالکل خون خرابا ہو گیا اور تمام پالی بھر میں
حضور کی دھوم ہو گئی - اور دو دو پانی ان پٹھوں کے بھی ہو
گئے - شام تک اس مشغلہ میں مصروف رہے آٹھ بجے اور چاندنو

کي کشتي سامنے لاکر رکھی گئی اور سب احباب جمع ہوئے اور شغل شروع ہوا معاً شروع ہونے کے داستان گو نے بیچارے امیر حمزہ صاحبقران پر جھوٹ کے پل باندھنے شروع کئے اور عمرو عیار کي جھوٹی عیاریاں اور دروغ بے فروغ بیان کرنا شروع کیا اور وہ جھوٹ کہ جس کا زمین اور آسمان پر کہیں ٹھکانا نہیں ۔ اگر کسي صاحب نے بعد کچھ دیر کے اُٹھنے کا قصد کیا تو صاحب خانہ نے اسي وقت ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا میاں ابھي دس بھی نہیں بجے اور تم نے چلتا دھلدا کیا میرے سر کي قسم دو چار چھلنے تو اور پیو دیکھو تو آج مرزا نے کیا عمدہ قوام بنایا ہے جب بارہ بجے تو خدمت گار نے آکر کہا کہ رات دوپہر سے زیادہ آئی محل میں تشریف لے چلئے خاصہ ٹھنڈا ہوتا ہے ھنسکر کہنے لگے کہ آج تو کیا جلد بارہ بج گئے ہمیں تو ابھی نشہ بھی نہیں ہوا خدا خدا کر کے کشتی سامنے سے اُٹھي اور لڑکھڑاتے ہوئے محل میں داخل ہوئے دسترخوان بچھا خاصہ نوش کیا بعد فراغ ہاتھ منھ دھوکر پان کھاتے ہوئے پلنگ پر گئے" (مراۃالھند اگست سنہ ۱۸۷۱ع صفحہ ۴) ۔

ایک واقعہ مہاراجہ صاحب بنارس کي تشریف‌آوری کا سنئے اور اس سے ایشیا کي تہذیب اور اس زمانہ کے اخلاق کا اندازہ کیجئے ۔

" زہے حسن لیاقت و تہذیب ریاست کہ جناب مہاراجہ صاحب بہادر بنارس جس وقت کہ رونق افزائے شہر لکھنو ہوئے بہ حفظ مراتب قدیمانہ و حسن انقیاد معتقدانہ خدمت عالي درجہ حضور فیض گنجور گردوں پناہ فلک بارگاہ صاحب عالم

و عالمیان مرزا سلیمان قدر بهادر میں بتوسط چوبدار عرض کیا کہ معتقد قدیم تمناء قدمبوسی رکھتا ہے اگر بہ تعین اوقات فرصت اجازت ہو تو حاضر در دولت ہوکر بہرہ اندوز ملازمت ہوں حضور ممدوح نے بعد عطیۂ خلعت چوبدار مذکور کو حکم ہوا کہ خانۂماخانۂ شماست جس وقت مزاج میں آوے وارد کلبۂ احزاں ہوکر اپنے وصل فرحت اشتمال سے شاد کام کرو - چنانچہ معدن اوصاف احسن خرد مصاحب داروغہ اچھے صاحب کو کہ بہ محامد نامحدود آراستہ اور پیراستہ میں بھیج کر کلمات تفقد آمیز حسب شان مہاراجہ صاحب موصوف فرما بھیجے اور مہاراجہ صاحب بہادر بھی مواقق مکنون اپنے دولت سرائے شاہزادہ عالی تبار پر تشریف لے گئے اور بکمال ارادت و تحفظ مراسم انتہاد قدیمانہ شرائط ملازمت کو ادا کیا اور شاہزادہ جمشید کلاہ فریدون بارگاہ نے باوجود نامساعدت روزگار کہ فلک کجرفتار لیل و نہار درپے آزار سلاطین عالی وقار ہے حسن اخلاق و حفظ عظمت خاندانی اس زمانہ قلیل میں ادا فرمایا اور ورائے مدارائی ہارویان پانچ ہزار روپیہ نقد واسطے ملازمین کے عطا فرمائے اور مہاراجہ صاحب بہادر نے کہ بہ فضل ایزدی از روئے حشمت و جاہ ہر طرح کی لیاقت رکھتے ہیں از روے انتہاد و بہ مقتضاے الامرفوق الادب قبول فرمایا ....ناظرین باتمکین شاید اس مضمون کے پڑھنے سے متحیر ہونگے کہ مہاراجہ صاحب بہادر بنارس اور جناب صاحب عالم مرزا سلیمان قدر میں وہ کون سی نسبت تھی کہ جس نے مہاراجہ صاحب کو انتہاد دلی سے جناب ممدوح الصدر کی ملازمت کا مشتاق کیا اور کون سی وہ بات تھی کہ جس کے ادا کرنے میں جناب شاہزادہ صاحب نے مصارف کثیر کو اپنے اوپر قبول

کیا لیکن کتب تاریخ کے پڑھنے سے کیفیت اصلی ان دونو امور کی ظاہر ہو سکتی ہے یعنی جناب شاہزادہ صاحب بہادر فرزند ارجمند شاہ جمجاہ امجد علی شاہ بادشاہ سابق اودھ کے ہیں اور مہاراجہ صاحب کے بزرگان سلف کسی زمانہ میں اسی بادشاہت سے تعلق رکھتے تھے......'' -

میں نے جب اس دفتر پارینہ کی ورق گردانی کی تھی تو مجھ کو اس میں نصف صدی پہلے کے خیالات اور تہذیب کا مرقع نظر آیا تھا اسی لیے میں نے یہ چند اقتباس ناظرین ہندوستانی کی تفنن طبع کے لیے پیش کرنے کی جرأت کی کیا عجب ہے کہ ان کی نگاہ میں یہ پارہاے پریشان ، دلکش اور پند آموز ثابت ہوے ہوں -

چھایا ناٹک

(از جگیشور ناتھہ ورما بیتاب بریلوی)

" ناٹک " کا جو مفہوم آج هندی اور اردو میں ہے اُس کے لحاظ سے یہ لفظ هندی زبان کا ہے - هم جسے " ناٹک " کہتے هیں سنسکرت میں اُسے " درشي کاوي " (दृश्य-काव्य) یا " روپک " کہتے هیں - اصل کے لحاظ سے " ناٹک " سنسکرت دھاتُ (یعني مادے نت) سے نکلا ہے ' جس کے معني ناچنے کے هیں - دنیا کي مختلف اقوام کے ناٹکوں کي قدیم تاریخ سے معلوم هوتا ہے کہ ناٹک کي ابتدا رقص یا ناچ هی سے هوئي ہے - سنگیت یا موسیقي کا نمبر دوسرا ہے - مارے خوشی کے ناچ اُٹھنا ایک ضرب‌المثل ہے - اس سے ظاهر ہے کہ اظہار مسرت کا قدما کے نزدیک ناچ هي بہترین ذریعہ تھا - اسي باعث هوتے هوتے یہ ایک عام کہاوت هوگئی - علاوہ اس کے پراني کُتب کا ضخیم ذخیرہ اس امر کا شاهد ہے کہ خاص خاص تقریبوں اور موقعوں پر رقص و سرود کی محفلیں گرم هونا معمولي بات تھی - چنانچہ پاروتی کے سامنے نت راج شیوکا اور برج کی گوپیوں کے ساتھہ کرشن کا ناچنا زباں زد خلائق ہے - کہتے هیں کہ حضرت داؤد بھی ایک بار مسیح کے روبرو ناچے تھے - اس قسم کے ناچوں کا تذکرہ چین و جاپان وغیرہ ممالک کے ادب قدیم میں بھي مذکور ہے -

ایک اور بات ہے اور وہ یہ کہ ہندی ناچ گانے کا فن اس درجہ مکمل ہے کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم اُس کا مقابلہ مشکل ہی سے کر سکتی ہے - ہندو "نرتی کلا" (नृत्यकला) یا ناچنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی اور آنکھوں کے اشارے، ہاتھ پانوں کی حرکات اور مخصوص ادا و انداز سے کسی جذبے کی ہو بہو تصویر کھینچ دینے میں اُنہیں ایک مدت سے ید طولیٰ حاصل ہے - نقالی روز ازل ہی سے انسان کے خمیر میں پڑی ہے - بچہ زمانۂ طفولیت ہی سے اپنے بڑوں کی نقل و حرکت دیکھ کر اُن کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتا ہے - شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ اُس کی بے زبانی اور اظہار خیال کا فطری جذبہ اُسے ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہو - بہر حال یہ حقیقت ہے کہ زبان و الفاظ کے علاوہ عرض مدعا کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں -

بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ابتدائے عالم کی اولین ساعتوں میں جب انسان کسی زبان کے استعمال سے بہرہ اندوز نہوا تھا اُس وقت بھی اُسے اپنے دماغی اور قلبی محسوسات و واردات کے اظہار کی قدرت حاصل تھی - اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنا مطلب دوسروں پر واضح کر دیتا تھا - چنانچہ خدا کی گونگی مخلوق اِس خصوصیت کی حامل ہے اِس میں شک نہیں کہ ایک لب بستہ پیغام موثر سے موثر انداز تکلم سے زیادہ پر تاثیر ہوتا ہے - زبان کے استعمال سے دل کی بات میں کچھ نہ کچھ تصنع آ ہی جاتا ہے مثلاً ایک شخص نہایت پر درد اور منتخب الفاظ میں اپنی داستان غم لوگوں کو سنانا چاہتا ہے، مگر اِس خوف سے کہ شاید یہ بناوٹ ہو اُس کی تقریر

کی لوٹ ہی جواب جواب دئے جاتي ھے - لیکن ایک مصیبت زدہ
آدمی کی پر نم آنکھوں وہ کام کر جاتی ھیں کہ کوئي کتنا ھي
شقی القلب کیوں نہ ہو اُس کي چپ کی داد دئے بغیر نہیں
رہ سکتا - فطري حرکات و سکنات میں نہ معلوم وہ کون سي
غیر معمولي قدرت مستور ھے جو ھماری زبانوں کے الفاظ کے بڑے
سے بڑے ذخیرے کو بھی میسر نہیں -

فلسفے کے ناقابل تردید دلائل سے ثابت ھے کہ حظ روح یا
حقیقي مسرت کا حصول ھي ھمارا مقصود حیات ھے اور اُسي سے
انساني زندگي کی تکمیل ہوتي ھے چنانچہ انسان پیدائش ھی
کي گھڑي سے بقدر ذوق تلاش راحت میں مصروف ہو جاتا ھے -
اِس تگ و دو میں ایسے لمحے بھی آتے ھیں جب اُس کي
نارسائی ، ایک لغزش مستانہ بنکر ، عارضی خوشي کي بے پایاں
لُکھیوں میں اُلجھ کر رہ جاتی ھے - خوشی کے اظہار کے اِسي
مقدس جذبے کے زیر اثر " نرتی کلا " کا آغاز ہوا جس نے بہ‌تدریج
ناٹک کي صورت اختیار کرلي -

کسی زبان کی نشر و اشاعت سے پہلے ناٹک کي جو
کیفیت ہوگی وہ محتاج بیان نہیں لوگ انواع و اقسام کے
ناچوں سے اپنے دل کا جوش نکالتے تھے - اور اکثر و بیشتر
بعض متعینہ حرکات و سکنات سے بھي کام لیا کرتے تھے
اس قسم کے مظاھرے گونگا سوانگ (pantomime) کہے جا سکتے
ھیں - جب تحریر و تقریر کا غوغا ہوا تو باقاعدہ سوانگ اور
ناٹکوں کي شروعات ہو گئي - اور بولتی ہوئی پتلیاں بھي معرض
وجود میں آنے لگیں -

جب گونگے سوانگ رفتہ رفتہ عام ہوگئے تو یہ کششیں پھیکی
اور خشک ہوتی گئیں حتیٰ کہ عوام کے لیے ان میں کوئی دلکشی
اور دلچسپی کا سامان باقی نہ رہا - چنانچہ عقل دلھلڈرس نے
اس فقدان کا احساس کر کے پرانے طریقۂ کار میں ایک جدت پیدا
کی - وہ یہ کہ ناٹک دکھانے کا مقصد پورا کرنے کے لیے کٹھ پتلیاں
گڑھ لیں جو سنسکرت زبان میں پتر یکا ' پتلھکا اور پتلي وغیرہ
کے نام سے موسوم ہیں - بعض پتلیاں لکڑي کی ہوتي تھیں اور
کچھ کپڑے ' اون ' سیپ' سینگ اور ہاتھي دانت سے بنائی جاتی تھیں
پتلیوں کے رواج کي قدامت اس مشہور کہاوت سے ظاہر ہوتی ہے
کہ پاربتي نے ایک پتلی بنائي تھي جو انھیں اس قدر عزیز
تھی کہ اُنھوں نے اُسے شیوجي کي نظر سے پوشیدہ رکھنے کے لیے
ملے (मलय) پربت، پر لیجا کر رکھا تھا - اور روز اُس کا سنگار کرنے
وہاں جایا کرتي تھیں - ایک دن شیوجي نے اُنھیں جاتے دیکھ
لیا - اور خود بھي خاموشی سے اُن کے ساتھ ہو لیے - پاربتي کي
پتلي دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور اُنھوں نے اُس میں
جان ڈالدي -

مہابھارت میں بھي اکثر ان پتلیوں کا ذکر آیا ہے - جب
ارجن کوروں سے لڑنے جا رہا تھا تو اُترا نے اُس سے کچھ پتلیاں لانے
کی فرمایش کی تھي - کتھا سرت ساگر (कथासरित्सागर) میں لکھا ہے
کہ اُسر مے (असुरमय) کی لڑکي سوم پربھا نے اپنے باپ کي بنائی
ہوئي بہت سي پتلیاں رانی کلنگ سینا کی نذر کی تھیں -
اُن میں سے ایک پتلی تو ایسي عجیب ساخت کي تھی کہ
کھونٹی دباتے ہي ہوا میں رقص کرنے لگتي تھی اور کچھ دور

پر رکھی ہوئی چھوٹی موٹی چیزیں بھی اُٹھا لاتی تھی - کوئی کوئی پتلی پانی بھرتی تھی اور کوئی ناچنے گانے کے علاوہ بات چیت بھی کرتی تھی - کتھا سرت ساگر کے مصنف نے گناڈھیہ (गुणाढ्य) کی مشہور تصنیف برھت کتھا (बृहत्कथा) کا تتبع کیا ہے جو قدیم زمانے میں پشاچی (पैशाची) زبان میں لکھی گئی تھی -

کتھا کوش (कथा - कोष) میں لکھا ہے کہ راجہ سندر نے اپنے لڑکے امرچندر کے شادی کے موقع پر کٹھ پتلیوں کا ناچ کرایا تھا - دسویں صدی عیسوی کی معروف تصنیف بال رامائن ناٹک مصنفہ راج شیکھر کے پانچویں باب میں مرقوم ہے کہ اُسر مے (असुरमय) کے وشارد (विशारद) نامی شاگرد نے دو پتلیاں بنائی تھیں جس میں سے ایک سیتا دوسری سندوریکا (सिंदूरिका) کی ہمشکل تھی - یہ دونوں سنسکرت اور پراکرت زبانوں میں بخوبی بات چیت کرتی تھیں - ان کی صورت اتنی موھنی اور گفتگو ایسی پیاری تھی کہ خود راون جیسا پنڈت بھی اصل و نقل کا امتیاز کرنے میں چکرا گیا تھا -

غالباً یہ کہنا بے سود ہوگا کہ پتلی کا ناچ چھایا ناٹک یا خاموش فلموں کا دوسرا رخ ہے - فی الحقیقت چھایا ناٹک کی یہیں سے ابتدا ہوتی ہے - ان ناچوں اور ناٹک میں بھی کچھ بہت دور کا واسطہ نہیں ہے - اس کا ثبوت اس ایک بات سے بھی ملتا ہے کہ چین میں آج کل ناٹک شروع ہونے سے پیشتر پتلیوں کا ناچ دکھایا جاتا ہے - ونیز یہ کہ موجودہ سنیما مغرب کے پرانے اسٹیج کی بدلی ہوئی صورت ہے -

آگے چل کر پتلیوں کے تماشوں میں ایک اہم تبدیلی ہوئی اور چھایا ناٹک اپنی اصلی صورت میں رونما ہوتے گئے - عہد حال کے سنیما اور چھایا ناٹکوں میں بہت کچھ مشابہت ہے - اس مقصد کے لیے چمڑے کی پتلیاں بنائی جاتی تھیں اور ایک قسم کی تیز روشنی کے سامنے کچھ اس طور سے اُن کی نقل و حرکت جاری رکھی جاتی تھی کہ اُن کا سایہ سامنے لگے ہوئے پردے پر پڑتا تھا اس طرح تماشائیوں کو متحرک تصاویر نظر آتی تھیں یہ پتلیاں بہت چھوٹی ہوتی تھیں لیکن اُن کا عکس اتنا بڑا ہوتا تھا کہ متحرک کردار قامت میں قد آدم مجسمے معلوم ہوتے تھے - اس سے پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے میں بھی ہندوستان کے لوگ مناظر و مرایا کے اصول سے بخوبی واقف تھے -

چھایا ناٹک عام ناٹکوں سے بہت مختلف ہوتے تھے - اور اُن کا پلاٹ بالعموم مہا بھارت اور رامائن سے ماخوذ ہوتا تھا - قدیم چھایا ناٹکوں میں سے دوتانگد (दूतांगद) مصنفۂ سوبھٹ (सुभट) مہاویر چرتر مصنفۂ بھوبھوتی ' بال رامائن مصنفۂ راج شیکھر اور پرسّن راگھو (प्रसन्नराघव) مصنفۂ جے دیو ' یہہ چار؛ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ہند کے جنوبی اقطاع میں چھایا ناٹک سولھویں اور سترھویں صدی تک مروج تھے[۱] اہل جاوا بھی اس میں ہندیوں کی تقلید کرتے رہے ہیں - ڈاکٹر پشل کی رائے ہے کہ وسط یورپ میں پتلیوں کے ناچ کی ابتدا انھیں چھایا ناٹکوں کو دیکھکر ہوئی تھی - اطالوی زبان

---

۱ - ٹرکی میں ابھی تک چھایا ناٹک کا رواج ہے (ادارہ) -

میں ''پھوپا'' یا ''پھوپڑ'' وغیرہ الفاظ مستعمل ھیں جو ''پتلی'' کے مرادف ھیں -

چھایا ناٹک کی قدامت

ظاھر ھے کہ ناٹکوں کے آغاز سے بہت پہلے پتلیوں کا ظہور ھوچکا تھا - اِس لئے یہ ضروری ھے کہ ناٹک سے قبل چھایا ناٹک وجود میں آئے ھوں - اور اگر ان سے پہلے نہیں تو کم از کم ان کے پہلو بہ پہلو بولنے والی پتلیوں کی ایجاد ھوئی ھوگی -؛ ھر چند کہ چھایا ناٹکوں کے آغاز کا زمانہ معین کرنا محال ھے لیکن اگر ڈرامے یا ناٹک کی ابتدائی تاریخ کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم ھوجائے تو یہ مشکل ایک حد تک آسان ھوسکتی ھے اور چھایا ناٹک کی قدامت کا کچھ نہ کچھ اندازہ کیا جا سکتا ھے -

ھندی ناٹکوں کی ابتدا بھرت منی کے زمانے سے بتائی جاتی ھے - لیکن اُنھوں نے جو ''ناٹیہ شاستر'' لکھا ھے وہ مختلف تصانیف کے اخذ و اقتباس کا حامل ھے - اِس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اِس تصنیف سے پہلے اچھے ناٹکوں کی ایک معقول تعداد وجود میں آچکی تھی اور اُن کا مطالعہ غایر نظر سے کیا جا چکا تھا - بھرت منی کے بے عدیل مبصر ھونے کا ثبوت یہ ھے کہ کالیداس جیسے چوٹی کے مصنف نے اُنھیں ''آچاریہ'' سے خطاب کیا ھے - بھرت منی کا زمانہ عیسوی سے کم از کم تین چار سو سال پیشتر کا مانا جاتا ھے - چانکیہ کے ارتھ شاستر میں بھی ناٹکوں کا ذکر آیا ھے - اس سے بھی یہی ثابت ھوتا ھے کہ تقریباً تیسری صدی ق - م میں ھندوستان میں ناٹکوں کا رواج عام تھا -

" ناتیہ شاستر " کی تقریب میں مذکور ہے کہ ایک بار ویوسوت منو (वैवस्वत मनु) کے - عہد میں لوگ بہت خستہ حال ہو گئے تھے - چنانچہ ان کی حالت زار سے پریشان ہو کر اندر اور دوسرے دیوتاؤں نے برھما کے حضور میں عرض کی کہ وہ کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے دنیا والے گھڑی دو گھڑی کو غم غلط کر سکیں - اسپر برھما نے چاروں ویدوں کی مدد سے ناتیہ شاستر " ایک پانچواں وید تیار کیا - اِس پانچویں وید کے لیے رگ وید سے مکالمے ' سام وید سے نغمے ' یجروید سے تمثیل اور اتھر وید سے رس لیے گئے -

یہ ممکن ہے کہ یہ قصہ اساطیر قدیمہ سے زیادہ قابل اعتبار نہ ہو لیکن اس سے کم از کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ ناٹک کا ویدوں یا اُنکے زمانے سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور ہے - مذکورۂ بالا تمام باتوں سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں اُن کی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ویدوں کے ضبط تحریر میں آنے سے پہلے چھایا ناٹک تقریباً مکمل ہو چکا تھا -

رگ وید میں کم و بیش وہ تمام باتیں بکھری ہوئی ہیں جو ایک ناٹک کے لیے ضروری ہیں - بہت سے منتر ایسے ہیں جن میں اندر ' سوریہ ' اُوشا ' مِروتُ (मरुत) وغیرہ دیوتاؤں سے طرح طرح کی پراارتھنائیں (درخواستیں) کی گئی ہیں - ادبی نقطۂ نظر سے ان منتروں کا شمار گیت کاویہ (गीतिकाव्य) میں ہوتا ہے - اس کے علاوہ وشوامتر ' وششت ' اور سداس وغیرہ رشیوں اور راجاؤں کی تعریف اور توصیف بھی موجود ہے جو مہا کاویہ (Epic Poetry) کا لازمی جز ہے - ساتھ ہی

سرما (सरमा) اور پرنس (पणिस) یم اور یمی پروروا (पुरूरवा)
اور اُورشي (उर्वशी) وغیرہ کے گیتوں میں مکالموں کی بھرمار ہے -
اسی بنا پر میکڈانل ' کیتھ ' میکسمولر اور پشل وغیرہ نے ابتدائی
ہندي ناٹکوں کو دنیا کے اولین ناٹک تسلیم کیا ہے - مغرب کا
مشہور نقاد رزوے اس نظریہ کے مخالفین میں پیش پیش ہے
لیکن وہ بھي بوجوہ یہ ماننے کے لیے مجبور ہے کہ پانني کے
زمانے تک ہند میں ناٹکوں کا رواج عام ہوگیا تھا - خود پانني
کي وياکرن میں ناٹیہ شاستر کے ماہروں شالن (शिलालिन) اور
کرشاشو (कृशाश्व) کے نام ملتے ہیں - پانني کے سوتروں پر
تبصرہ کرتے ہوئے پتا نجلي نے اپنے " مہا بھاشیہ " میں ناٹکوں کا
ایک مسبوط تذکرہ لکھا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ پانني سے
پہلے پہلے یہ فن تکمیل کو پہنچ گیا تھا -

ہري ونش پران میں جو مہابھارت سے کچھ ہی بعد کی
تصنیف ہے لکھا ہے کہ وجر نابھ (वज्रनाभ) کے شہر میں
کوویرمبھا بھسار (कौवेरंभाभिसार) ناٹک کھیلا گیا تھا - مہاویر سوامی
سے دو تھائی سو سال بعد بھدرواھو سوامی گذرے ہیں اُنہوں نے
مکپ سوترووسچن میں ایک سادھو کا ذکر کیا ہے جو ناٹک
دیکھ کر دیر سے لوٹنے پر ملامت کیا گیا تھا - کوویرمبھا بھسار کے
بارے میں ہری ونش پران میں لکھا ہے کہ شور (शूर) نے
راون کا ' سانب (सांब) نے ودوشک کا ' گد نے پارپیارشوک
(पारिपार्श्वक) کا اور منورتی نے رمبھا کا پارٹ کیا تھا - اگر یہ
صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کرشن جی کے عہد
میں ناٹک کھیلنے کا دستور عام تھا -

بھرت ملي کے سوتر بدھ گرنتھ سے اس امر کا مزید ثبوت ملتا ھے کہ ویدوں کے زمانے میں ناٹک کھیلے جانا تفریح وتفنن کا باعث بن گیا تھا - اس لحاظ سے چھایا ناٹک اور بھی پہلے کی چیز قرار پاتی ھے - انسائیکلو پیڈیابریٹانکا میں اس کے آغاز کي مکمل داستان مذکور ھے - انیسویں صدي کے اوائل میں سیلي میتھو گراف ایجاد ھوا - ڈبلو - جي ھومر نے پہلے پہل سنہ ۱۸۳۳ع میں اس کا خیال دلایا تو دنیا کے تمام سائنس‌داں اس کي طرف متوجہ ھوگئے - سنہ ۱۸۷۷ع میں اي - مے برج (E. Maybridge) نے متعدد کیمروں کی مدد سے ایک بھاگتے ھوئے گھوڑے کی مختلف حالتوں میں تصویر لیکر اس مبہم خیال کو ممکنات کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا - سنہ ۱۸۸۳ع میں پیرس کے مشہور کیمرے میں مرے (E. J. Marey) نے باقاعدہ تجربات شروع کرکے بالاخر سنہ ۱۸۹۰ع میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی - سنہ ۱۹۲۰ع میں ایم - اے جاسٹن نے اس حیرت انگیز مشین میں ایک اور ایزاد کی اور متکلم فلم سازي (Talkie) کے لیے ایک وسیع میدان تیار کر دیا -

اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل غور ھے کہ مغرب سنیما کي جانب اس وقت رجوع ھوا جبکہ وھاں ناٹکوں کی تکمیل ھو چکی تھي - لیکن قدیم ھند میں ناٹک سے پہلے چھایا ناٹک کی بنیاد پڑي - جہاں تک ایکٹنگ کا تعلق ھے سنیما کا کام ناٹک سے کہیں زیادہ مشکل ھے - اس لیے اغلب ھے کہ جب ھند قدیم میں اس مایۂ تفریح کی مانگ بڑھي ھوگی تو لوگ چھایا ناٹکوں کي مشکلات سے گھبرا کر پیسہ کمانے

کے الیے میں ناٹک کی جانب متوجہ ہوگئے ہونگے - بھدرواِهو کی تحریریں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے اُس عام بد مذاقی کا ثبوت ہیں جو اُس زمانے کے ناٹکوں میں پائي جاتی تھي اور جس کي وجہ فن کی عمومیت اور روز افزوں مانگ کے سوا اور کیا ہو سکتي ہے -

چھایا ناٹک کے لیے ایسے پلاٹ کی ضرورت ہے جس میں صرف عمل هي عمل (action) کا دخل ہو - متکلم فلمیں ایک حیثیت سے ناٹک هي کي نقل ہیں - اس لیے اِن پر یہ پابندی عائد نہیں ہوتي - یہي باعث ہے کہ چھایا ناٹک کے مصنفوں کو رامائن اور مہابھارت میں دلکشی کا خاص سامان نظر آیا - ایکٹنگ کے اعتبار سے چھایا ناٹک کو عام ناٹکوں پر فوقیت حاصل ہے ناٹک کا ایکٹر اظہار خیال و جذبات کے لیے الفاظ سے کام لیتا ہے جس سے اس کے لب و لہجہ میں نقالی اور تصنع پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایکٹنگ کے ضروري جزو یعنی حرکات و سکنات کی جانب سے بڑي حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے - لیکن سنیما ایکٹر بالکل ایک بے زبان مخلوق ہے ؛ اُسے ہر بات اپني نقل و حرکتوں سے نمایاں کرنا پڑتی ہے - ناٹک کے ماحول و مناظر سے خواہ مخواہ بناوٹ و نقالی ترشح ہوتی ہے لیکن خاموش فلموں یا چھایا ناٹکوں کے تمام و کمال واقعات (بشرطیکہ وہ بعید از فہم نہ ہوں) واقعیت کے گہرے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں - جب سنیما ایکٹر کا کام انتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہم ایک قدرتی جوش سے اُچھل پڑتے ہیں ناٹک کے اسٹیج پر کبھي ایسا منظر رو نما نہیں ہوتا -

---

سودا

بحیثیت مرثیہ نگار

(از صغیر احمد جان ' ایم - اے) -

یہ سمجھنے کے لیے کہ بحیثیت مرثیہ نگار سودا کا کیا مرتبہ ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ سودا سے قبل مرثیہ میں کیا کیا ترقی ہو چکي تھي - چونکہ ہم اُس زمانے میں ہیں جس میں مرثیہ اپنے کمالات کے تمام مدارج طے کر چکا ہے اور ہم کلام انیس و دبیر کے پڑھنے اور سمجھنے والے ہیں لہذا اُس ماحول کو ذہن نشین کیے بغیر ہم نہ سودا کے مراثی کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ منصفانہ داد دے سکتے ہیں -

صنف مرثیہ نگاري اردو شعر و شاعري کے ساتھ ہی عالم ظہور میں آئي - زمانۂ حال کي تحقیقات کی رو سے زبان اردو کا سب سے پہلا شاعر محمد قلي قطب شاہ والي گولکنڈہ ہے ' جس نے ملک گولکنڈہ کے علاوہ اقلیم سخن پر سنہ ۱۵۸۰ع سے سنہ ۱۶۱۱ع تک حکمرانی کی - گو قطب شاہ سے قبل بھی تقریباً دو سو سال تک اردو نظم و نثر کا سراغ چلتا ہے مگر وہ زیادہ تر مذہبي رنگ، میں رنگي ہوئي ہے اور کوئی ادبی اہمیت حاصل نہیں ہے - قطب شاہ ہي وہ اول شاعر ہے جس نے اردو میں ادبی شان لیے ہوئے شعر و شاعري کی داغ بیل ڈالي - اُس نے جہاں

غزل - مثنوی - قصیدہ وغیرہ اصناف شاعری میں داد سخن دی وہاں مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے - نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :—

دو جگ اما ماں دکھ نے جھو کرتے جي زاری وائے وائے
تن دوں کی لکڑیاں جالکر کرتي ھھں خواری وائے وائے
اسمان جھمج جالا ھوا سورج اگن والا ھوا
چلدر سوجل کالا ھوا ہے دکھ اپاري وائے وائے
یک پوت کو دیتے زھر یک پر کھیلتے خنجر
کافر کیے کیسے قہر یسو زخم کاري وائے وائے
قطبا کو ہے الاہ مدد وسعا ہے اس دل میں خدا
تونج مدد حیدر ولد بھریاں کو زاري وائے وائے

قطب شاہ کے بعد دکن میں برابر کچھ نہ کچھ مرثیہ کہا جاتا رہا - ہر شاعر مرثیہ گوئي کو ثواب آخرتي اور نجات دارین کا ذریعہ سمجھتا تھا اور بطور توشۂ آخرت تھوڑا بہت ضرور کہہ لیا کرتا تھا - لیکن کسي شاعر نے اس صنف پر زیادہ زور نہیں دیا اور نہ اِس میں کمال شاعري کے جوھر دکھائے - دکني مرثیہ گو شعرا میں سے صرف ایک شاعر کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے :—

ہاشم - یہ برہان پور کے رہنے والے تھے - انہوں نے جہانگیر کا عہد پایا ہے - فرماتے ہیں :—

کوئي نہ بیگانہ از بلد و خطا
ظلم تھا سب خویش سب اقوام کا

ختم ہے یو امتحان و بلا

ختم ہے جوں حق سمجھی پیغام کا

تھا بر اولاد شنیع المذہبین

ظلم بے حد در جہاں انسام کا

زخم لاگا مصطفیٰ کے سر اوپر

کسر پڑا جوں آفتاب اس بام کا

زہر دے مارا حسن کوں مکرسیں

سبز تھا وہ چہرۂ گلفام کا

کربلا میں تھے حسین ابن علی

آرزو میں شہر کے اک جام کا

ماتم آل نبی ہاشم علی

آج کت ہوکا اسی ایام کا

ولی کا دیوان دھلی پہنچا تو وہاں ریختہ گوئی میں اُس کی تقلید کی جانے لگی - ولی نے مرثیے میں کبھی طبع آزمائی نہیں کی تھی[1] اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اُس کے قریبی مقلدین کے ہاں مرثیے کا پتہ نہیں چلتا - البتہ فضلی نے سنہ ۱۱۰۵ھ میں "روضۃ الشہدا" کا اُردو میں ترجمہ کیا - اُس میں اُس

---

۱ - مثنوی روضۃ الشہدا غلطی سے ولی اورنگ آبادی کی طرف منسوب ہے - دراصل یہ مثنوی سید محمد فیاض ولی (ویلوری) نے سنہ ۹ ۱۱ھ میں تصنیف کی تھی - اِس مثنوی کے خاتمے پر سال تاریخ درج ہے —

کیا ہوں ختم جب یو درد کا حال

اگیارہ سو پہ تھا الیسواں سال

کی ایک مسلسل نظم درج کی جس میں حضرت فاطمۃالکبریٰ کے جذبات کی ترجمانی کی ہے - چند شعر ملاحظہ ہوں :—

یہ کیا برا پھرا تھا میرا ہاے اے لوگو!
دولھا کو سو ھائی نہ میں اور موت سوھائی
لاشے کے گلے بیٹھ کہا اے مرے نوشہ
تو مرگیا اور میرے تئیں موت نہ آئی
اے میرے بلے تیری بلی تیرے بلا ھائے
کفنی گلے میں ڈال کرے گی یہ گدائی
اے میرے بلے ساس کو کیا منھ میں دکھاؤں
دل میں کہے گی کیسی بھو بیاہ کے آئی

فضلی کے علاوہ اُس زمانے کے کسی مرثیہ گوکا نام یا کلام ہم تک نہیں پہنچتا - البتہ سودا نے اپنے شہر آشوب میں میاں مسکین مرثیہ گو کا ذکر اس طرح کیا ہے :—

استقاط حمل ہو تو لکھیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہیں

میر تقی میر نے بھی مرثیہ لکھا مگر وہ اُن کی شان کے شایاں نہ تھا اسی وجہ سے اُن کے کلیات میں جگہ نہ پاسکا - سودا نے ان کے ایک مرثیہ کا رد لکھا ہے جو ان کے کلیات میں موجود ہے - نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :—

دلوں پر محبوں کی حالت عجب ہے
مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روز کا غضب ہے
حسین علی کی شہادت کی شب ہے

مجلوں نے دل سے خوشی سب لتھي ہے
ہر اک گھر میں ماتم کي مجلس رچي ہے
عجب طرح کی وائے ویلا مچي ہے
کہ روز قیامت کي گویا یہ شب ہے

کوئی دل نہیں جسکو ماتم نہ ہوئے گا
وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوئے گا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوئے گا
قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جو اب ہے

دیگر

اس گل باغ امامت کے ہیں پھول
آبیاری جن کی کرتي تھی بتول
سو تن نازک پہ اس کے خاک دھول
دیدنی ہے رنگ صحبت یا رسول

گل سبھی اس باغ کے مرجھا گئے
پودے پامالی میں سارے آگئے
جو کہ آرے تھے شجر سب کھا گئے
جائے گلشن سبز و خرم ہے ببول

نوزدہ سالہ پسر اک رشک ماہ
لوٹتا تھا خاک و خوں میں پیش شاہ
ہو جہاں کیونکر نہ آنکھوں میں سیاہ
اس جگر پارہ کے تکنے برچھی کی ہول

اک پسر ششماہہ لاگا جس کے تیر
خوں ہوا جس سے دل برناو پیر
ہوگا جس کا پارۂ دل وہ صغیر
اُس کے دل میں کیسے لگتے ہونگے پھول

دیگر

کیا گردوں نے فتنے کو اشارا
بلا کو کربلا میں لا اُتارا
ہوا آخر طلب سید ہمارا
لٹا ناموس پیغمبر کا سارا

مروت شامیوں سے بن نہ آئی
ہوئی بے چشم و روے بیوفائی
ستم کی تیغ سب نے آزمائی
حسین ابن علی کو جس نے مارا

رہا جو عابدیں سو زار و بیمار
اٹھانا اک قدم کا جس کو دشوار

بلا کا مبتلا غم کا گرفتار
غریب و بیکس و بے یار و یارا

دیگر

کرتا ہے یوں بیاں سخن ران کربلا
احوال زار شاہ شہیدان کربلا
با آنکہ تھا فرات پہ میدان کربلا
پیاسا ہوا ہلاک وہ مہمان کربلا

انصاف کی نہ ایک نے کی چشم نم بار
کھولے ستم کے ہاتھ زبانیں کیا دراز
قتل امام مقصد و تیاری نماز
بدتر تھے کافروں سے مسلمان کربلا

سیلاب تھا بلا کا ہر اک سمت گرم جوش
فریاد بیکساں کی طرف کم کسوکے گوش
آل نبی تمام ہوے خوں میں سرخ پوش
صلوات بر حسین و جوانان کربلا

اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا اس کو بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرا نے اس صنف کو کبھی ادبی اہمیت نہیں دی - محض مذہبی فریضہ سمجھ کر جو کچھ ہوسکا لکھ لیا

اور مجلس عزا میں رو رولا کر "ثواب اخروی حاصل کرلیا" - غلط الفاظ - غلط محاورات - خلاف روزمرہ - عروض و قافیہ کی فروگزاشتیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں - کسی سخن فہم کو مذہبی عظمت کے خیال سے اِن فروگذاشتوں پر اعتراض کرنے اور ان مراثی کی تنقیص کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی - لیکن دبی زبان سے اتنا ضرور کہدیا کرتے تھے کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" اور شعرا تو خیر ایک طرف میر سے قادرالکلام نے بھی اِس زمین کو کچھ بلند نہ کیا -

سب سے اول سودا نے اِس صنف کی ادبی اہمیت دریافت کی اور انہوں کے کارناموں کے بعد مرثیہ جو اب تک حصول ثواب کے لیے کہا جاتا تھا ' مقتضیات شاعری کے ہم عنان ہوکر ترقی کے منازل طے کرنے لگا - چنانچہ وہ اپنے مراثی کے دیوان کے دیباچے میں فرماتے ہیں :— "لیکن مشکل ترین دقائق طریق مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے دیا چنانچہ اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا.........پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھکر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے -"

اس سے قبل کہ سودا کے مراثی کا جائزہ لیا جائے یہ کہدینا ضروری ہے کہ شروع سے میر تک مرثیہ نے صرف اِس قدر ترقی کی تھی کہ مفردہ سے مربع ہوگیا تھا - اور بس - بحریں مختلف ہوتی تھیں اور خصوصاً وہ شگفتہ بحریں زیادہ مستعمل تھیں جو بطریق سوز پڑھی جاسکتی ہیں -

سودا کی جدت پسند طبیعت نے مفردہ اور مربع کے علاوہ دیگر شکلیں بھی استعمال کیں اور اِس طرح مراثی میں کسی حد تک تنوع پیدا کر دیا - کلیات میں مراثی کی مندرجہ ذیل شکلیں پائی جاتی ہیں :- مفردہ - مستزاد مفردہ - مثلث مستزاد مثلث - مربع مستزاد مربع - مخمس ترکیب بند - مخمس ترجیع بند - مسدس - مسدس ترکیب بند - زبانیں بھی متعدد اختیار کیں - پنجابیوں کے لے پنجابی میں لکھا - دکھنیوں کے لے دکھنی میں اور پوربیوں کے لے پوربی میں -

مسدس جس نے سودا کے بعد مرثیے کے لے خصوصیت حاصل کرلی سودا سے قبل کہیں نہیں پایا جاتا - یہ جدت سودا ھی کا حصہ ھے - بعض کے نزدیک اس کے موجد میاں سکندر پنجاب کے رھنے والے تھے - یہ سودا کے ھم عصر تھے - اِن کا ایک مسدس مرثیہ نواح لکھنؤ میں زباں زد خاص و عام ھے - اِس مسدس کے علاوہ سکندر کا اور کلام دستیاب نہیں ھوتا - یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ سودا نے میاں سکندر کی تقلید میں مسدس لکھا ھو - مرزا نے جملہ شکلوں میں مرثیہ لکھا چنانچہ مسدس بھی لکھا ھوگا کوئی وجہ نہیں کہ مسدس کو چھوڑ دیا ھو -

سودا کے جملہ مراثی بینیہ ھیں - واقعات کربلا کے متعلق کوئی تفصیلی بحث نہیں کی گئی ھے لیکن جابجا غم انگیز اشارے اور جگر خراش کنائے کرتے جاتے ھیں جن سے مراثی میں سوز و گداز اور اثر کی کوئی انتہا نہیں رھتی - مضامین کی آمد اور بیان کی سلاست سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ شاعر خود اثر قبول کرکے لکھ رھا ھے - خود بین کرتا

ہے اور پھر اس طرح کہ سننے والوں کو بھی صبر کا یارا نہیں رہتا - لیکن تعجب ہے کہ خود سودا کے زمانے میں لوگ ان کے مرثیوں کو کہتے تھے کہ ان میں مرثیت نہیں، شاعری ہے - اور سودا خود بھی ان کی بے انصافی سے نالاں ہیں -

مفردہ کا ہر شعر یا مربع کا ہر بند نوحے کی طرح اپنی اپنی جگہہ مستقل معنی رکھتا ہے اور مرثیے میں عام طور پر تسلسل کلام نہیں پایا جاتا - مثلاً -

کریں نہ اہل جہاں کس طرح سے شیون و شین
سروں کو اپنے نہ پیٹیں سو کیوں وہ کرکے بین
ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسین
یہ تعزیہ ہے رموز خدا کے محرم کا

ہزار طرح سے دریا رواں تھے دنیا میں
جو کوئی تھا سو وہ سیراب تھا ہر اک جا میں
کئی غریب جو تھے کربلا کے صحرا میں
نصیب اُن کو نہ قطرہ ہوا کسی یم کا

یہ ظلم کس کی زباں گو ہے کہنے کا یارا
نبی کا قتل کیا ظالموں نے گھر سارا
جو ان میں طفل تھا شیر ماہہ اس کو بھی مارا
کیا نہ عمر نے کچھ فرق زاید و کم کا

لیکن کہیں کہیں ربط کلام سے واقعہ نگاری کی شان پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے :--

راوی کہے ہے جنگ نے پایا جب انصرام
آل نبی کے خون سے وضو کرکے اہل شام
کاٹا تھا چڑھ کے چھاتی پہ جن نے سر امام
پیچھے کھڑے ہو اُس کے دوگانا ادا کیا

پڑھ کر نماز جمعے کی اور خطبۂ یزید
غارت کے واسطے دھنسے خیمے میں وہ پلید
لوٹا سب اس طرح سے کہ نے دید نہ شنید
گھر سیل نے بھی یوں نہ کسی کا صفا کیا

یہ دخل کیا بچا ہو کسی پاس تار زر
چادر رہی حرم میں کسو کے نہ سر اُپر
باہر کیا نکال کے سب کو برھنہ سر
جتنے تھے اہل بیت اُنھوں بے ردا کیا

مراثی میں روایات کا نظم کیا جانا (جس نے آگے چل کر ایک خاص حیثیت اختیار کی ہے) اِن کے ہاں ابتدائی حالت میں پایا جاتا ہے - مثلاً

پھر رہیں جو تھیں تو دیا خاک و خوں میں ڈال
چاہا کہ اُن کو گھوڑوں سے کروائیں پائمال

پہنچا جو ایک مشہر تو قر اس سے وہ شغال
اپنے خیال خام کو دل سے جدا کیا

اس روایت کو پھیلا کر میر ضمیر نے ایک پورے مرثیے میں نظم کیا ہے - یا مثلاً اہل بیت گرفتار ہوکر یزید کے دربار میں پہنچتے ہیں - یزید حضرت عابد کو مخاطب کرکے کہتا ہے :-

اِتنا ہي اِس کلام سے لکھتے ہیں راویاں
بولا یزید تھا ترا دادا بھی پہلواں
تو بھي تو اُس کا پوتا ہے آخر اے نوجواں
کُشتی سے تو بھی آپ کو کچھہ آشنا کیا

میرے بھي ایک بیٹا ہے تیرے ہی سن و سال
تجھہ سے وہ کُشتي لڑنے کا رکھتا ہے اب خیال
دونوں میں دیکھیں کس کو ہے اِس فن میں اب کمال
تم میں سے کس نے کُشتی کا فن خوب سا کیا

سجاد نے غضب سے کہا ہوکے چشم تر
کُشتی کا لڑنا کار اذل سے ہے بیشتر
کُشتي ہے کام اس کا جو تیرا سا ہو پسر
یہ کام کس امام نے کہہ تو بھلا کیا

یہ بات تیں کہي ہے سمجھہ کر مجھے نحیف
نزدیک حق قوي ہے تو سمجھے جسے ضعیف

چاہے جو تو کہ کُشتي میں مجھ کو کرے خفیف
اِس امر میں سو کب میں یہ تیرا کہا کیا

مردی جو آزمائے تو یہ مان میری بات
اک تیغ اپنے بیٹے کو اک تیغ میرے ھاتھ
اُپس میں ہم لڑیں کرے نظارہ کائنات
دیکھیں کہ کس کی تیغ نے کس کو دوتا کیا

کُشتي لڑوں میں اُس سے جو مجھ سا ہو نا اُمید
باپ اُس کا میرے باپ کی مانند ہو شہید
قاتل ہو اُس کے باپ کا بھي تجھ سا اِک یزید
تب کُشتی لڑکے سمجھوں کہ میں نے بجا کیا

نانا بھی اُس کے باپ کا ہو ختم مرسلیں
دادا علي سا اُس کا ہو سالار مومنیں
زھرا سی اس کی دادی ہو مسجود اھل دیں
جس کو خدا نے حامیٔ روز جزا کیا

اور باپ کے الم میں گرفتار مجھ سا ہو
غربت میں بے برادر و بے یار مجھ سا ہو
بے دست و پائی اپلی سے ناچار مجھ سا ہو
انلنا سوکس کو دھر نے بے اقربا کیا

طے بھڑیوں میں کس نے کی چالیس دن کی راہ
کھینچی مہار اونٹوں کی تا شام از پگاہ
نیزے پہ سر کو باپ کے کرتا ہوا نگاہ
یوں کن نے تجھ تک اپنے تئیں پہنچتا کیا

ایسا حضور تیرے جو کوئی ہو مجھ سوا
تب کشتی اُس کے ساتھ تو میرے تئیں لڑا
بیٹے سے تیرے کشتی کی نسبت مجھے سو کیا
کیجے وہ کام تا کہے کوئی بھلا کیا

خاموش ہو رہا یہ سخن کہکے عابدین
تاثیر صرف اُس کے سے روتے تھے حاضرین
دیوان سے اُٹھا وہ لعین ہوکے شرمگین
عابد کے حق میں پھر نہیں معلوم کیا کیا

مندرجہ بالا ٹکڑا مسلسل سوال و جواب کی ایک عمدہ مثال ہے - مزید برآں اس سے یزید اور حضرت عابد کی شخصیتوں پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے -

مناظر جنگ کو دبیر نے اور خصوصاً میر انیس نے معراج کمال کو پہنچا دیا - لیکن ملاحظہ ہو سودا کے ہاں یہ کس ابتدائی حالت میں ہے - حضرت عباس مشکیزہ لیکر نہر پر پانی لینے جاتے ہیں - چنانچہ :—

چلا عباس جب قربوس زیں پر مشک کو دھر کر
تو لائے دو بمھداں کافر اُس کے قصد پر اکثر

رکھا جن نے قدم تک آگے اپنا چھوڑ کر لشکر
جہنم کو اسے ووھیں اجل کے ھاتھ بھجوایا

جگھہ سے اپنے کوئی خوف کے مارے نہ ھلتا تھا
چلے تو نیزہ اُس جا سے جہاں سے نہر چلتا تھا
کوئی دیکھ ان کے حربوں کو وہ اپنے ھاتھ ملتا تھا
لب دریا تلک اپنے تئیں ھر طرح پہنچایا

حضرت عباس نہر سے مشک بھر کر واپس ہوتے ھیں - یکایک یزید کی فوجیں اُن پر ٹوٹ پڑتی ھیں - اول تو حضرت عباس ان سے درگزر چاھتے ھیں - لیکن .

نہ مانا جب تو بیٹھا فوج میں وہ اشجع عالم
لگی تب صف بہ صف لشکر کی ہونے درھم و برھم
جدھر کو رخ کیا کشتوں کے پشتے واں ہوئے اُس دم
ادھر خوں کے بہے نالے جدھر اُس کا پڑا سایا

کہوں کیا جس طرح چھایا تھا ابر آھن کا اُس جا پر
سناں پر تیغ برسے تھی پڑی اور تیغ پر خنجر

کردار نویسی ، انیس کی مرثیہ نگاری کا خاص جوھر ہے -
اِس کی ابتدائی شکل سودا کے ھاں ملاحظہ ھو - ظاھر یہ کرنا ہے

کہ یزیدیوں کو بجاے خدا کے یزید کا خوف تھا - دیکھئے کس بے تکلفی سے اُنھیں کے ملھ سے اُن کا کردار ظاہر کرتے ھیں :—

پہلے یہ چاھتے تھے لعینان کربلا
خیمے سمیت اھل حرم دیجے جلا
بولا اُنھیں میں ایک نہیں کام یہ بھلا
شاید کہے یزید مري بے رضا کیا

سودا مضامین نو بہ نو کي تلاش کرتے ھیں اور جس قدر زبان میں وسعت پاتے ھیں روایات کو نئے نئے انداز سے نظم کرتے ھیں - اِس کے علاوہ طرز بیان میں بھي کبھي کبھي جدت سے کام لیتے ھیں مثلاً اِس مرثیے میں :—

میں ایک نصاری سے یوں از رہ نادانی
پوچھا کہ مسلماں ہے بولا وہ یہ نصراني
عیسیٰ کے نواسے کو ہم عہد کی قرباني
کرتے تو ہمیں پھبتا دعواے مسلماني

مرثیے کا ایک عجیب ڈھنگ اختیار کیا ہے - یعني اس نصرانی کي زباني کربلا کے جگر خراش واقعات دھراتے ھیں - جب اُس کی طعن و تشنیع حد سے گذر جاتی ہے تو سودا جواب دیتے ھیں کہ بعض ریاکار رسول مقبول کے خوف سے بظاھر ایمان لے آئے تھے لیکن باطناً دین کے دشمن تھے - یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے امام حسین یعني رسول کے نواسے پر موقع پاکر یہ یہ مظالم ڈھائے - یہ جواب سنکر وہ نصرانی ایمان لے آتا ہے -

حضرت قاسم کے اِس مرثیہ میں :—

یارو سخن نو یہ سنو چرخ کہن کا
تھانا ہے عجب طرح سے بیاہ ابن حسن کا
سنجوگ یہ کچھ باندھا ہے دولہا سے دلہن کا
ھر تار کفن کا ہے سو ڈورا ہے لگن کا

ھندوستانی شادی بیاہ کی تمام رسوم کا ذکر کیا ہے اور ہر رسم کا ذکر کرتے ہوئے طرح طرح سے بین کیے ھیں -

سودا سے قبل جس قدر مرثیہ گو شعرا کا کلام دستیاب ہوتا ہے اُسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا ھی وہ پہلے شاعر ھیں جن کی اُپج اور اختراع نے تمام عرب شخصیتوں کو ھندوستان میں لاکھڑا کیا - طرز معاشرت - طرز رفتار و گفتار - یہاں تک کہ طرز خیال اور مخصوص ذھنیت ؛ غرض ھر حیثیت سے اُن کو ھندوستانی رنگ میں رنگ دیا - اِس کجروی کے جواز یا عدم جواز کی بحث کے لئے یہ موقع مناسب نہیں - دکھانا صرف یہ مقصود ہے کہ اِس ادبی بدعت کا شرف اولیت بھی سودا ھی کو حاصل ہے - اور یہی بدعت سودا کے بعد مرض متعدی کی طرح تمام مرثیہ گویوں میں عام ھو گئی - تعجب تو یہ ہے کہ انیس سا صاحب کمال بھی اِس بھول بھلیاں سے رھائی نہ پا سکا -

تشبیہات مفرد و مرکب کی جدت صرف انیس کا حصہ ہے - اور یہ بہت کچھ زبان کی صفائی اور پختگی کا طفیل ہے - لیکن ذرا سودا کے ھاں بھی ایک مرکب تشبیہ کا لطف اُٹھائیے :-

چمٹ کے اُس سے گھے آبدیدہ ھو رہے تھا
کہ اپنے اشک سے اُس کا غبار دھو رہے تھا

هر ایک زخم سے یوں ملنہہ لگا لے رو رے تھا
کہ جس طرح سے گرے گل پہ دانہ شبنم کا

مرزا کے ہاں سلام دو شکلوں میں پائے جاتے ہیں (۱) منفردہ یعنی بطور غزل یا قصیدہ (۲) مربع - گو انیس و دبیر کے عہد میں سلام کو بڑی بڑی ترقیاں ہوئیں - ہر قسم کے مضامین اس میں شامل ہوئے - معاشرتی ' اخلاقی ' فلسفیانہ ' وغیرہ وغیرہ - غرض سوائے ہوا و ہوس کے مضامین کے سلام کسی مضمون میں بلند نہیں رہا - یہاں تک کہ اُس میں شاعرانہ فخر و مباہات - طنز و تعریض کو بھی روا رکھا گیا - مثلاً میر انیس فرماتے ہیں -

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

میر مونس فرماتے ہیں -

بھلا تردد بیجا سے اُس میں کیا حاصل
اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
عجب مزا ہے کہ مضموں تو دستیاب نہیں
مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

اس کی وجہ بقول مولانا شبلی صرف یہ ہے کہ اُس دور میں غزل کی لے دنوں میں اس قدر رچی ہوئی تھی کہ مرثیہ گویوں کو بھی اِس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا - اور جب یہ انداز غزل خوانی اختیار کیا گیا تو پھر ہر

قسم کے مضامین بھي ناگزیر ہو گئے - سودا کے سلام بالکل صاف اور سادہ ہیں اور اُن میں نہایت سادگي اور خلوص سے محض سلام کے مضامین نظم ہوئے ہیں ملاحظہ ہو :—

ادب سے بھیجے ہے تجھپر ترا غلام سلام
قبول ہو تري خدمت میں یا امام سلام

——

تمھیں سلام کریں پہلے تو وہ پاویں نجات
اسي سے فرض ہوا ہے بہ مذھبین سلام

——

نبي کے نور بصر پر کہو درود و سلام
علی کے لخت جگر پر کہو درود و سلام
کہے ہے عرش کے سکاں سے جبرئیل سدا
امام جن و بشر پر کہو درود و سلام

——

درۃالتاج ھل اتٰی پہ سلام معنٔی حرف انمّا پہ سلام
صدق دل سے مدام بھیج دلا صاحب شان قل کفی پہ سلام

——

حسین تجھ کو یہ عرش بریں کرے ہے سلام
وھاں سے آن کے روح الامین کرے ہے سلام
فقط نہ گردوں ھي تسلیم میں ہے تیري خم
تجھي کو عیسیٰ گردوں نشین کرے ہے سلام

جیسا شروع میں ذکر ہوا سودا نے میر کے مرثیے کا رد لکھا تھا - جو جو اعتراض سودا نے میر پر عائد کئے ہیں وہ سب حق بجانب ہیں - بیشک سودا نے اپنے مرثیے میں اُن خامیوں کو بڑی حد تک دور کیا اور کلام کو مزیدار بنانے کی بہت کوشش کی - اگرچہ وہ مرثیہ کو اپنی غزل اور قصیدے کے پائے تک نہ پہنچا سکے تاہم مرثیہ کو ادبی رنگ میں رنگ کر آئندہ نسلوں کے لئے ترقی کی راہیں کھول دیں -

بقول سودا مرثیہ گو کو " مرتبہ در نظر رکھکر " مرثیہ کہنا چاہئے - میں نے متعدد جگہہ دیکھا ہے کہ ناقدان فن کو اِس امر کی شکایت ہے کہ سودا نے اس " مرتبہ در نظر رکھکر مرثیہ کہنے " کے مفہوم کو صاف نہیں کیا - لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر اِس کے مفہوم کو واضح کر دیا جائے - اگرچہ یہ بحث کسی قدر طویل ہو جائیگی تاہم دلچسپی سے خالی نہ ہو گی -

سودا نے میر کے مرثیے کے علاوہ اُن کے ایک سلام پر بھی تنقید کی ہے - یہ تنقید ایک مثنوی کی شکل میں ہے اور کلیات سودا میں شامل ہے - میر کے سلام کا مطلع ہے :—

اے نبی کے باطناً رتبے کے والی السلام
ظاہر اُن سے بھی ہو تم اک نوع عالی السلام

اِس پر سودا مندرجہ ذیل تنقید فرماتے ہیں :—

پہلے یہ کہئے اے کرم فرما
باطنی رتبہ ہے نبی کا کیا

دوسري بات يہ جو کہہ ڈالی
ہو تم اِک نوع اُن سے بھي عالی
اور اِس نوع کو بیاں کیجیے
مجھ کو آگاہ اس سے کر دیجیے
یا وہ جس طرح مجھ پہ ہے اثبات
کہو تو عرض میں کروں وہ بات
گرچہ وہ شخص ہے امام حسین
ایک دن جس کو سیدالثقلین
لگے فرمانے مجھ کو بتلا تو
مرتبے میں بڑا ہوں میں یا تو
تب یہ چھاتي پہ لوٹ کر بولا
کیوں یہ سر رشتہ بات کا کھولا
عرض کرتا ہوں مجھ کو کیجیو معاف،
دل میں کر لیجیو سن کے یہ انصاف
ماں مری فاطمہ، علی ہے باپ
والدین اپنے اب بتاویں آپ
اور جس شخص کا نواسا ہوں
امر ہو تو اُسے بھی بتلا دوں
حق میں جس کے ہے آیۂ لولاک
بزبانی ہے خالق افلاک،
سب نبي جان اُس کو مانیں ہیں
اپنے نانا کو آپ جانیں ہیں،
نور چشم اپنے سے غرض سن کر
یہ لطیفہ ہوئے خوش آں سرور

ان کے رتبے کی جو بہم یہ نمط
لیک جو آپ سمجھیں ہیں سو غلط
ظاھرا تم کو ہے یہ قصہ یاد
جس کی رو دے کے فہم کر برباد
رتبۂ باطنی پیغمبر
اپنے نزدیک ایک ٹھہرا کر
نسبتی مرتبے کو تم فائق
اس پہ سمجھے ہو یہ نہ تھا لائق
باطنی رتبہ جو نبی کا ہے
اس کے ما فوق ہے جو بیجا ہے
موجب اس رتبے کے نبی کریم
آپ کو بولے احمد بے میم
میم احمد سے کر دیا جب رد
تھا جو احمد سو ہو گیا وہ احد
احدیت سے ہے مرتبہ بالا
سمجھے کا تب ھی پوچھنے والا
فہم یوں باطنی سے ماھر ہے
اس سوا رتبہ جو ہے ظاھر ہے
کس طرح سے کہو تو سبط نبی
رتبۂ باطنی سے ہو عالی

سلام کا پانچواں شعر ہے :—

اے ھوالاول ھوالآخر کے مالک بالیقیں
وے ھوالظاھر ھوالباطن کے والی السلام

تنقید ملاحظہ ہو:—

کہا ھوالاول و ھوالآخر
کہا ھوالباطن وھوالظاھر
حق کی جانب پھرے ہے ان کی ضمیر
اس سوا جس پہ کہئے ہے تکفیر
کہا یہ خاطر میں آپ کے آیا
مالک اس کا حسین ٹھہرایا

غرض اسی طرح باقی اشعار پر بھی تنقید کی ہے - میر صاحب نے پہلے شعر میں امام حسین کو رسول مقبول سے مرتبے میں بڑھا دیا بلکہ "باطناً رتبے کے والی" کہکر احد کے برابر کر دیا - اور پانچویں شعر میں خداوند تعالیٰ کی صفات سے متصف کر دیا - چنانچہ سودا اس تنقید کے بعد ھی نثر میں اپنے مراثی کا دیباچہ تحریر فرماتے ھیں اور اُس میں وہ جملہ آتا ہے یعنی "پس لازم ہے کہ مرتبہ درنظر رکھکر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے" یہ اشارہ میر کے اسی سلام کی طرف ہے جس کی تنقید اوپر درج کی گئی ہے -

سودا نے خود اپنے مراثی میں "مرتبہ در نظر" کا بہت خیال رکھا ہے - جوش عقیدت میں کوئی بات ایسی نہیں کہتے جو قابل مواخذہ ہو - البتہ کہیں کہیں زبان ایسی استعمال کر جاتے ھیں جو امام حسین کے مرتبے کے شایان شان نہیں ہوتی - مثلاً -

اس خوشی کو میرے سراپا میں بھر دیا
لاکر مجھے حسین سے غاصب کا سر دیا

یا مثلاً پر اپنے جہل سے نہ مرا مدعا کیا ۔

ہر چند یہ کلمات یزید کی زبان سے ہیں تاہم مرثیہ پڑھنے والے کی زبان سے ایسے الفاظ کا ادا ہونا ہی حضرت امام کی شان میں بہت بڑی بے ادبی ہے ۔ اس کے علاوہ بعض اوقات متکلم کی زبان سے اکثر ایسی عامیانہ و مبتذل بات کہلواتے ہیں جو اُس کے مرتبہ سے گری ہوئی ہوتی ہے مثلاً ۔

عابد نے یوں جواب دیا سن کے وہ کلام
میں بھی امام اور مرا باپ بھی امام

سودا میر سے اس بات پر بھی چیں بہ جبیں ہوئے تھے کہ وہ جابجا غلط الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن افسوس خود بھی بے تکلفی سے غلط الفاظ استعمال کر جاتے ہیں ۔ مثلاً ۔

یوں پیک غم نے آکے وہیں گھر بہ گھر کہا

گھر بہ گھر غلط ترکیب ہے ۔

کہ مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل سے شام

کربل بجائے کربلا غلط ہے ۔

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی
جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذادی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی
یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری بیدادی
کون فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اس کے تو نہیں ڈرتا ہے

مصرع اول و چہارم کا قافیہ مکرر ہے ۔

سودا کا مرثیہ بحیثیت ایک مرثیہ گو کے زیادہ تر تاریخی

اهمیت رکھتا ھے - ان کے مراثی کو ھم مرثیہ کی تدریجی ترقی
کی تاریخ سے جدا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ گذشتہ اور آئندہ
مرثیوں کی بلندیوں کی ایک اہم کڑی اور ترقی کا پہلا زینہ ھے ،
بغیر اس کے ھم مرثیے کی بلندیوں کی پیمائش نہیں کر سکتے -

تبصرے

انار کلی

(از محمد اظہارالحسن بی - اے - ایل ایل بی علیگ)

دارالاشاعت ' لاہور نے ادب لطیف کی بعض اچھی کتابیں شائع کی ہیں - سید امتیاز علی صاحب تاج کی ' انار کلی ' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس قدر صاف ستھری اور نفیس چھپی ہے کہ دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے - نقش و نگار اور طباعت میں ایک حد تک مرقع چغتائی ' کا انداز مستعار لیا گیا ہے - چغتائی صاحب کے چند نقوش بھی شامل ہیں جو سوائے ایک تصویر کے کتاب سے متعلق نہیں معلوم ہوتے - تصاویر کے نیچے کوئی شعر یا کتاب کا کوئی فقرہ وغیرہ نہیں لکھا ہے جس سے مصور کے خیال پر روشنی پڑتی یا کتاب سے تصویر کا تعلق ظاہر ہوتا -

ہمارے اسٹیج کی بد مذاقی پر اس سے زیادہ سخت تنقید اور کیا ہو سکتی ہے کہ اب تک کوئی شاہکار فن ڈراما میں پیش نہیں کیا جا سکا - طبعزاد ڈراموں کا تو ذکر ہی کیا ترجموں میں بھی شیکسپیر کے ڈراموں کو جس طرح ذبح کیا گیا ہے وہ نہایت حوصلہ فرسا ہے - اس طوفان بد تمیزی میں اگر کوئی شخص حسن مذاق کا صحیح نمونہ پیش کرے تو

بھی خواہاں اردو کو مسرت ہونی چاہئے - تاج صاحب اس لحاظ سے شکریے کے مستحق ہیں - بے معنی قافیہ پیمائی اور لغو گانوں سے اس ڈراما کا دامن پاک ہے - لیکن اس کے باوجود دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے -

"انار کلی" تین باب میں ایک ٹریجڈی ہے - مختصراً قصہ یہ ہے - اکبری حرم سرا کی ایک شوخ اور حسین کنیز نادرہ اپنے کمال موسیقی سے مغل اعظم کے باجبروت دل و دماغ پر فتح حاصل کرکے انار کلی کے رنگین خطاب سے سرفراز ہوتی ہے - لیکن اُس کا دل التفات شاہانہ کی پذیرائی کے لیے تیار نہیں - اُس کی تمناؤں کا مرکز سلیم ہے - شاہی کرم فرمائیاں اس کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہیں - جذبۂ عشق مادی فرق مراتب سے بے نیاز ہوتا ہے - سلیم بھی انار کلی پر والہانہ گرویدہ ہے - دلارام ایک دوسری کنیز ہے جس کو کبھی شہنشاہ کی منظور نظر ہونے کا فخر حاصل تھا - انار کلی کے مورد اکرام شاہی ہونے میں اس کو اپنی شکست نظر آتی ہے - وہ خود بھی سلیم کو چاہتی ہے - ایک دفعہ اتفاقاً دلارام گوشۂ چمن میں سلیم اور انار کلی کو مصروف راز و نیاز دیکھ لیتی ہے - تحفظ راز کی غرض سے سلیم دلارام کی خاموشی کو خریدنا چاہتا ہے لیکن وہ قیمت میں خود سلیم کو مانگتی ہے مگر سلیم کے دلِ پُر آرزو میں انار کلی کے سوا کسی اور کی گنجایش کہاں - ناکامی کے صدمے اور رقابت کے جوش سے دلارام کے دل میں آتش انتقام بھڑک اٹھتی ہے لیکن اپنی فطری عیاری سے وہ اپنا منصوبہ سلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیتی بلکہ بظاہر اس

کي همدرد بن جاتي ھے اور ایک دن موقعه پاکر اکبر کو شیش محل میں سلیم اور انار کلي کو باهم اشارے کنائے کرتے ہوئے دکھا دیتي ھے - سلیم کي اس لغزش مستانه اور انار کلي کي جرأت رندانه سے مزاج شاهی برهم هو جاتا ھے اور انار کلي کو پا بزنجیر کرنے کا حکم صادر هوتا ھے - سلیم انار کلي کو بچانا چاهتا ھے لیکن ناکام رهتا ھے اور انار کلی بحکم شاهی دیوار میں زنده چن دی جاتی ھے -

بقول مولانا شبلی نعماني یه عجیب بات ھے که جو چیزیں جتنی زیاده شهرت حاصل کر لیتی هیں أسی قدر أن کي تاریخي اصلیت پردۀ خفا میں مستور هو جاتی ھے - انار کلی کا واقعه هوا هو یا نه هوا هو لیکن اتنا ضرور ھے جیسا که خود جناب مصنف نے دیباچے میں لکھا ھے که تاریخي حیثیت سے أس کا پتا نہیں چلتا - بهر حال لاهور میں انار کلی کی قبر موجود ھے -

ڈرامے عام طور پر تاریخی ' اخلاقی ' معاشرتي ' یا أدبي مقصد سے لکھے جاتے هیں - انار کلي لکھتے وقت بظاهر لایق مصنف نے ان میں سے کوئي مقصد پیش نظر نہیں رکھا - اس کا موضوع وهي حسن و عشق کا مبحث ھے جس پر ادبیات مشرق میں سیکڑوں انداز سے خامه فرسائي کي جا چکي ھے - فاضل مصنف کے قول کے مطابق

'' بچپن سے انار کلی کی فرضی کہانی سنتے رهنے سے حسن و عشق اور ناکامی و نا مرادي کا جو ڈرامۂ میرے تخیل نے مغلیه حرم کی شوکت و تجمل میں دیکھا اس کا اظهار ھے ''

جس میں اُن کی رنگینی تخیل اور قوت تحریر نے کافی دلاویزی پیدا کردی ہے - ایک مصنف نے حرم سرائے شاہی کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ یقیناً قابل تعریف ہے - تھوڑی دیر کے لئے پڑھنے والا ڈراما کے ماحول میں گُم سا ہو جاتا ہے -

ایک اچھے شاعر کی طرح ڈرامہ نگار کو بھی اصلیت کا خیال رکھنا ضروری ہے ورنہ ڈراما اپنے درجہ سے گر جائے گا - اصلیت کے دو پہلو ہوتے ہیں - ایک یہ کہ مکالمے کی زبان افراد ڈراما اور موقع و محل کے لحاظ سے مناسب ہو - دوسرے یہ کہ جن لوگوں کا کردار ڈراما میں پیش کیا جائے وہ ایسا ہونا چاہیے جیسا کہ روزمرہ کی دنیا میں پایا جاتا ہے یا جیسا کہ واقعی ہو سکتا ہے ڈراما کے افراد فرضی تصویریں نہ ہوں بلکہ ہماری طرح جیتے جاگتے گوشت پوست کے انسان ہوں جن کے جذبات و احساسات اقوال و افعال میں ہمیں خود اپنے جذبات و احساسات اور اقوال و افعال کی جھلک نظر آئے - جن سے ہمیں ہمدردی پیدا ہو - جن کی خوشی سے ہم خوش ہوں اور جن کی تکلیف سے ہم کو رنج پہونچے - ڈراما کی بقا کا سارا راز صورت نگاری میں مضمر ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں بہت کم ڈراماٹسٹ کامیاب ہوتے ہیں -

انارکلی میں زنانہ کردار کی تصویر نہایت کامیابی سے کھینچی گئی ہے - بالخصوص دلارام کے کردار پر صاحب ڈراما کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے - دلارام کی صورت میں ہم کو ہر وہ چیز ملتی ہے جس کی توقع کی جا سکتی ہے - وہ " تریا چرتر "

کي مجسم تصویر ہے - خود بھلي ' خود غرضی ' عیاري '
اور انتقام ان چار عناصر سے مل کر اُس کي سیرت کي تکمیل
ہوئی ہے - خود داري اس میں خود بھلی کي حد تک ہے - بہن
کی بیماری میں وہ چند دن کی چھٹي لیکر عیادت کو جاتي ہے -
اُس کے پیچھے محل کا نقشہ ھي بدل جاتا ہے - نادرہ ' انارکلی '
ھو جاتی ہے - یہ بات دلارام کو کیونکر گوارا ھو سکتی تھي -
ارے اگر معلوم ھوتا تو بھملو بہن پڑی پڑي ایڑیاں رگڑ رگڑ
کر دم توڑ دیتي تو بھی وہ پاس نہ پھٹکتی وہ " اس کل
کی چھوکری " سے دب کر نہیں رہ سکتي - عنبر ایک دوسری
کنیز اس سے پوچھتي ہے کہ " پھر آخر کیا کروگی ? " تو وہ
کہتي ہے " ناگن کی دم پر کوئی پاؤں رکھ دے تو وہ کیا کیا کرتی ہے - "
ایک فقرہ میں دلارام کی پوري سیرت کا خلاصہ مضمر ہے - وہ
ناگن ہے ناگن !! جب تک ' انار کلی ' کو ڈس نہیں لیتی اوسے
چین نہیں آتا ۔ اس کي ساري قوتیں اپنے حریف کو شکست
دینے میں صرف ھو جاتي ھیں - کوئی لمحہ ایسا نہیں ھوتا
جب وہ اِس فکر سے غافل ھو ' ایک دفعہ وہ گوشۂ چمن میں
سلیم اور انار کلي کو ایک جا دیکھ لیتی ہے - انار کلی کو
شبہ ھوتا ہے اور وہ سراسیمہ ھوکر سلیم کو وھاں سے بھگا دیتي
ہے - اس کے بعد دلارام بڑے اطمینان سے داخل ھوتی ہے اور
پوچھتی ہے - " ابھي یہاں کون باتیں کر رھا تھا ? میں باتوں
ھي کی آواز سنکر اِدھر آئي تھي " - انار کلی کے انکار پر وہ
کہتی ہے " میں جانتي ھوں انار کلی یہاں کون موجود تھا "
انار کلي سہم کر پوچھتي ہے " کون " ? دلارام کہتی ہے

" اوہ تم مت ڈرو - میں اس قدر بیوقوف نہیں کہ
اس کا نام لے دوں - ابھی اس کا وقت نہیں لیکن
یاد رکھو انار کلی میں جانتی ہوں اس راز کی
قیمت بھی جانتی ہوں - وہ بازار بھی جانتی ہوں
جہاں یہ فروخت ہو سکتا ہے - ہاں میں اس کی
قیمت بھی مقرر کر چکی ہوں - پر میں تم کو
کیوں بتاؤں - میں جانتی ہوں انار کلی بیگم تم پھر
اپنے سے باتیں کرو - "

اس طنز میں کتنی تلخی ہے - زہر کی سی تلخی! ہاں وہ اس راز کی قیمت مقرر کر چکی ہے - بازار بھی جانتی ہے - سودا بھی ہوتا ہے - قیمت کی گفتگو ہوتی ہے لیکن معمّوں میں - مگر خریدار " پہیلیاں بوجھنا نہیں چاہتا " - وہ " صاف الفاظ میں قیمت معلوم کرنا چاہتا " ہے - دلارام مجبور ہوکر کہتی ہے " میں محبت کے صرف ایک لفظ کی محتاج ہوں " سلیم کو تعجب ہوتا ہے - غصہ آتا ہے - بے اختیار ہوکر اُسے جھڑک دیتا ہے - سلیم کی یہ لغزش ' دلارام کی خود بینی ' عیاری ' اور جذبۂ انتقام کو مشتعل کر دیتی ہے وہ کہتی ہے " صاحب عالم! میرا دل بے اختیار سہی مگر مجھ میں خود داری باقی ہے - "

اس کی فطرت خوابیدہ بیدار ہو جاتی ہے - عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنے جذبۂ نسوانیت کی اہانت برداشت نہیں کر سکتی - اس کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھتا ہے اور پھر عورت کا انتقام ہولناک ہوتا ہے - دلارام ایک انداز

بے نوازی کے ساتھ واپس جانا چاھتی ھے کہ سلیم کا ایک همراز دوست بختیار ' جو پردے کے پیچھے سے یہ ساری گفتگو سن رها تھا باھر نکل آتا ھے - دلارام پر بجلی سی گر جاتی ھے لیکن وہ انتہا درجے کی عیار ھے - فوراً صاحب عالم کہہ کر سلیم کے قدموں پر گر پڑتی ھے - سلیم سمجھتا ھے کہ دلارام خود اپنے جال میں گرفتار ھوگئی مگر بختیار خوب جانتا ھے - وہ سلیم کو سمجھاتا ھے -

" تم اناڑی شاطر ھو - حریف اور چال سوچ لے گا - مہلت سے فائدہ اُٹھاؤ - اور اس وقت ھنس کر بساط اُلٹ دو " -

سلیم اور دلارام کا موازنہ اس سے بہتر نہیں ھو سکتا - کاش سلیم اس مشورہ کی قدر کرتا - لیکن ھونے والی بات ھو کر رھتی ھے - ثریا کے جتا دینے کے باوجود سلیم دلارام پر اعتماد کر لیتا ھے - نتیجہ وھی ھوتا ھے جو ھونا چاھیے - دلارام حریف کی سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھاتی ھے - وہ اپنی چالوں میں دشمن ھی کو اپنا آلۂ کار بناتی ھے اور بالآخر اُن کا راز اکبر پر اس طرح ظاھر کرتی ھے کہ اکبر خود سلیم اور انار کلی کو اشارے کرتے ھوئے دیکھ لیتا ھے -

انار کلی دنیا کے فریبوں سے بے خبر ایک بھولی بھالی انجان لڑکی ھے - جوانی کی اُمنگیں اُسے سلیم پر مایل کر دیتی ھیں - لیکن اس کا عشق پروانے کا عشق ھے - وہ خود اپنی آگ میں جل بجھتی ھے اور آہ نہیں کرتی - ناظرین کو شروع ھی سے اس کے ساتھ ھمدردی پیدا ھو جاتی ھے اور جوں

جوں قصے کے واقعات سامنے آتے جاتے ہیں یہ ہمدردی بھی
بڑھتی جاتی ہے - "ثریا" کے پیکر میں مصنف نے چھوٹی
بہن کا ایک کامیاب کردار پیش کیا ہے - انار کلی کے بر عکس
وہ ایک تیز و طرار دوشیزہ ہے - بہن سے اُسے سچی الفت اور
ہمدردی ہے - اُس میں جوانی کا جوش بھی ہے اور امنگیں
بھی - اگر متانت کی کسی قدر کمی ہے تو تعجب ہی کیا -
دلارام کے راز سے واقف ہو جانے کے بعد وہ اس کو ستانے کی
کوشش کرتی ہے اور ایسے وقت میں صرف انار کلی کی متانت
ہی دلارام کے آڑے آتی ہے - ثریا معاملات کو سمجھ لیتی ہے
مگر چھوٹی بہن ہے اس کے مشورے قبول نہیں کیے جاتے -

افسوس ہے کہ مردانہ کرداروں کی مصوری میں فاضل
مصنف کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی - سلیم ڈراما کا
ہیرو ہے مگر پڑھنے والوں کو اُس سے کوئی ہمدردی پیدا نہیں
ہوتی - جس رنگ میں اس کو پیش کیا گیا ہے وہ اس کی
وقعت بڑھانے کے بجائے کم کر دیتا ہے - سلیم بساط عشق پر
ایک اناڑی کھلاڑی ہے جسے دلارام اور داروغۂ زنداں دونوں آسانی
سے مات دے دیتے ہیں - دلارام کی چال میں آجانے کو تو خیر
معاف کیا جا سکتا ہے لیکن داروغۂ زنداں سے دھوکا
کھا جانے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی - سلیم اپنی محبوبہ
کو زنداں سے بزور شمشیر رہا کرنے جاتا ہے اور اتنی آسانی سے خود
داروغۂ زنداں کے جال میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ سمجھ میں نہیں
آتا اسے کیا کہا جائے - سلیم کا عشق آندھی بن کر اُٹھتا ہے
بجلی بن کر چمکتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے اور سارے ماحول

کو تاریک چھوڑا جاتا ہے دلا رام کے سلیم اور انار کلی کو ایک جگہہ دیکھہ لینے پر ثریا اور انار کلی سلیم کو آئندہ خطروں سے آگاہ کرکے اعانت کی درخواست کرتی ہیں تو سلیم جوش میں آ کر کہتا ہے -

'' نہیں - انار کلی سلیم کے پہلو سے نوچی نہیں جاسکتی - نا ممکن ہے نا ممکن - انار کلی ! نہ کہو - یوں نہ کہو - میری زندگی کی اکیلی خوشی اتنی ناچیز نہیں - تم نہیں جانتیں تم میرے لئے کیا ہو - سلیم تمہارے بغیر نہیں جی سکتا - نہیں جی سکتا انار کلی ! اگر تم پر آنچ آئی اُس پر قیامت آئیگی - تم نہ رہیں وہ نہ رہیگا - میں چھوڑ سکتا ہوں اِن محلوں کو - اِس سلطنت کو - سب کو - تیرے ساتھہ میں دنیا کے تنگ ترین گوشہ پر قانع ہو سکتا ہوں - غربت میں مصیبت میں - ہر طرح - اگر سلیم مغلیہ ہند کا بادشاہ بنا تو تو اِس کی ملکہ ہو گی - اگر تو نہیں وہ بھی نہیں - میری انار کلی ! میری اپنی انار کلی ! ! '' -

یہی سلیم ہے جو موقع پاکر بھی انار کلی کو رہا نہیں کر سکتا - داروغۂ زندان کے چکمے میں آکر اپنے وعدے ، اپنے فرض ، اور اپنے محبوب سب سے غافل ہو جاتا ہے اور انار کلی کی مظلوم موت کا حال سن کر بھی آنسو بہانے کے سوائے کچھہ نہیں کرتا - ڈراما میں اور وہ بھی ایسے ڈراما میں جو تاریخی نہ ہو اشخاص اور واقعات ڈراما نویس کے تخیل کے رہین منت

ہوتے ہیں - شاید بہتر ہوتا اگر تاج صاحب سلیم کو ذرا زیادہ بلند حیثیت سے پیش کرتے -

اکبر کے کردار پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ در اصل نفس قصہ پر ہیں - لایق مصنف بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے ایسا افسانہ کیوں منتخب کیا جس سے در جلیل‌القدر مسلمان بادشاہوں کی سیرت پر حرف آتا ہے - یہ مانا کہ اکبر ملک گیری اور حکمرانی کے خواب دیکھا کرتا تھا اور اس کے پیش نظر عظیم‌الشان سیاسی مقاصد تھے - یہ بھی سہی کہ سلیم کی حالت اس کی اُمیدوں کے لئے حوصلہ شکن نہ ہو سکتی تھی - لیکن دل نہیں مانتا کہ اکبر ایسا عاقل و فرزانہ مدبر جس کا سینہ خود بھی جذبات محبت سے خالی نہ تھا کیونکر ایک ذرا سی لغزش پر ایسے وحشیانہ طرز عمل کا مرتکب ہو سکتا تھا - اکبر ایک عظیم‌المرتبت شہنشاہ ہونے کے باوجود ایک شفیق باپ ' محبت کرنے والا شوہر اور سب سے زیادہ وہ ایک شریف انسان تھا -

ڈراما کی زبان صاف ' شستہ ' شیریں اور شگفتہ ہے - جہاں جوش اور زور کی ضرورت ہے وہاں جوش اور زور بھی پایا جاتا ہے - مجموعی طور پر ڈراما اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا - سلاست زبان میں لایق مصنف نے یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ اکثر عامیانہ الفاظ بھی استعمال کر گئے ہیں - مثلاً نشاء خاطر (بمعنی جمعیت خاطر) یا " انار کلی کے بنا حسن سونا رہ جائیگا " (تعجب ہے یہ فقرہ سلیم کی والدہ کی زبان سے ادا کرایا گیا)

ھے) یا " تم بوجھ سکتی ھو میں کس معاملے کے متعلق گفتگو کرونگا - (سلیم کی زبان سے) ایک اور امر جو اِس سلسلے میں قابل ذکر معلوم ھوتا ھے وہ یہ ھے کہ مکالمے اور طرز ادا میں اکثر انگریزی انداز کی جھلک پائی جاتی ھے - بات بات میں شخص مخاطب کا نام لینا انگریزی تہذیب سہی لیکن یقیناً شُغلیہ تہذیب نہ تھی ایک جگہ دلا رام کہتی ھے " آج تقدیر نے مجھ کو موقع دیا تمہارے راستے میں ڈالا " - ایک دوسرے موقعہ پر اکبر کی زبان سے یہ فقرہ ادا کرایا گیا ھے " کوئی رقص لاؤ - کوئی موسیقی - نرم نازک خوش آئیند " میرا خیال ھے کہ دھلی کے ارباب زبان کو بلکہ یوں کہیے کہ اُن بزرگوں کو جو انگریزی سے ناواقف ھیں اس کا مفہوم سمجھنا مشکل ھوگا - اِسی طرح بعض الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے اردو صرف ونحو سے بے نیاز ھو کر زبان میں زور و ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ھے - طریق تخاطب میں یہ بات محل تامل ھے کہ اکبر کو ھر شخص " مہا بلی " کہہ کر مخاطب کرتا ھے - جہاں تک مہارانی یا ھندو اراکین دربار کا تعلق ھے یہ بات سمجھ میں آسکتی ھے لیکن مسلمان درباریوں کی زبان سے " مہابلی " زیب نہیں دیتا یہ معمولی فرو گزاشتیں ھیں جو اگر نہوتیں تو اچھا تھا -

انار کلی تخیل کی دولت سے بھی مالامال ھے - بالخصوص وہ حصہ جس میں سلیم اور انار کلی کا راز اکبر پر ظاھر کیا جاتا ھے - دلارام نے جو طریقہ اِس کے لیے تجویز کیا ھے وہ بغایت دلاویز ھے اور اس موقعہ پر حالت رقص میں انار کلی کی زبان سے جو غزل ادا کرائی جاتی ھے ع -

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستۂ

وہ اس قدر عمدہ اور بر محل ہے کہ فاضل مصنف کے حسن انتخاب کی داد بے ساختہ زبان سے نکل جاتی ہے - اِس غزل کے ذریعے سے جو کام لیا گیا ہے وہ اُن کے پرواز تخیل کا عمدہ نمونہ ہے -

ڈراما حجاب اسمعیل کے نام سے معنون کیا گیا ہے - انتساب کا انداز بڑی حد تک جدت و ندرت کا آئینہ دار ہے - کم از کم میری نظر سے اس سلسلے میں ایسا مضمون نہیں گذرا -

" ازار کلی " کے متعلق سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ تعارف کے لیے کافی ہے - اگر ناظرین اصل کتاب کو پڑھینگے تو یقیناً محظوظ ہونگے -

---

طلسم زندگی

(ملنے کا پتہ سید عبدالطیف منیجر رسالۂ ہمایوں ' نمبر ۲۳ ' لارنس روڈ ' لاہور ' قیمت ۵ روپیہ ')

یہ میاں بشیر الدین صاحب بی - اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا ایڈیٹر ہمایوں کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف نے چودہ پندرہ سال کے زمانے میں وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے تھے - مناسب ترمیم و اضافہ کے بعد اب یہ مختلف حصوں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں مثلاً مناظر ' صدائے روح ' آئینہ دل ' جد و جہد ' سر گوشیاں اور خیالات پریشاں اس طرح طلسم زندگی چھہ

ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے تحت میں مختلف عنوانوں سے تقریباً دو سو سے زائد زائد مضامین دے گئے ہیں -

میاں صاحب جس سادہ ' بیساختہ اور شگفتہ طرز نگارش کے مالک ہیں اس کا اندازہ عام ناظرین ہمایوں کو بخوبی ہوگا - طلسم زندگی میں بھی وہی لطافت و ندرت وہی بعض بعض مقامات پر بے ضرر شوخی و ظرافت جو میاں صاحب کی تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں صاف نظر آرہی ہیں - مضامین کا ہر حصہ ایک خوشنما اور رنگین سر ورق سے شروع ہوتا ہے - مضامین کی تشریح میں تقریباً ایک درجن تصویریں دی گئی ہیں جن میں سے چند رنگین بھی ہیں - لکھائی چھپائی نہایت عمدہ ' کاغذ نفیس - جلد کپڑے کی جس پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں مختصر یہ کہ طلسم زندگی ہر حیثیت سے ایک نہایت پاکیزہ اور خوبصورت چیز ہے اور اس قابل ہے کہ میز اور الماریوں کی اس سے زینت بڑھائی جائے -

---

ورق سورغہ اور اس کی شاعری

(از جناب میر حسن مدیر مجلۂ عثمانیہ حجم ۱۸۴ صفحے ' قیمت مجلد ۱ روپیہ ۸ آنہ)

" ورق سورغہ اور اس کی شاعری " جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ورق سورغہ کے سوانح حیات اور اس کی شاعری پر ایک تبصرہ ہے - کسی شاعر کے سوانح حیات لکھنے کا عام دستور یہ ہے کہ پہلے اس کی پیدایش سے لیکر اس کی موت تک کے

واقعات لکھ دئے جاتے ھیں ۔ اس کے بعد اس کی شاعری کے نمونے اور اس کے کلام پر تبصرہ ھوتا ھے ' لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ھے کہ شاعر کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اس کے تجربات حیات نے جس جس طرح اِس کے شعری رجحانات کی تعمیر و تشکیل کی ھے ' ان کو واضح کیا گیا ھے ' سوانح نگاری کا یہ طرز عام روش سے علحدہ ھے اور چونکہ فطری اصول کے مطابق ھے اس لیے بغایت پسندیدہ ھے '

اُردو ادبیات کا یہ دور جیسا کہ مصنف نے اپنے دیباچے میں کہیں ظاھر کیا ھے بہت کچھ تالیف و تراجم کا ھے ' عام طور پر اس کی ضرورت محسوس کی جا رھی ھے کہ انگریزی کے ذخیرہ ادب کو جلد سے جلد اُردو میں منتقل کر لیا جائے اردو کی بہت بڑی خدمت ھے ۔ اس اعتبار سے مصنف نے ورڈ سورتھ کے حالات زندگی کے ساتھ اس کی نظموں کو اردو زبان میں منتقل کرکے در اصل اردو کی ایک نہایت ضروری خدمت انجام دی ھے ' ھمارا اردو داں حلقہ جو اپنے شعر و ادب میں نئے نئے اسالیب اور نئے نئے آھنگ کا لطف اُٹھانا چاھتا ھے اس کے لیے ضرورت ھے کہ وہ غیر ملکی شعرا کی ذھنیت سے بھی با خبر اور ان کے تخیل سے بھی لطف اندوز ھو ' اس کے بعد وہ کہیں اس قابل ھو سکے گا کہ اپنے تخلیقی کارناموں کو جدت و ندرت کے ساتھ جدید علمی فضا میں وقیع و بلند پایہ ثابت کر سکے ۔

مصنف کا خیال یہ بھی ھے کہ اُردو شاعری میں منظریہ شاعری کا تخیل بہت کچھ ورڈ سورتھ سے ماخوذ ھے ' یہاں

تک کہ مولانا حالی اپنے اجتہادات شعری میں ورق سورفۃ فی کے آرا و خیالات کے رہین منت ہیں - اس رائے میں بہت کچھ گفتگو کی گنجایش ہے اس لیے مناسب یہ تھا کہ اس قیاس کو ہلکے اور مشتبہ الفاظ میں ظاہر کیا جاتا - جدید تہذیب و تمدن کے علم برداروں کی طرح ہمارے مُصنّفین ادب کے بارے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے اجتہادات تمام تر اجتہادات ہیں اور ان کے آرا مغرب سے مستعار نہیں - لیکن فرق صرف آزادانہ اعتراف اور فلامانہ تقلید کا ہے جس کا فیصلہ ابھی کچھ قبل از وقت سا ہے - اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس بحث کو طول نہ دیں - اصل کتاب کے بارے میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ حیثیت مجموعی ہمارے جدید مطبوعات میں یہ ایک مفید و دلچسپ اضافہ ہے '

حدیث ادب

(از احسان بن دانش - ذلیشان بک ڈپو مزنگ لاہور)

جناب احسان بن دانش کی نظمیں اور غزلیں اکثر ملک کے ادبی رسائل میں نکلتی رہتی ہیں ' حدیث ادب اُن کی غزلوں کا ایک مجموعہ ہے جو ۱۵۲ صفحہ پر ختم ہوتا ہے اس کے بعد مختلف عنوانوں کے تحت میں کچھ اشعار ہیں اس طرح کل کتاب ۱۶۰ صفحوں پر ختم ہوتی ہے - اُس مجموعہ کے ساتھ مصنف کی تصویر بھی ہے - قیمت ایک روپیہ چارآنہ -

---

مونا و انا

(از جلیل احمد قدوائی ایم اے ' ملنے کا پتہ کتابستان الہ آباد قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ)

یہ مشہور مصنف مارس میٹر لنک کے ڈرامے کا ترجمہ ہے ' ترجمہ بے تکلف اور رواں ' زبان صاف و سادہ ' طرز بیان کافی پر لطف و دلکش ہے البتہ ہمیں بعض مقام پر مترجم کے اس انداز بیان سے اختلاف ہے ' مثلاً گیڈو قلعۂ پیسا کا امیر لشکر صفحہ ۱۰ پر کہتا ہے " اللہ ہی رحم کرے " - یہاں بجائے اللہ کے خدا کا لفظ بہتر تھا ' اس لیے کہ لفظ اللہ مخصوص مسلمانوں میں مستعمل ہے اسی طرح گیڈو صفحہ ۲۰ پر " اپنے ابا " اور " میرے ابا " کہتا ہے ' لفظ ابا کی بھی تقریباً وہی صورت ہے ' یہاں والد کا لفظ زیادہ مناسب تھا صفحہ ۵ پر مارکو ' گیڈو کا باپ " الحمد للہ " کہتا ہے ' حالانکہ یہاں " خدا کا شکر ہے " کہنا چاہئے تھا اس لیے کہ الحمدللہ بھی مخصوص اسلامی طرز بیان ہے - صفحہ ۳۶ اور ۴۴ پر " کمشنران جمہوریت " اور " کمشنران فلارنس " کی ترکیب بھی بہت کچھ بحث طلب ہے ' بعض جگہ پروف یا کتابت کی بھی غلطیاں ہیں مثلاً صفحہ ۱۲ سطر ۲ میں بجائے " تنخواہ " کے غالباً " نگاہ " ہونا چاہیے -

مترجم نے ڈرامے کے آخر میں قصہ طلب ناموں کی ایک مختصر فرہنگ بھی دے دی ہے جو عام طلبہ و ناظرین کے لیے مفید ہے بہ حیثیت مجموعی ترجمہ خاصا کامیاب اور پڑھنے کے قابل ہے -

---

مغل اور اردو

(ملنے کا پتہ عثمانی اینڈ سنس چونہ گلی ' کلکتہ)

نواب نصیر حسین خیال داستان اردو کے نام سے اردو زبان کی ایک مبسوط و مفصل تاریخ لکھ رہے ھیں ' یہ کتاب اس کا ایک باب ھے ' چنانچہ جیسا کہ نام سے ظاھر ھے اس میں ابتدائی عہد مغلیہ سے لیکر انحطاط و زوال سلطنت تک زبان اردو کے تدریجی رواج اور ترقی کی داستان نہایت دلچسپ انداز سے سنا دی گئی ھے - پیرایہ بیان حد درجہ لطف و دلکش ھے - قیمت دو روپیہ -

---

تخت طاؤس

(از مولوی عبداللطیف خاں کشتہ قادری - ملنے کا پتہ رائیصاحب گلاب سنگھہ اینڈ سنس لاھور)

اس کتاب میں لائق مرتب نے شاھجہاں کے مشہور و معروف " تخت طاؤس " کے تاریخی حالات کی کمال جانفشانی و دیدہ ریزی سے تحقیق و تفتیش کی ھے - کل کتاب ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ھے ' شروع کے ۳۸ صفحوں پر مرتب کے کسی دوست نے " تبصرہ و تعارف " کے عنوان سے مرتب کے حالات اور اُن کی شہرت و کردار پر بڑی تفصیل سے بحث کی ھے ' اس کے بعد کتاب پر ایک مجمل تبصرہ ھے - اس قسم کی کتابوں اور کارناموں پر تعارف کا یہ انداز مناسب نہیں معلوم

ہوتا - اس کے بعد خود جناب کشتہ - کا ایک مقدمہ ہے جو ۱۹ صفحوں پر جاکر ختم ہوا ہے - اس کے بعد کتب حوالہ کی ایک فہرست ہے' پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے اس میں شاہجہاں کے مختصر حالات کے بعد تخت طاؤس کے متعلق تاریخی انکشافات ہیں - لایق مرتب کے پیش نظر غالباً عام طلبہ کی جماعت بھی ہے اس لئے کہ ذیلی حواشی میں ضرورت سے زیادہ شرح و بسط سے کام لیا گیا ہے - کتاب کا قابل اعتراض پہلو (اگر وہ قابل اعتراض سمجھا جائے) تو وہ تفصیلات کی بہتات اور معلومات کی کثرت ہے - بعض حوالہ جات میں غیر ضروری طوالت بھی ہے' تا ہم بہ حیثیت مجموعی کتاب بڑی کاوش سے لکھی گئی ہے - قیمت ایک روپیہ چار آنہ -

---

قسمت اور دوسرے افسانے

(از پروفیسر سید عابد علی صاحب ایم - اے - ملنے کا پتہ راے صاحب منشی گلاب سنگھہ اینڈ سنس لاہور)

پروفیسر سید عابد علی صاحب ایم - اے پنجاب کے مشہور شاعر اور اہل قلم ہیں' یہ کتاب اُن کے بعض افسانوں اور ڈراموں کا مجموعہ ہے - اسکولی خط اور اسکولی سائز سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے' افسانے مختصر مگر دلچسپ ہیں طرز بیان دلکش' جا بجا ادبی چاشنی کے ساتھہ پر لطف ظرافت بھی ہے - قیمت ۹ آنہ -

---

کارواں

(مرتبۂ پروفیسر تاثیر ایم - اے ' ملنے کا پتہ منیجر رسالۂ کارواں - چابک سواراں لاھور - قیمت دو روپیے آٹھ آنے)

پنجاب کی موجودہ فضاے ادب جن روشن اور تابناک ستاروں سے مزین نظر آتی ھے اُن میں پروفیسر تاثیر ایم ' اے کی ذات بہت ھی خصوصیت کے ساتھ نمایاں ھے - ادب اور آرٹ کی جدید تحریکات میں بلند مشرقی احساسات کو ملحوظ رکھ کر اردو کے ذخیرۂ ادب کو ترقی دینے میں وہ ایک مدت سے قابل قدر خدمات انجام دے رھے ھیں ' چنانچہ رسالۂ کارواں بھی انھیں اغراض و مقاصد کے تحت میں نکالا گیا ھے - اس کی اھم خصوصیات یہ ھیں -

(۱) رسالہ بجائے ماھانہ یا سہ ماھی ھونے کے سالانہ ھوگا جو اردو کی صحافتی دنیا میں شاید پہلی مثال ھے -

(۲) اس کے مضامین عامیت اور رطب و یابس سے پاک ھونگے -

(۳) اس میں تصاویر کا نہایت خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا جائیگا -

ظاھر ھے کہ مذکورہ اغراض سہ گانہ کے ماتحت جو علمی رسالہ پروفیسر تاثیر کی ادارت میں نکلے گا وہ کس درجہ " خاصے " کی چیز ھوگا ' چنانچہ پیش نظر نمبر میں ایک بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ ان امور کی پابندی کی گئی ھے - ابتداے کار کی دشواریوں کے باوجود رسالہ ۳۱۳ صفحات کی ضخامت کا نکالا گیا ھے ' یہ ظاھر ھے کہ یکایک اتنے حجیم و ضخیم رسالہ

میں کل مضامین بلند پایہ نہیں ہو سکتے ' چنانچہ " ارتھی " کے عنوان سے جو مضمون اس میں شایع ہوگیا ہے وہ اس کے معیار سے گرا ہوا ہے البتہ مزاحیہ میں خود جناب تاثیر کا مضمون " لکچرار بیوی " بہت ہی خوب ہے اسی طرح چودھری محمد حسین صاحب کا " جاوید نامہ " پر ریویو اور پروفیسر شیرانی کا باغ و بہار پر مضمون ' علامۂ اقبال کی غزل ' حفیظ کی نظم تین نغمے اور " دعاے صحرا " وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کا شمار " شاہکار " اور فتوحات ادب میں ہونا چاہئے -

ڈرنک واٹر کے ڈرامہ ء سفر کے لئے آٹھویں صدی کی فضا کچھ ناموزوں سی معلوم ہوتی ہے ' اس میں امن و صلح کی خواہش ' جنگ سے نفرت ' زندگی سے لطف اٹھانے کی خواہش ' بادشاہت کی برائیوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے جس سے زمانۂ حاضر کے رجحان کی تصویر سامنے آجاتی ہے - یہ چیزیں قدیم ہندوستانی فضا میں بالکل ہی بے گانہ و بے محل معلوم ہوتی ہیں -

علامہ اقبال کی اردو غزل ایک عجیب و غریب چیز ہے ' اور شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو کہ علامہ کی یہ غزل اردو میں بالکل ہی منفرد ہے اور " بانگ درا " کی کوئی غزل اس سے لگا نہیں کھاتی - علامہ کی فارسی غزلوں میں جو فلسفیانہ بلندی اور جو لطیف شاعرانہ اشارات پائے جاتے ہیں وہ سب اس اردو کی غزل میں منعکس نظر آتے ہیں - شاید اتنی مدت تک اردو سے دور دور رہنے کا یہ نتیجہ ہے -

مدتے باید کہ تا خوں شہر شد

یہ صحیح ھے کہ اُردو ایک مدت سے علامہ کے رشحات کرم سے محروم ھے ' مگر ھم اسے صرف اُردو کی محرومی و بدتوفیقی کہہ سکتے ھیں ' ھم علامہ ایسے بلند پایہ شاعر کو اپنی اور اپنی زبان کی مصلحتوں کا پابند نہیں بنا سکتے - بہر حال پروفیسر تاثیر نے جو کچھ "سخنہاے گفتنی" میں علامہ کا دلچسپ مکالمہ درج کیا ھے ' اس سے ھمیں پوری توقع ھوتی ھے ' کہ انشا اللہ اُردو کی جانب علامہ کی نظر التفات ھو کر رھے گی ' ممکن ھے اس حسن ظن میں حسن طلب کار فرما ھو ' تصاویر کے بارے میں لایق مرتب نے جس خصوصیات کا لحاظ رکھا ھے وہ یہ ہے کہ عام رسائل کی طرح صرف تصاویر دے دینے پر اکتفا نہیں کی ھے بلکہ اعلی قسم کی تصویروں کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی کوشش کی ھے کہ فنی حیثیت سے معلومات بھی پیش کی جائیں تاکہ لوگ صحیح طور پر تصویروں سے لطف اندوز ھونے کے قابل بھی بن سکیں - چنانچہ مضمون "مصوری اور اس پر تنقید" گو مختصر ھے - مگر بڑی حد تک اس ضرورت کو پورا کرتا ھے ' ھمیں اُمید ھے کہ اس سلسلے کو برابر قایم رکھا جائے گا ' تاکہ ناظرین فنون لطیفہ کی حقیقت و ماھیت سے بھی با خبر ھوں - آخر میں ھم جناب تاثیر کو یہ مشورہ دئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ادب لطیف کے نام سے بعض کھوٹی ھوئی طبیعتیں جو بے سر و پا معمّے سپرد قلم کر دیتی ھیں اُس سے رسالے کو محفوظ رکھنے کی انتہائی کوشش کریں گے -

مختصر یہ کہ رسالہ صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے کامیاب اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اپنا آپ جواب ھے -
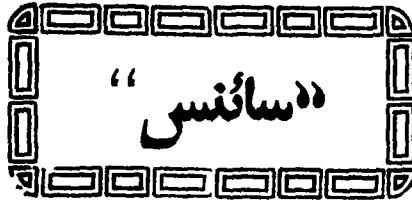
---

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۳ } بابۃ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ع { حصہ ۴

شعراے اردو کا ایک نایاب تذکرہ

از مولوی نصیرالدین ہاشمی

ایک زمانہ وہ تھا کہ قدیم شعراے اردو کے تذکرے نایاب اور کمیاب تھے مگر اب متعدد تذکرے طبع ہوچکے ہیں - ان میں میر تقی کا تذکرہ "نکات الشعرا" اور قائم کا تذکرہ "مخزن نکات" شمالي ہند کے قدیم ترین تذکرے ہیں - ہنوز متعدد تذکرے ایسے ہیں جنکے مخطوطات تو موجود ہیں مگر وہ اب تک طبع نہیں ہوئے مثلاً تذکرۂ فتح علي گردیزي ' علي ابراہیم خاں کا تذکرہ "گلزار ابراہیم" اور تذکرۂ مصحفي وغیرہ[1] - اِن سے قطع نظر دکن کے مرتبہ تذکرے بھی نایاب تھے جن میں سے لچھمي نارائن شفیق کا تذکرہ "چمنستان شعرا" اور خواجہ خاں حمید کا تذکرہ "گلشن گفتار" شائع ہوا ہے -

---

۱ - اِن تینوں تذکروں کے مخطوطات انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں [انجمن ترقي اردو انھیں عنقریب شایع کرنے والي ہے - ادارۂ -]

شمالی ہند کے تذکروں میں دکھنی شعرا کا حال بہت کم پایا جاتا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دکھنی شعرا کے متعلق اُن کو پوری طرح معلومات حاصل نہیں ہوئے تھے - جو معلومات تھے وہ زیادہ تر سید عبدالولی عزلت کے سفر دھلی کے بعد اُن سے اخذ کیے گئے تھے - اس کے برخلاف دکھنی تذکروں میں شمالی ہند کے شعرا کا حال تفصیل سے نظر آئے ؟ - اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے معلومات کا ذریعہ وسیع تھا -

دکن اور شمالی ہند کے تذکروں میں چند امور مشترک نظر آتے ہیں جو ان ابتدائی تذکروں میں عموماً پائے جاتے ہیں مثلاً

(الف) چونکہ شعرائے اردو کی تذکرہ نویسی بھی فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی تھی اس لیے اُن کی ترتیب بھی فارسی تذکروں کے مماثل ہوتی تھی اور یہ اثر اس قدر غالب تھا کہ اردو شعر کہنے والوں کے تذکرے ہونے کے باوجود فارسی میں لکھے جاتے تھے -

(ب) یہ قدیم تذکرے عموماً شاعر کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار لکھے جاتے تھے - قائم نے البتہ دور قائم کیے ہیں ، جس کی پیروی مولانا محمد حسین آزاد نے کی ہے -

(ج) شاعر کے حالات کی تفصیل نہیں ہوتی اور نہ اُس کی پیدایش اور مرنے کا سنہ ظاہر کیا

جاتا ہے - اکثروں کے ساتھ اُن کے وطن کی بھی
صراحت نہیں ہوتی -

(د) مصنف کو جن شاعروں سے کوئی خصوصیت ہوتی
ہے اُن کے کلام کی مبالغہ آمیز تعریف کی
جاتی ہے -

اب تک دکن کے جن غیرمطبوعہ قدیم تذکروں کا پتا چلا ہے
وہ دو ہیں :

(۱) ریاض حسنی مصنفہ عنایت‌اللہ فتوت جو ۱۱۶۸ ہجری
میں مرتب ہوا -

(۲) تذکرۂ موسوی خاں جو ۱۱۹۳ ہجری میں مرتب ہوا -

اِس مضمون میں فتوت کے تذکرے " ریاض حسنی " کا
تعارف مقصود ہے - اس کا ایک مخطوطہ دفتر دیوانی و مال
سرکار آصفیہ[۱] کے کتب خانے میں موجود ہے - اس تذکرے کے
(۲۲۰) صفحے ہیں ' — بارہ سطری مسطر ہے - کاتب خود
محمد اکرم ہیں ' جن کی فرمائش پر مصنف نے اس تذکرے
کو قلمبند کیا ہے - اس کی تصنیف ۱۱۶۸ ہجری میں ہوئی ہے
تاریخ تصنیف کا قطعہ مصنف کا لکھا ہوا حسب ذیل ہے :—

تاریخ بنائے این " ریاض حسنی "
جستیم ز فیض خاص آل مدنی

---

۱ - یہ دفتر سرکار نظام حیدرآباد کا ہسٹاریکل رکارڈ آفس ہے - اس کے کتب‌خانے میں
بعض نایاب قلمی نسخے محفوظ ہیں ' جن کی فہرست عنقریب شایع ہوگی -

از روے سرور بذل ہاتف بر گفت
گلدستۂ ریحان بہار معنی[1]

مصنف نے ۲۹ صفحے کا دیباچہ لکھا ہے جس میں طویل حمد و نعت کے بعد اپنا حال بیان کیا ہے - جن شعرا کا ذکر کتاب میں آیا ہے اُن کی ردیف‌وار فہرست کتاب کے آخر میں درج ہے - اِن شاعروں کی تعداد ایکسواسی ہے جس میں ۷۰ دکھنی شعرا ہیں باقی شمالی ہند ، گجرات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں -

دیباچے کا جستہ جستہ انتخاب پیش کیا جاتا ہے :—

" احقرالعباد فی خلقت انس و جان خواجہ عنایت‌اللہ خاں عرف خواجم المتخلص فتوت بن خواجہ عبدالرحمن خان بہادر اعتقادالدولہ لشکر جنگ اگرچہ تفاخر ابویت بدرجہ بلوت از جملۂ فرائض ، لاکن شامۂ عنبرآگین ذات مبارک ایشان دماغ عالم و عالمیان معطر و معنبر ساختہ آں مجمع‌الکمالات چوں جداً بعد جد در اولاد صدیق اکبر است لہذا گوے راست‌بازی و یکسوئی از احباے ہمکنان عصر خود بردہ و اعیان دہر دست

---

۱ - اگرچہ اصل نسخے میں چوتھے مصرعے کے نیچے " ۱۱۷۵ھ " درج ہے مگر اِس مصرعے سے صرف ۱۱۶۲ نکلتے ہیں اور تیسرے مصرعے سے بذل کی ب کا تعمیہ کرکے سال تاریخ ۱۱۶۸ ٹھہرتا ہے - چونکہ کتاب کے دیباچے سے واضح ہے کہ یہ کتاب نواب صلابت جنگ کے عہد میں تصنیف ہوئی اور نواب ممدوح کا زمانہ ۱۱۷۵ھ نہیں بلکہ اُس کے ماقبل کا ہے اِس لیے بھی ۱۱۶۸ھ زیادہ قرین صحت ہے — " گلشن گفتار " ۱۱۶۵ھ میں اور " چمنستان شعرا " ۱۱۷۵ھ میں تالیف ہوا -

اجابت بود شجاعت مبارکش میسپارند .... از عهد حضرت مغفرت منزل بندگان آصف‌جاه سلیمان‌پایگاه نوراللہ مرقدہ تاحالت تحریر این مقالات کہ بندگان آصف‌الدولہ[1] خلف‌الصدق آن مرحوم مغفور است در متهدت و بندگی بہ‌توسیع اوقات بسر می‌برند - برخی از احوال حضرت جنت‌منزلت مرقومہ برقم قلم می پردازد - باوصف کثرت امورات ملکي کہ پی چتر سلطانی بود در قلمرو دکن بدادگري و عدل‌گستري مشہور آفاق - فکر شعر در مزاج دریامواج نیز جوش داشت .... آنچہ بزبان ہندی بود در تذکرۂ کہ بہ تہجی حروف تخلص شاعران صورت تردیف پذیرفتہ مردف گردانید و موسوم بہ ریاض حسنی ساختہ از نظر ترجماۃ[2] والا نظران امید اصلاح دارد و باللہ التوفیق"

فتوت کے جو کچھ حالات دیباچے وغیرہ سے معلوم ہوتے ہیں یہ ہیں کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق کي اولاد سے تھے اور اُن کا سلسلۂ مادری حضرت سیدنا عبدالقادر جیلاني سے ملتا ہے - اُن کے اجداد بدخشاں کے رہنے والے تھے - ہندوستان آنے کے بعد اولکہ کے قریب (جو آج کل "چاندا" سے موسوم ہے) ایک موضع میں اقامت کي - یہاں اُن کے بزرگ کسي درگاہ کے

---

۱ - نواب آصف‌الدولہ صلابت جنگ حضرت آصف جاہ اول کے تیسرے فرزند ہیں - ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ع) میں تولد ہوئے اور ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ م) میں ہدایت محي‌الدین خاں مظفر جنگ کے مارے جانے پر مسند دکن پر رونق افروز ہوئے - ۱۱۷۳ھ میں سلطنت سے کنارہ کشي اختیار کي' ۱۱۷۷ھ میں فوت ہوئے -

۲ - [غالباً "مترجمان" ہو گا - ادارہ -]

سجادہ نشین تھے - فتوت کے دادا خواجہ آفتاب '' خجستہ بنیاد ''
(یعنی اورنگ‌آباد) آئے جہاں اِن کے بعض دوسرے رشتہ‌دار بھی
مقیم تھے - فتوت کے باپ خواجہ عبدالرحمان سرکار آصفیہ کے ملک
ملازمت میں داخل ہوکر اعلیٰ مراتب اور خطاب ' اعتقادالدولہ
لشکر جنگ ' سے سرفراز ہوئے - جاگیر اور منصب سے ممتاز کیے
گئے - جوانی میں اِن کو موسیقی سے خاص دلچسپی تھی - ہر
دوشنبے کو موسیقی کا جلسہ کرتے جس میں ماہران فن جمع
ہوتے اور اپنے اپنے کمالات دکھاتے - کبھی کبھی فارسی شعر بھی
کہا کرتے تھے - شجاع ' دلاور ' صاحب مروت و سخاوت تھے -
۱۱۶۰ ھ میں اِن کا انتقال ہوا -

فتوت کی پیدایش اورنگ آباد میں ہوئی - سنہ پیدایش سے ہم
واقف نہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے انتقال کے وقت اِن
کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی - حضرت محمد حسینی سے (جو
خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اولاد سے تھے) علوم ظاہری
و باطنی کا اکتساب کیا - کم عمری سے شاعری کا شوق تھا -
مشاعروں میں شریک ہوتے فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے
تھے - اُس زمانے میں اورنگ آباد میں شعر و شاعری کا بڑا
چرچا تھا مشہور مشہور شعرا اورنگ آباد میں جمع تھے - بزم
شعرا کے صدر سید سراج‌الدین حسینی '' سراج '' جیسے استادفن
تھے - فتوت بھی اِن کے شاگردوں اور ارادتمندوں میں تھے - اِن
کے فرزند درویش محمد سے فتوت کو بڑا اتحاد تھا - باپ کے مرنے
پر فتوت کا تعلق دربار آصفی سے قائم ہو گیا - ۱۱۷۸ ھ میں
آبائی جاگیر اِن کو اور اِن کے بھائی خواجہ ابوالبرکات خاں کو
ملی اور دونوں خطاب خانی و بہادری سے سرفراز کیے گئے - محترم

۱۲۲۳ھ میں فتوت کا انتقال ہوا - اولاد غالباً کوئی نہ تھی -

اِس تذکرے کی وجہ تالیف کے متعلق دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے ایک دوست خواجہ محمد اکرم کو شعرا سے بڑا خلوص تھا - اُن کی دوستی کا دائرا نہ صرف اورنگ‌آباد یا دکن ہی کے شعرا تک محدود تھا بلکہ شمالی ہند کے نامور شعرا سے بھی روابط قائم تھے اور اکثروں سے نامہ و پیغام کا سلسلہ جاری تھا - اِن کے پاس شعراے متقدمین و متاخرین کے کلام کا بڑا ذخیرہ جمع تھا - اِنھیں کی فرمایش پر فتوت نے اِس کام کو شروع کیا - خواجہ محمد اکرم[1] کے ذخیرے کے علاوہ سید عبدالولی "عزلت" کے کتب خانے سے بھی استفادہ کیا اور اپنے چچیرے بھائی خواجہ موسیٰ سے (جو شعر فہمی اور سخن سنجی میں مشہور تھے) مدد لی -

اورنگ‌اباد میں فتوت کے اس تذکرے کے پہلے شعراے اردو کا ایک مختصر تذکرہ خواجہ خاں حمید نے مرتب کیا تھا - لیکن حمید کے ذکر میں فتوت نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ یا تو فتوت کو اِس تذکرے کا علم نہ تھا یا وہ اِس کو قابل ذکر نہیں سمجھتے تھے - اِسی طرح فتوت کے تذکرے

---

۱ - زیر تبصرہ تذکرے کا جو نسخہ اِس وقت پیش نظر ہے خواجہ اکرم کے هاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اِس حیثیت سے بھی قابل قدر ہے گھر مخفی نہ رہے کہ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں موجود ہیں - کسی دوسرے نسخے کے نہ ہونے سے غلطیوں کی تصحیح نہیں کی جاسکتی - اِس لیے جیسا اصل میں پایا گیا اسی طرح اُس کی نقل اِس مضمون کے اقتباسات میں بھی کردی گئی -

کا ذکر لچھمی نراین شفیق نے اپنے "چمنستان شعرا" میں نہیں کیا ہے حالانکہ "چمنستان" کی ترتیب کے وقت فتوت کے تذکرے کی تکمیل ہوکر تقریباً سات سال گزر چکے تھے۔

فتوت کے تذکرے کی ترتیب بھی انہیں خصوصیات کے ساتھ ہوئی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے؛ مگر باوجود اس کے اس تذکرے سے بعض خاص امور پر روشنی پڑتی ہے -

(الف) اس میں شمالی ہند کے ایسے متعدد شعرا کا ذکر اور کلام ہے جن کے متعلق میرتقی، قائم اور میر حسن کے تذکرے ساکت ہیں اور وہ شعرا یہ ہیں :-

(۱) آزاد، محمد فاضل دہلوی

(۲) آگاہ، محمد صالح دہلوی

(۳) آشنا، زین العابدین دہلوی

(۴) آوارہ، محمد کاظم دہلوی

(۵) الہام، فضائل بیگ دہلوی

(۶) انجام، امیر خان دہلوی

(۷) ارشد، شیخ محی الدین اُجینی

(۸) حیرت، اسمعیل خاں دہلوی

(۹) حیا، دہلوی

(۱۰) ذہین، میر محمد مستعد دہلوی

(۱۱) صانع، بلگرامی

(۱۲) طالع، میر شمس الدین دہلوی

(۱۳) صمدۃ ' سھسارام

(۱۴) ممنون ' دهلوي

(ب) شمالي هند کے بعض شعرا جن کے نام کی صراحت میر تقي نے اپنے تذکرے میں نہیں کی ہے اور صرف تخلص هي پر اکتفا کیا ہے فتوت نے اُن کے نام بھي لکھے هیں مثلاً ' بھلوا و میر شہاب‌الدین دهلوي ؛ ' بسمل ' قزل باش خاں وغیرہ -

(ج) شمالی هند کے اکثر شعراے متقدمین و متوسطین کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن کے کلام کا بہترین انتخاب موجود ہے - بعض شعرا کے ساتھ اُن کے اساتذہ کا نام بھی بتا دیا ہے مثلاً میر کے ذکر میں خان آرزو کو اُن کا استاد بتا دیا ہے اور سودا کے متعلق محمد میر میر کے شاگرد ہونے کی صراحت کي ہے -

(د) بعض دکھنی شعرا کے حالات میں کسی قدر تفصیل سے بھي کام لیا ہے جس سے بعض اہم باتیں معلوم ہوتي هیں - مثلاً نصرتی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فتح بیجاپور کے وقت زندہ تھا اور عالمگیر نے بیجاپور کے تمام شعرا کا کلام سنا اور نصرتی کے کلام کو پسند کرکے ملک‌الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا - اِس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۹۷ ھ میں نصرتی بقید حیات تھا وهاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عالمگیر کو اُردو شاعري سے خاص شغف تھا - سعدی دکھنی کے متعلق اگرچہ کوئي تفصیل نہیں ہے مگر اُس کے دکھني ہونے کی تصدیق ہوتي ہے - مصنف '' گلشن گفتار '' کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو موسیقی میں اچھي مہارت تھي - ' امامي ' برهان‌پوری کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ مہرکن تھا اور زیادہ تر مرثیے کہا کرتا تھا - غرض کہ اِس قسم کا کثیر مواد فراہم ہو سکتا ہے -

اب چند شعرا کے حالات بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں :-

(الف) شمالی ہند کے شعرا :-

آرزو

گل رنگین سخنش بمشام گلچینان معلی معطر و خوش بو، سراج‌الدین علي خاں آرزو' نوبادۂ چمن حضرت شیخ محمد غوث گوالیریست - متوطن دارالخلافت جنت بنیاد شاہ جہاں‌آباد است - نہال مضمون را بہ آب و تاب در زمین موزونیت بآئین میهن مي نشاند -

پھرکر نظر نہ آیا ہم کو سجن ہمارا
گویا کہ تھا چھلاوا وہ ملہون ہمارا
تیرے دہن کے آگے دم مارنا غلط ہے
غنچے نے گانٹھ باندھا آخر سخن ہمارا
مے خانے بیچ جاکر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے[1]

آبرو

بلند استعداد خوش گو شیخ مبارک‌الله آبرو گوالیری است - علم سخن بدارالخلافت شاہ‌جہاں‌آباد و ہمچشمان حشمت نشان سخن دانی افراشتہ کوس معانی را بآواز دل‌نواز مینوازد -

کرتے تو ہو تغافل پر حال آبرو کا
دیکھو تو تم پیارے بے اختیار رو دو

---

۱ - نمونۂ کلام اصل مخطوطہ میں بہت زیادہ آیا ہے - یہاں بخوف طوالت تخفیف کردي گئي ہے -

مجلس رنداں میں مت لیجا دل بے شوق کو
شیشۂ خالی کو کیا عزت ہے میخواراں کے بیچ
دل تو دیکھو آدم بے باک کا
عشق سے بھرتا ہے پتلا خاک کا

بیدل
از احوالش کماهی آگهی نیست ۔

مت پوچھہ دل کی باتیں وہ دل جہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بےنشاں کا حاصل جہاں ہے ہم ہیں

حاتم
محمد حاتم شاعر خوش بیان وعندلیب رنگین الحان است ۔ زادوبودش[۲] فرحت‌نژاد جہان‌آباد ۔ خدمت سخن را چنین امتیازمی دهد ۔

آب حیات جاکے کسونے پیا تو کیا
مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
ساقی شراب ناب ہے اور سب ہیں یار جمع
آنے کا کر رہے ہیں ترا انتظار جمع
کوئی ہے سرخ پوش کوئی زرد پوش ہے
آدیکھہ بزم میں کہ ہوئی ہے بہار جمع
جو بال زلف کا ترے شانے کے ہاتھ سے
ٹوٹا سو ہم کیا ہے اُسے تار تار جمع
چن چن نکالے ہے کوئی ایسا بھی دردمند
مدت سکی ہوئے ہیں پھپولوں میں خار جمع

---

۲ - [زاد بومش - ادارہ -]

آجا کہے ہے تجھ ستی حاتم یہ وقت ہے
ہوتے ہیں پھر یہ یار کہاں بار بار جمع
بزم میں کس کے نہیں فرصت مے نوشی ہے
نگہ مست تری داروے بیہوشی ہے
ساز درویشی و سامان فقیری حاتم
میری فہمید میں تنہائی وخاموشی ہے

درد

خواجہ محمد میر درد ' طوطی شکرین مقال شکرستان هندست ' حقا کہ در سخن گوئی یگانۂ آفاق - طبع[1] بلند و فکرش رساست -

انداز ووہی سمجھے مرے دل کی آہ کا
زخمی جکوئی ہوا ہو کسو کی نگاہ کا
محتسب سنگ جفا سے ترے میخانے میں
کونسا دل تھا کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا
نہ خانہ خدا ہے ' نہ ہے یہ بتوں کا گھر
رہتا ہے کون اِس دل خانہ خراب میں

سودا

معنی‌یاب پرہنما ' مرزا محمد رفیع سودا ' فخر سخن‌گویان جہان‌آباد است - بلبل طبعش از آلهۂ‌نسائی محمد میر ' میر ' گویا شدہ چنانچہ می سراید -

قاتل کے دل میں آہ نہ نکلی ہوس تمام
نرہ بھی ہم تڑپے نہ پائے کہ بس تمام

---

۱ - طبعش -

نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن
نے سیر باغ و نے گل و گلزار دیکھنا
ہندو ہیں بت‌پرست مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اوس کسی کو جو ہو آشنا پرست

صانع مسکن و مولدش از خاک بلگرام است -

کہا دیکر سگ لیلی کو رخصت استخواں اپنا
نچھوڑا ہائے کچھ مجنوں نے صحرا میں نشاں اپنا
سجن کی اُس محبت پر دیا تھا جان و دل صانع
نہ تھا معلوم ، ہو جائے گا وہ نامہرباں ، اپنا

مظہر مرزا جان جاناں مظہر - گوہر اصلش از دیار بخارا و مولد و منشایش اکبرآباد - متانت فکرش مظہر تجلیات الہٰی است و مظہر انوار فیوضیات غیر متناہی - میگویند کہ[1] بلند ہمتی بہ شعر و شاعری سر فرو نمی آرد و این فن را سرمایۂ افتخار نمی انگارد - اکثر اوقات گرامی خود را در تکرار حدیث مصروف میدارد و از سیر و تواریخ سلف بہرۂ متکاثر حاصل می‌نماید - از آنجا کہ آب و گلش تخمیر یافتۂ سخن است عنان اشہب فکر را در ساحت فصاحت این فن میگرداند - غرض امام‌الشعراے عصر خود است - منصفان سیلہ‌صاف افصح‌المتاخرین میگویند - در ثنا مدحش[2] بسر و چشم می پویند -

---

۱ - [کذا از - ۲ - و در اثنا و مدحش - ادارۂ -]

گئے آخر جلاکر گل کے هاتوں آشیاں اپنا
نہ چھوڑا هاے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

نہ جانوں صبحدم بادِ صبا کیا جا پکار آئی
کہ غنچے کا دل نازک چمن کے بیچ پھاڑ آئی

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں
بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

میر
والا فکر بے نظیر میر محمد تقی میر - زادگاهش اکبرآباد است - فکرش رنگین ایجاد مصباح طبعش بر گرفتۂ (؟) تجلی‌کدۂ ادراک سراج‌الدین علی خاں آرزو است رساطبع والافکر است -

بهلا تم نقد دل لیکر همیں دشمن کہو اب تو
کہو کچھ هم بهی کر لیں گے حساب دوستاں دردل

مملون[۱]
مملون از شعراے دارالخلافت شاہ جہان‌آباد است -

کبھی بلبل نے پنجرے میں هوا قسمت کا یوں پاتا
کہ خار .. وصل گل هو اور هم سوک کر کانٹا

---

۱ - [نظام‌الدین ' مملون ' کا زمانہ بعد کا هے - بارهویں صدی کے شاعروں میں کوئی " مملون " کا پتا تذکروں میں نہیں ملتا - ادارہ] -

(ب) دکھن کے شعرا :—

آصف عمدۂ امرائے عظیم‌الشان قدوۂ خوانین بلندمکان، رکن رکین سلطنت - عمدۂ عہد خلافت، صاحب سیف والقلم، رافع لوائے والعلم[1] وزیر صاحب تدبیر سپہ‌سالار بافرہنگ نظام‌الملک بہادر فتح جنگ استفادۂ سخن از افادتگاہ مرزا عبدالقادر بیدل جنت‌منزل است دیوانہا مدون دارد و در تمام عمر خود کہ ہمین مضمون ہندی تسخیر خاطر گردیدہ و بحسب اتفاق بلسان در بیان مرزدہ - المتخلص آصف و شاکر -

کلی نہ کہو کوئی میرے دلبر کوں حسد سے
مجھ دل کی کلی میں یہ دعاے یملی ہے

امامی مہر کند دارلسرور برہان‌پور است مرثیہ‌ها میگوید و بر سبیلِ مدح حضرت امام شہید علیہ‌السلام می‌پوید و حب آل عبا دردلہاے محبان می‌افزاید -

آب بن جب ہوئے نیلم لب یاقوت حسین
جام کوثر کا دیا حور نے اُس آن میں آ

حمید سید خواجہ خاں حمید پسر بزرگ ترک تاز خان بہادر قبی جنگ است - مشق سخن از عارف‌الدین خان عاجز نمود - مہارت علم موسیقی بقانون درچنگ است کار زندگی در عین عنفوان از دائرۂ حیات گسیختہ - مقام ریختہ گوئی را باین تو (؟) در پردۂ نازک خیالی جلوہ میداد -

---

۱ - و قلم ...... و علم (؟) -

مجھ کو دیکھا ہے نگاہوں سےھی وہ بالا بالا
جس سے پلکوں نے ہر یک موے سنبھالا بھالا

درد مند — محمد فقیہہ درد مند طوطی طبعش از آئینہ نمائی مرزا مظہر گویا گردیدہ - مولد او اودگھر از توابع محمد آباد بیدر است کہ در صغر سن ہمراہ والد خود از دکن بشاہجہاں آباد رفت و در ظل عاطفت شاہ ولی اللہ اشتہاق نہرۂ مجدد سر ہندی قدس سرھما جاگرفت بعد چندے مرزا مظہر جان جاناں بتربیت او پرداخت و بہ یمن نظر مرحمت او کمالاتے فراہم آوردہ - شعر فارسی و ریختۂ شایستہ در سلک نظم می کشید ساقی نامۂ او شہرتی دارد - مدتہیست کہ بجانب بنگالہ رفت و آنجا بجہت روزگار بسر می‌برد از خامہ او سخن چلہن می ترازد -

ہے غم سے رفیقوں کے مرا دل ناشاد
اس دھر کے جاتے ھیں سبھی عیش بہ باد
پرویز کتیں شیشہ خانہ عشرت پر (؟)
سنگ آیا ولیک سخت آیا فرھاد

سعدی — سعدی دکھنی کہ بر احوالش کماھی آگاھی دست نداد

ھمنا تمن کو دل دیا تمن لیا[1] اور دکھ دیا
تم یہ کیا ھم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے

سراج — سراج بہ انجمن محفل قدسی اساسوان بدر سفہر أسمان شب زندہ داران و خلص معلی سراجآمنیرا .....

---

۱ - [تم دل لیا - ادارۂ]-

حضرت شاہ سراج الدین حسینی سراج از سادات حسینی صحیح النسب است ۔ بجناب قدوہ سالکن حضرت شاہ عبدالرحمن قدس سرہ دست بیعت دادند و بکمال توکل واستغنا بدریافت معنی من یتوکل علي الله فہو حسبہ اوقات ملکوتي صفات خود درخجستہ بنیاد حق میگذارد و درمبادي نشو نما برنگ گل خرقہ درویش دوبرکردہ بہ تماشیر صبح شعور لسان بلبل زمزمۂ سخن سنجی پیش گرفتہ مرتبۂ سخن گوئي از شان صفات او مرتبۂ ادنیٰ است و اعجاز معجزات کلام از عیسیٰ پیام او ہویدا صاحب کمالات مصنفان ہند و دکن افضل المتاخرین میگویند و در میدان وصفش بسر و چشم می پویند ۔

دل نہیں ہے بلکہ ہے سولي کا پہول
دوسرا منصور کہلانے لگا
سراج اس ہستی موہوم کا احوال کہنے کو
عدم کے صاف تختے کشور عنقا سے آتے ہیں
ہے طریق خاکساري میں مرا دل ان دنوں
خاک بردار غبار رہگذار انتظار

ناصر — درۃ التاج اورنگ نشینان جہان مقبول حضرت شاہ شہیدان.........خلف الصدق حضرت آصف جاہ امیر والا پائگاہ برضاے حق راضي و صابر نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ناصر رئیس ملک دکن بود ۔ ذائقۂ حیاتش شربت شہادت چشید و بعنایت الہی درسلک کمترین بندہاے مظلومان دشت کربلا گردید ۔

نہیں تیرے شکار کرتے ہیں   دل ہمارا فگار کرتے ہیں
خوبرو جب سنگار کرتے ہیں   آرسي پر بہار کرتے ہیں

کس کی بیداد سوں چمن میں آج　　پھول سارے پکار کرتے ھیں
اھل دل گریۂ ندامت سیں　　سیر ابر بہار کرتے ھیں
خوش نگہ پہن بر میں سبزلباس　　سرو کو شرمسار کرتے ھیں
چشم بد دور دلبراں سارے　　اپے ناصر کو پیار کرتے ھیں

نصرتی

سخن طراز دکن است - مسکنش بیجاپور - اکثر قصہ‌ها و دیوان‌ها بزبان هندوي مرتب ساختہ و در آن تلاش‌ها بسیار کردہ داد معنی‌یابي دادہ - ولتیکہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی انارالله برهانہ ولایت دکن را در تسخیر درآورد و حکم نفاض[1] داد کہ سخن سخن‌سنجان این ملک را در نظر بگذرانند ؛ بموجب حکم گذرانیدند - کلام نصرتی را بر همہ افضل فرمودہ - بخطاب "ملک‌الشعراے هند" سرفرازي یافت - چنانچہ درمدح عاشق شہباز بلند پرواز سید محمد گیسو دراز رحمۃالله علیہ بکمال خشوع و خضوع می سراید -

کہ جب اصل سہتي سیادت کی بیل
چلی بن سوں هستي کے جب باند جیل (؟)
کمالت کا جب آکے منڈا چھڑي
لگا گل سو یوں پائے عزت بڑي
دکن کي عجب بخت‌ور خاک هے
کہ جس بیچ تجھ خوابگہ پاک هے
زباں دھوکے پھول تر سوں کل میں لاؤں (؟)
کہ سید محمد حسیني کا ناؤں

---

۱ - [نقاد - ادارہ -]

ولی

مظہر کمالات خفی وجلی محمد ولی دکھنی - زاد و بودش دکن است و دست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضا گجراتی قدس سرہ دارد - موجد ریختہ گوئی و بانی بنائے فصاحت زبان ہندوی است - درفن ریختہ گوئی امام‌الشعرا است - مدتے در بلدۂ گجرات عافیت‌صفات چہرۂ ہستی افروختہ آخرالامر از سورت جہاں بہ بنیاد گذشتہ [گذاشتہ ؟] بملک قدیم شتافت اللہ تعالیٰ مغفرت نماید - این چند اشعار از کلام معزیہام است -

نہ پوچھو عشق میں جوش وخروش دل کی ماہیت
برنگ ابر دریابار ہے رومال عاشق کا
غرور حسن نے تجھ کو کیا ہے اسقدر سرکش
کہ خاطر میں نہ لاوے توں اگر تجھ گھر ولی آوے

یکرنگ

شاہ یکرنگ - بود و باش گلشن بنیاد خجستہ بنیاد است - درسخن نرس فکرش برجستہ داشت و در بدیہہ گفتن خود را یگانۂ عصرمی انگاشت - گاہی بگفتن طبع فکرش بطرف زبان دکن مائل میشود -

نادے کجل سخن[1] یو انکھیاں اب ہری کتئیں
سادی بنسن[2] یہ بس ہیں تری دلبری کتئیں
ناپیچ دے زلف کو نہ کر ابرواں کو خم
کافی ہے یک نگہ تری افسوس گری کتئیں
ناکر لباس زر کا توں اے من‌موہن پیا
... ...

---

۱ - [سجن - ادارۃ] - ۲ - [لین - ادارۃ -]

کیمیا گری اور علم کیمیا

از رفعت حسین صدیقي - ایم - ایس سي - ایل ایل بي (علیگ)

سیم و زرکی خواهش انسان کو ازلي معلوم هوتي هے اِس لیے که بچه هوش نهیں سنبهالنے پاتا که اِس روپهلي سنهری چیز کو دیکه کر فوراً شور مچانا شروع کر دیتا هے - بچے کی حرکت کو نادانی پر اُس وقت محمول کیجیے جب کوئی شخص بهی ' جوان هو یا بوڑها ' اِس سے بچا هو - دنیا میں جسے دیکهیے اِسی کے حاصل کرنے میں کوشاں نظر آتا هے - جس قدر چهل پهل هے اِسی کی بدولت هے - بادشاهوں کے دربار ' فقیروں کي منڈلیاں ' امیروں کی محفلیں اِس کے بغیر سوني هیں - هر طبقے میں اِس کی تعظیم و تکریم هوتي هے - شاه و گدا ' مفلس و دولتمند ' راجا پرجا ' سب اِس کے برابر هی آرزو مند هیں - عشرت‌کدهٔ جهاں اِسی سے قائم هے - محفل نانے و نوش ' بزم رقص و سرود اِسی سے گرم هے - سادهؤوں کے گیروے لباس ' فقیروں کی ریش دراز ' مولویوں کے اونچے پاجاموں اور نیچي قباؤں کا راز اِسي میں مضمر هے - معاذالله ! کیسي چیز هے - کهیں چور اور راهزن بنواتي هے - کهیں جعل کا مرتکب کرواتی هے - کهیں بیگناهوں کو آفت و مصیبت میں گرفتار کراتی هے - کهیں وائرلیس آرائش محفل بنا هوا هے تو کهیں ریڈیو کی چهل پهل هے - کهیں اجرام فلکي کا مشاهده کیا جاتا هے تو کهیں

میپلوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے ۔ تمام مشاهدات خورد بینی ہوں یا طبعی، برق و رعد سے متعلق ہوں یا ابر و باراں سے، کشش جاذبہ سے واسطہ رکھتے ہوں یا طبقات بالا سے، سب کی محرک یہی شے ہے ۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اور بھی بہت سی دھاتیں تھیں مگر سب سے زیادہ حضرت انسان نے انھیں دو کی طرف توجہ کیوں مبذول کی ؟ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دھاتیں آزاد حالت میں پائی جاتی ہیں ۔ ان کو صاف کرنے میں زیادہ دردسری نہیں کرنا پڑتی اور تجربے نے بتایا کہ اِن کی چمک دمک میں موسمی تغیر و تبدل، ہوا، بارش وغیرہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا اِسی لیے بعد میں اِن کو " معادن شریفہ " کا خطاب دیا گیا ۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان اپنی بہت سی روزمرہ کی ضروریات کے لیے پتھر کے ان گھڑ آلات سے کام لیتا تھا ۔ اُس کے کاشتکاری کے اوزار بھی پتھر کے ہوتے تھے ۔ شکار اور لڑائی جھگڑوں میں بھی پتھروں کا بہت کچھ دخل تھا مگر زیب و زینت کا کام اُس زمانے میں بھی یہی دھاتیں دیتی تھیں ۔ ایک زمانہ گذرنے کے بعد ۲۱۰۰ ق ۔ م ۔ میں سونے اور چاندی میں قانونی امتیاز قرار دیا گیا اور ۷۰۰ ق ۔ م ۔ میں پہلے‌پہل ملک لیڈیا میں اِن دھاتوں سے سکہ بنایا گیا ۔

ابتدا میں سونے کو حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ بالکل ہی سادہ تھا ۔ آجکل کی سی مشینیں نہ تھیں ۔ وہ لوگ نہ پانی سے قوت حاصل کرنا جانتے تھے اور نہ بھاپ سے ۔ بجلی کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔ وہ صرف اُس ریگ کو جس میں سونے یا چاندی کے ذرے ملے ہوتے تھے جمع کر لیتے

تھے اور اُسے پانی سے دھوتے تھے - ریگ چونکہ چاندي یا سونے
کے مقابلے میں ھلکي ھوتي ھي پاني کے ساتھ بہ جاتي
تھي ارو دھات کے ذرے جو مختلف شکل کے ھوتے ھیں، باقي
رہ جاتے تھے - اِن کو وہ بھیڑوں کي کھالوں پر جمع کرلیتے
تھے - رفتہ رفتہ تہذیب و تمدن کے فروغ کے ساتھہ ساتھہ اِس
کی تخلیص کے قاعدے بھي بدلتے گئے چنانچہ پارے اور سونے
کا "ملغم" بنایا گیا اور اُس سے سونا حاصل کیا گیا مگر یہ
اُسي وقت ممکن ھوا جبکہ پارے کا علم ھوا اور اُس کے اِس
خاصّے سے واقفیت ھوئی - بعد کو سونا حاصل کرنے کے واسطے
کلورین (chlorine) گیس سے کام لیا گیا اور بالاخر وہ طریقہ
ایجاد ھوا جو سائنائڈ (cyanide) طریقے کے نام سے موسوم کیا
جاتا ھے اور جو اب بھی مروج ھے - پوتاشیم سائنائڈ کي یہ
خاصیت ھے کہ وہ سونے کر حل کو لیتا ھے اِس لیے اُس کے
آبي محلول میں سونے کو حل کیا جاتا ھے پھر اُس میں
جست کا محلول ڈالا جاتا ھے - جست حل ھوجاتا ھے اور
سونے کا رسوب حاصل ھو جاتا ھے - پھر اُس کو سوھاگے، میگنیز
وغیرہ کے ساتھہ پگھلاتے ھیں - اِس عمل کے بعد سونے کو فقط
صاف کرنا رہ جاتا ھے جو مختلف طریقوں سے انجام کو پہنچتا
ھے - چاندي نکالنے کا بھي یہي طریقہ ھے - یہ طریقہ سونا
چاندي "بنانے" کا نہیں بلکہ اِن قیمتی دھاتوں کے ذروں کو جو
اور چیزوں میں رلے ملے ھوتے ھیں اُن سے "الگ کرکے اکٹھا کرلینے"
کا ھے - اب ھم ایک بالکل ھي دوسرے طریقے کا ذکر کرینگے جسے
لوگوں نے کسی دھوکے میں آکر یا دوسروں کو دھوکا دینے کي
غرض سے اختیار کیا - یہي وہ طریقہ ھے جسے "کیمیاگری" یا

"الکیمیا" (Alchemy) کہتے ہیں - اِس پر مختصر سی بحث کرکے یہ دکھایا جائے گا کہ یہ کہاں تک، قابل عمل ہے اور سونا بنانے کا امکان اِس میں کس حد تک ہے - الکیمیا یا کیمیاگری کوئی نیا مسئلہ نہیں بلکہ بہت ہی قدیم ہے - جہاں تک اصطلاح کا تعلق ہے یہ مصریوں کي ایجاد معلوم ہوتي ہے کیونکہ یہ ایک ایسے لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی "سیاہ زمین" کے ہیں اور زمانۂ قدیم میں مصر کي زرخیز زمین کو سیاہ زمین کہتے تھے' یا یہ ایسے لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی "رموز و اسرار" کے ہیں - بعض کے مطابق یہ ایک یوناني لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معني "خیساندے' عرق یا سیال" کے ہیں - یہ لفظ ایک کتاب میں ملتا ہے جو کہ جولیس فرمیکوس (Julius Firmicus) نے چوتھي صدي عیسوي میں مرتب کي تھي - "الکیمیا" سے مراد وہ علم ہے جس سے ارذل دھاتیں' مثلاً تانبا' لوھا' سیسا وغیرہ' سونے چاندي میں تبدیل کي جاسکیں - اِس علم کے حامل پادری' راهب وغیرہ تھے جو اپنے منتروں یا سحر کی بنا پر اپنے بتکدوں' عبادت گاهوں اور خانقاهوں میں سونا چاندي بنانے میں کامیاب هوتے تھے اور بظاهر اُن کا کوئي ذریعۂ معاش نہ هوتا تھا - فی زمانہ' بھی تعلیم یافتہ لوگوں کا یہی خیال ہے - تین چیزوں (پارس پتھر' آب حیات' اور الکیمیا) نے انسان کو همیشہ سرگرداں رکھا اور اُسے سونا چاندي بنانے کی ایسي دھن لگی کہ بہت سے لوگوں نے اپني جاگیریں اُس کے ایک تاو کي کسر میں پھونک دیں -

تاریخ سے معلوم هوتا ہے کہ یہ مسئلہ اور بھي زیادہ دیرینہ ہے - اِس کے متعلق بہت سي روایتیں ہیں

جن کا بیان کرنا خالي از دلچسپي نه هوگا - بعض کا خیال هے که هرمس (ادریس علیهٔ‌السلام)[1] نے بنيِ‌نوع کو علوم و فنون کي تعلیم دي تهي - اُن کی یادگار قائم رکهنے کي غرض سے اُن کے شاگردوں اور معتقدوں نے دواؤں کي بوتلوں کو بند کرنے کے بعد اُن پر "مهر ادریس" ثبت کرنا شروع کی اور یه رواج یهاں تک ترقی پذیر هوا که اب بهی کیمیاوي لٹریچر میں مهر ادریس (Hermetic Seal) کي اصطلاح رائج هے - پانوپولس (Panopolis) کے فلسفي زوسیموس (Zosimus)[2] - کے بیان کے مطابق الکیمیا کی ابتدا تیسري صدي عیسوي میں هوئي تهی - چنانچه وه لکهتا هے که جب فرشتے دنیا کی اصلاح کے لیے بهیجے گئے تو یهاں کي چهروں پر ایسے ریجهے که همارے جهان کی عورتوں سے شادی هی کرنے پر مجبور نه هوگئے بلکه اپنے تمام رموز سے بهی اُن کو واقف کردیا جن میں ایک الکیمیا بهي تها - اِسي قسم کے

---

۱ - اِس سے مراد هر مس اعظم هے - اصل میں یه لفظ "ارمس" هے جو عطارد کا نام هے - اهل عرب اِسے ادریس اور عبرانی اخنوخ کهتے هیں هرمس مصر کے شهر منف میں پیدا هوئے تهے - عمر بعض اقوال کے مطابق بیاسی سال اور بعض کي رو سے تین سو پینسٹهه سال هوئي - بعض کا بیان هے که هرمس تین گذرے هیں - پهلا هرمس طوفان نوح سے قبل گذرا هے اور هرمس کا لفظ قیصر و کسري کی طرح ایک لقب هے - ایرانیوں کے نزدیک هرمس اعظم کیومرث کے پوتے هیں اور کیومرث حضرت آدم علیهٔ‌السلام تهے - سب سے پهلے اِنهیں نے کتابیں تصنیف کیں المسیح جلد ۳ نمبر ۱۱ جولائي ۱۹۲۵ع ص ۶ و ۷ ماخوذ از عیون‌الانباء في طبقات‌الاطباء تالیف ابن ابي اُصیبعه -

۲ - زوسی‌موس ایک یونانی مورخ هے -

ایک قصہ کا ثبوت اخنوخ (Enoch یا Hanokh)[1] اور ترتولین (Tertullian) کی کتابوں سے بھی ملتا ہے - اُن کا بھی خیال ہے کہ سونے چاندی' چمکدار دھاتوں اور موثر جڑی بوٹیوں کا علم انسان کو فرشتوں سے حاصل ہوا ہے - ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابراھیم کی بیوی سارا کے قبضے میں ایک کتبہ تھا جس میں اِس مسئلے کے متعلق بھی کچھ معلومات تھیں - ایک عربی روایت کے مطابق اللہ میاں نے یہ علم حضرت موسیٰ اور ھارون کو سکھایا تھا - الغرض جتنے منھہ اُتنی باتیں - "کتاب‌الفہرست" میں' جس کو ابن‌الندیم[2] نے دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں تالیف کیا تھا' منقول ہے کہ اُس علم کی تعلیم ہرمس[3] نے دی تھی جو دراصل بابل کا رہنے والا تھا - جب بابل سے وہاں کے باشندے نکال دیے گئے تو اُس نے مصر میں سکونت اختیار کرلی - لائڈن (Leiden) کے عجائب خانے میں ایک مصری بردی[4] (Papyrus) ہے جو تیسری صدی عیسوی کی لکھی ہوئی ہے اور تھیبس (Thebes) میں ایک قبر میں ملی تھی - اِس پر جو عبارت تحریر ہے اُس میں بھی اِس مسئلے کا ذکر موجود ہے - پس ظاہر ہے کہ تیسری صدی عیسوی سے

---

۱ - اخنوخ سے مراد ہرمس اعظم ہے جس کو ادریس بھی کہتے ہیں -

۲ - محمد ابن اسحق ابن‌الندیم نے اپنی تصنیف "کتاب الفہرست" ۳۷۱ ھجری کے لگ بھگ مرتب کی -

۳ - غالباً اِس ہرمس سے مراد ہرمس ثانی ہے جو کلدانیوں کے مشہور شہر بابل میں رہتا تھا اور جس کا زمانہ طوفان نوح کے بعد تھا -

۴ - ایک قسم کی گھاس جو دریاؤں کے کناروں پر پائی جاتی ہے اور پرانے زمانے میں اِس سے کاغذ کا کام لیا جاتا تھا -

پہلے الکیمیا کی ابتدا ہو چکی تھی اور ایک عرصے تک یہ علم سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا ہوگا - ان تمام باتوں سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اسکندریہ کے یونانیوں کو بھی اِس کا علم تھا - بعد کو الکیمیا نے ایران میں سنہ ۶۴۰ میں اپنا سکہ جمایا جبکہ ایران بہت سے حکما و علما کا مولد و ملجا تھا - ایران میں عربی، شامی، یونانی اور ہندی معلومات یکجا کی گئیں - پھر یہ فن سیروسیاحت کرتا ہوا آٹھویں صدی عیسوی میں اندلس پہونچا - الکیمیا کی اصطلاح کے ساتھ 'ال' کا اضافہ اِسی زمانے میں ہوا - اور یہ لفظ وہاں بھی اپنی دھاک جماتا ہوا مغربی اقوام کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوا! ممالک مغرب میں جو اصلاح اور ترقی اِس میں ہوئی وہ اظہر من‌الشمس ہے -

پیرس کے قومی کتب خانے اور لائڈن یونیورسٹی کے کتب خانے میں عربی زبان میں کچھ صحیفے موجود ہیں جو دو دوروں سے متعلق ہیں - دور اول میں کراتیس (Crates)[1] کی کتابیں ہیں جن کو خالد ابن یزید ابن‌معاویہ نے مرتب کیا ہے - کتاب‌الفہرست کے مطابق یہ پہلا مسلم کیمیاداں، جو ۶۳۵ء میں پیدا اور ۷۰۴ء میں فوت ہوا، شامی راہب ماریانوس (Marianus) کا شاگرد تھا - دوسرے دور کی کتابیں جابر اور دیگر سائنس دانوں کی لکھی ہوئی ہیں - سائنٹفک نقطۂ خیال سے جابر کی کتابیں بہترین ہیں - متقدمین کی جو کچھ منتشر معلومات تھیں اُس

---

۱ - اِس نام کے دو یونانی فلسفی ہیں - غالباً یہاں مراد اُس سے ہے جو تھیبس کا رہنے والا تھا - چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں گذرا ہے اور دیوجینیس کا مشہور شاگرد ہوا ہے -

کو بھی اُس نے منضبط کرنے کی کوشش کی ہے۔ جابر کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایران میں پیدا ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ شام میں۔ وہ ابو عبداللہ جابر ابن حیان ابن عبداللہ کوفی کے نام سے مشہور ہے۔ اِس ماہر کیمیا کا دور حیات آٹھویں اور نویں صدی عیسوی پر مشتمل ہے۔ اِس کی طرف سیکڑوں کتابیں منسوب ہیں، لیکن فرانسیسی سائنس داں برتھیلو (Berthelot)[1] کی تحقیق کے مطابق کم سے کم ستر صحیفے ضرور جابر کے قلم سے ہیں۔ عربی حوالوں میں رازی اور شیخ ابوعلی ابن سینا کے نام بھی آتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ بغداد علوم وفنون کا مرکز تھا۔ عربوں نے تمام معلومات کو یکجا کیا تھا مگر وہ کتب خانہ جس میں خلفاے اسلام اور متقدمین اطباء کی نسلوں کی کمائی اور دولت جمع تھی آگ کے نذر ہو گیا۔

اِس آڑے وقت میں شیخ ابو علی ابن سینا کی ہستی ظہور میں آئی۔ وہ اس واقعے سے بہت متاثر ہوئے اور طب کی ایک ایسی کتاب لکھنے کا بیڑا اُٹھایا جو ہر طریقے سے جامع ہو۔ چنانچہ اُنھوں نے اس کتاب کو درجۂ تکمیل کو پہونچایا اور وہ ایسی مقبول عام ہوئی کہ اٹھارھویں صدی عیسوی تک یورپ کے تمام مدارس کے درس میں داخل رہی۔ ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی فارس میں ۹۲۵ع میں پیدا ہوئے۔ بغداد میں طبیب کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اُنھوں نے بھی بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

عربوں کا پرچم ترقی جس وقت اندلس میں لہلہا رہا تھا، زندگی کے ہر شعبے میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی

---

۱ - ۱۸۲۷ع میں پاریس میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۷ع میں مرا۔

تھی - ارباب فن کی ہرقسم کي خاطر و مدارات ہوتي تھی اور
کسي قسم کا تعصب نہ برتا جاتا تھا - ہرمذہب کے ماننے والوں
اور ہر ملک کے باشندوں کا خیرمقدم کیا جاتا تھا جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ عربی استادوں سے مغربی طلبہ نے استفادہ کیا -
عربی کتابوں کے ترجمے یورپ کی علمی زبان لاطینی میں ہوئے -
یہ کام گیارھویں صدی عیسوي میں شروع ہوا -

مترجموں میں کونسٹانٹینس افریکانوس (Africanus
(Constantinu) اور گیرارڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona)[1] کے
نام قابل ذکر ہیں - روبرتوس کا ستریفسس (Robertus
Castrensis) نے خالد کے استاد موریانوس کي کتاب کا ترجمہ
کیا جو ۱۱۸۲ع میں ختم ہوا - اور بھی بہت سے لوگوں نے
ترجمے کیے ہیں مگر اُن کے نام زیادہ مشہور نہیں ہیں - مغربي
اقوام نے عربوں کی معلومات کو اپنی زبان میں جمع کیا -
جابر کے متعلق بعض کي رائے ہے کہ جو کام اُس کے نام سے
موسوم کیا جاتا ہے وہ در اصل اُس کا نہیں ہے حالانکہ یہ بات
پوري طرح ثابت ہوچکي ہے کہ وہ نمک ' شورے اور گندک کے
تیزابوں سے واقف تھا ' بہت سی دھاتوں اور اُن کے مرکبات کے
خواص کا بھي اُسے علم تھا ' وہ عمل کشید ' عمل تصعید ' اور
عمل تقطیر سے اور بہت سے دوسرے عملوں سے بخوبی واقف تھا -

ایک زمانے میں اجسام کے متعلق یہ خیال رہا ہے کہ وہ

---

۱ - کرے مونا (واقع لمبارڈي) میں پیدا ہوا - اطالوي فلسفے سے تنگ
آکر اسپین گیا اور عربوں سے تعلیم حاصل کي - اِس نے تقریباً ۶۶ کتابوں کا
ترجمہ کیا ہے - اِس کا دور حیات ۱۱۸۷ - ۱۱۱۴ع پر مشتمل ہے -

ایک هی سادہ شے سے ارتقائی مدارج کے بعد حاصل ہوئی هیں - اس خیال کی ابتدا یونان میں ہوئی جب فلسفیوں نے مادے کی حقیقت پر غور کرنا شروع کیا - ارسطو[1] بھی اس خیال کا معتقد تھا - وہ اس سادہ شے کو 'هیولیٰ' سے تعبیر کرتا تھا اور اس کے نزدیک صرف چار عناصر تھے (آب، خاک، آتش، باد) - کچھ عرصے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ تمام چیزیں پارے اور گندک[2] کے جوہروں کو مختلف توازن میں ملانے سے حاصل ہوتی هیں - اگر کوئی شخص ارذل دھات سے سونا بنانا چاہے تو اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ اس میں سے اربعہ عناصر کو دور کرلے اور پھر اس میں گندک کے جوہر کو آگ کے عمل سے ملائے - ونسینٹ (Vincent)[3] رازی سے ناقل ہے کہ تانبا دراصل چاندی ہے اگر کوئی شخص اس کا لال رنگ دور کردے تو چاندی حاصل ہو جائے گی - یہ خیال تیرھویں صدی عیسوی میں عام طور سے

---

۱ - ارسطو جس کا دور حیات ۳۸۴ ق - م - تا ۳۲۲ ق - م - ہے - استاگیرا (Stagira) میں پیدا ہوا - وہ تمام چیزوں کو تین قسموں میں تقسیم کرتا ہے - (۱) فطری اشیاء ' جن میں حیوان ' نباتات ' زمین اور ستارے وغیرہ سب شامل هیں (۲) خدا ' جو ایک بالا ترذات ہے (۳) انسان -

۲ - پارے اور گندک سے معمولی پارا اور گندک مردا نہیں بلکہ اُن کی روح سے مطلب ہے جس سے موجودہ زمانے کے کیمیا داں واقف نہیں هیں -

۳ - ونسینٹ غالباً بووے Beauvais کا رہنے والا تھا - ۱۱۹۰م میں پیدا ہوا اور ۱۲۶۴م میں مرا -

مانا جاتا تھا - یونانی صحیفوں میں بھی اس کا ذکر ہے اور اسی سے الکیمیا کی ابتدا ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے - لوگوں نے مختلف عناصر کو مختلف مقداروں میں ملانا شروع کیا جس سے در اصل بھرتیں (Alloys)[1] بنیں - پارے اور کسی دوسری دھات کو باہم ملانے سے ملغم (Amalgam)[2] بنے - کبھی چیز روپہلی تھی اور کبھی سنہری اور کبھی دوسرے رنگ کی چیزیں بنی تھیں - جب سنہری شے حاصل ہوئی تو لوگوں نے خیال

---

۱ - بھرتیں بنانے کے لیے عناصر کا کوئی توازن مقرر نہیں جس مقدار میں چاہیں ملا سکتے ہیں - عناصر خواہ وہ دھات ہوں یا غیردھات ان کو پگھلایا جاتا ہے ٹھنڈے ہونے پر وہ ایکذات ہو جاتے ہیں اور اُن کے خواص اُن اجزاء سے جن سے وہ بنے ہیں بہتر ہوتے ہیں - چنانچہ پیتل تانبے سے بہتر ہے؛ اس میں جست کی ۳۰ فیصدی مقدار ہوتی ہے -

۲ - ملغم اُن بھرتوں کو کہتے ہیں جن میں پارا شامل ہوتا ہے - یہ مختلف طریقوں سے بنائے جاتے ہیں؛ یعنی :—

(۱) دھات اور پارے کو باہم رکھنے یا ملانے سے '

(۲) دھات اور پارے کو کسی ھلکئے ہوئے تیزاب میں رکھنے سے '

(۳) پارے کو کسی دھات کے نمک کے محلول میں ڈالنے سے '

(۴) دھات کو مرکیورک نائٹریٹ کے محلول میں ڈالنے سے -

ملغم بعض حالتوں میں سیال ہوتے ہیں اور بعض میں قلمی شکل میں - حرارت سے ان کی تحلیل ہوجاتی ہے لیکن سونے اور چاندی کے ملغم کی تحلیل پارے کے نقطۂ جوش پر بھی نہیں ہوتی ' رانگے کا ملغم آئنوں پر قلعی کرنے کے واسطے استعمال ہوتا ہے اور کیڈمیم اور تانبے کا دندان‌سازی میں کام میں آتا ہے -

گیا کہ بس سونا بنگیا - رنگ کا اختلاف ایک تاو کی کسر پر محمول کیا گیا مگر اِس سلسلے میں ایک بات یہ ہے کہ معتقدمین جن کو اُن عملیات کا علم تھا وہ اِس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اِن طریقوں سے سونا نہیں بنتا بلکہ صرف بھرتیں بنتی ہیں[1] ' جن کو وہ زیورات اور دوسری چیزوں کے بنانے میں کام میں لاتے تھے - چنانچہ بردی یا ابتدائی کاغذ (Papyrus) کے جو نسخے موجو ہیں اُن سے بھی یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بھرتیں بنائی جاتی تھیں - الکیمیا کے خیال کی نشو و نما صرف اُس وقت ہوئی جبکہ علم کی روشنی پرا جہالت کی تاریکی منڈلانے لگی - برتھیلو کا بیان ہے کہ اِس فن کے حامل بزرگان مذہب تھے جو اِس امر سے واقف تھے کہ اِن طریقوں سے چاندی سونا نہیں بن سکتا ' لیکن اپنی بزرگی و برتری کی شہرت کے واسطے دبی زبان سے اس کرامت کا اقرار کرتے تھے -

فزکس ایت مستیکا (Physics et Mystica) ایک کتاب ہے جو غلط طور پر دیموقریطوس (Democritus)[2] سے منسوب ہے - اِس میں بھی دھاتوں میں مختلف رنگ اور چمک پیدا کرنے کے نسخے موجود ہیں - بعد کو اِس کتاب کی شرح

---

۱ - چنانچہ یہ فقرہ آج بھی ہندستان میں اکثر سنا جاتا ہے :—
" کیمیا کی دھن میں جو لوگ اپنی عمریں گنوا دیتے ہیں اُنہیں کیمیا تو ملتی نہیں : ہاں کچھ جوڑ ' کچھ ٹانکے معلوم ہو جاتے ہیں " (س)

۲ - یا دیمقراطیس بہت مشہور یونانی فلسفی ہے ابڈیرا (Abdera) واقع تھریس (Thrace) کا رہنے والا تھا - غالباً ۴۷۰ یا ۴۶۰ ق - م - میں پیدا ہوا اور سقراط کا ہمعصر تھا - اِس نے روح کے مسئلے پربہت غور و خوض کیا ہے -

سنیسوس (Synesius) نے لکھی جو اسکندریہ میں چوتھی صدی عیسوی میں سیراپوس (Serapus) کا پجاری تھا - وہ خود بھی مضمون کو نہیں سمجھتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ عملی نسخوں کو الگ کردیا اور بہت بنانے اور دھاتوں میں رنگ پیدا کرنے کے جو نسخے موجود تھے اُن کو اِس طریقے سے بیان کیا کہ سمجھ میں نہیں آسکتے اور ہر نسخے کو سحر و افسوں پر ختم کیا ہے - اُس وقت غالباً علم نجوم میں کافی ترقی ہوگئی تھی چنانچہ دھاتوں کو ستاروں اور برجوں کے نام سے موسوم کیا ہے - لائڈن کے کتب خانے میں جو بردیاں موجود ہیں اُن سے بھی اِس امر کا ثبوت ملتا ہے - سونے چاندی کو سورج اور چاند سے تعبیر کیا ہے - اولمپیوڈوروس (Olympiodorus)[1] نے اپنی کتاب میٹیورولجیکا (Mateorologica) میں بھی اِس کا ذکر کیا ہے - سیسے کو زحل (Saturn) سے' لوہے کو مریخ (Mars) سے' تانبے کو زہرہ (Venus) سے' رانگے (Tin) کو عطارد (ہرمس یا مرکری) سے' چاندی اور سونے کے بھرت یعنی الیکٹرم (Electrum) کو مشتری (Jupiter) سے ظاہر کیا ہے - یہ تمثیلات یونانی صحیفوں میں بھی ملتی ہیں' جو وینس (Venice) میں سارقوس (St. Marks) کے کتب خانے میں ہیں اور دسویں صدی عیسوی کے لکھے ہوئے ہیں - ان میں فرق یہ ہے کہ الیکٹرم کو' جو عنصر دھات نہیں ہے'

---

۱ - اِس نام کے بہت سے مصنف گذرے ہیں لیکن یہاں اُس مصنف سے مراد ہے جو پانچویں صدی عیسوی میں تھیبیس واقع مصر میں پیدا ہوا - برتھیلو نے تحقیق کی ہے کہ وہ الکیمیا بھی جانتا تھا - یوں وہ مورخ کی حیثیت سے بہت مشہور ہے -

اُس فہرست سے الگ کردیا ہے اور رانگے کو مشتری سے اور پارے کو عطارد سے تعبیر کیا ہے -

الکیمیا کے متعلق معلومات بہت سی کتابوں سے ملتی ہے جن کے نسخے یورپ کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں لیکن سب سے زیادہ پرانے وہ ہیں جو مارقوس کے کتب خانے میں ہیں - جہاں تک نسخوں کا تعلق ہے کم و بیش سب کی نوعیت ایک سی ہے - یہ نسخے آٹھویں نویں صدی عیسوی میں قسطنطنیہ میں جمع کیے گئے تھے - اِن میں بعض زوسیموس (Zosimus) اور سلے سیوس کے لکھے ہوئے ہیں اور بعض کے متعلق خیال ہے کہ موسیٰ ' دیمو قریطوس اور اوسطانیس (Ostanes) کے لکھے ہوئے ہیں - عربوں نے اِن کتابوں کا ترجمہ سریانی (یا سوری زبان) سے کیا - برتھیلو (Berthelot) کا خیال ہے ' جو بہت زیادہ قرین قیاس ہے ' کہ یہ ترجمے بغداد میں نویں یا دسویں صدی عیسوی میں ہوئے ہیں - برگیس آف ریسینے (Bergius of Resaene) کی کتاب کا بھی ترجمہ ہوا ' جو چھٹی صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی - کیمبرج یونیورسٹی میں زوسی موس کی ایک کتاب کا ترجمہ موجود ہے ' لیکن اُس کے اصل نسخے کا پتا نہیں چلتا -

بہر حال اِس خیال میں ' کہ تمام چیزیں گندک اور پارے کی جلوہ گری ہیں ' کچھ اور چیزوں کا اضافہ ہوا - سنکھیا (Arsenic) شامل کی گئی ' پھر نوشادر بھی اِس فہرست میں داخل کیا گیا خیال یہ تھا کہ اِنہیں اشیا سے سب چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں -

سولھویں صدی عیسوی میں اس خیال میں ایک اور اضافہ ہوا - پراسیلسوس (Paracelsus) [1] نے بیان کیا کہ الکیمیا سے دراصل علم‌الادویہ مراد ہے اور اِس میں دواؤں کے افعال بھی شامل ہیں - اِس خیال سے متعدد سائنس دانوں نے اتفاق کیا [2] لیکن پراسیلسوس تین چیزوں یعنی پارے ' گندک اور نمک کو تمام اشیا کی اصل سمجھتا تھا مگر فون ھیلمونٹ (Von Helmont) [3] نے ارسطو کے عناصر اربعہ اور پراسیلسوس کے جواھر ثلاثہ کے دعوے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا - اُس کے نزدیک آگ کا کوئی مادی وجود نہیں اور خاک ھرگز عنصر نہیں ھو سکتی - بعد کو بوائل نے عناصر اربعہ اور جواھر ثلاثہ کے

---

۱ - ایک جرمانی طبیب جو غالباً ۱۴۹۰ م میں پیدا اور ۱۵۴۲ م میں فوت ھوا -

۲ - اِن میں سے بعض کے نام یہ ھیں :— (۱) گلاؤبر (J. R. Glauber) جرمانی کیمیادان جو ۱۶۰۳ یا ۱۶۰۴ء میں پیدا ھوا اور ۱۶۶۸ء میں مرا - (۲) بوائل (Robert Boyle) ' انگریزی کیمیاداں جو ۱۶۲۷ء میں پیدا ھوا اور ۱۶۹۸ء میں مرا - ۳) اسحاق نیوٹن (Isaac Newton) انگریز فلسفی جو ۱۶۴۲ء میں پیدا ھوا اور ۱۷۲۷ء میں مرا - ۴) اشتال (G. E. Stahl) ' جرمانی طبیب اور کیمیا داں جو ۱۶۶۰ء میں پیدا ھوا اور ۱۷۳۴ء میں مرا - (۵) ھیرمان بورھارے (Hermann Boerhaave) و لندیزی طبیب جو ۱۶۶۸ء میں پیدا ھوا اور ۱۷۳۸ء میں مرا - (۶) بیشر (J. J. Becher) ' جرمانی طبیب اور کیمیاداں جو ۱۶۳۵ میں پیدا ھوا اور ۱۶۸۲ء میں مرا -

۳ — یہ بیلجیم کا رھنے والا اور پرسیلسوس کا شاگرد تھا - کیمیاداں بھی تھا اور طبیب وغیرہ بھی - ۱۵۷۷ء میں پیدا ھوا — گیس کا لفظ اسی کی ایجاد ھے اور ھوائی کیمیا کی ابتدا اِسی نے کی -

دعووں کو بالکل ہی خاک میں ملا دیا - اُس کا قول ہے کہ عنصر ہم صرف اُسی شے کو کہہ سکتے ہیں جس سے کوئی اور عنصر حاصل نہ ہو سکے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصر اور مرکب کا امتیاز اُس کے ذہن پر پوری طرح منکشف ہوگیا تھا ' مگر بوائل اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ تمام اجسام کا وجود ایک سادہ شے سے عمل میں آیا ہے - بیشر اور اشٹال نے اِس خیال کو اور ترقی دے کر موجودہ کیمیا کا سنگ بنیاد رکھا - اٹھارویں صدی میں کیمیا میں بہت ترقی ہوئی -

انیسویں صدی عیسوی میں فرانسیسی کیمیاں داں پروٹ (Prout)[1] نے یہ دعویٰ پیش کر کے کہ تمام چیزیں ایک ہی شے سے بنی ہیں پرانے خیال میں پھر ایک نئی روح پھونک دی ' لیکن انگریز کیمیاداں ڈالٹن (Dalton)[2] کے نظریۂ جواہر نے اِس خیال کو لغو قرار دیا کیونکہ برزیلیوس (Berzelius)[3] نے جوہروں کے جو اوزان معلوم کیے تھے اُن سے اِس خیال کی مطابقت نہیں ہوتی تھی - کسی عنصر کے وزن جوہری سے مراد یہ ہے کہ وہ ہائڈروجن[4] کے وزن جوہری کے مقابلے میں کتنا وزنی ہے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اب مقابلہ

---

۱ - ۱۷۵۵ء میں پیدا ہوا ' پیرس میں تعلیم پائی اور ۱۸۲۲ء میں مرا -

۲ - ۱۷۰۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۴۴ء میں مرا -

۳ - سویڈن کا مشہور کیمیاداں جو ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۴۸ء مرا -

۴ - ایک گیس جو بہت ہی ہلکی اور جل اٹھنے والی ہے -

آکسیجن[1] کے جوہر کے وزن سے کہا جاتا ہے - آکسیجن کے جوہر کا وزن ۱۶ ہے - اِس کے مقابلے میں ہائڈروجن کا ۱۰۰۰۸ - ڈالٹن نے محسوس کیا کہ ہر ایک عنصر بہت ہی چھوٹے چھوٹے اجزا سے مل کر بنتا ہے ' جو ایک ہی قد و قامت کے ہوتے ہیں اور اُن کے وزن میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی ؛ لیکن مختلف عناصر کے اجزا کا وزن مختلف ہوتا ہے - ڈالٹن کے نزدیک اِن اجزا سے اور چھوٹے چھوٹے اجزا ممکن نہیں - لہذا اُس نے اِن کو ایٹم (Atom) یعنی جزو لایتجزیٰ سے موسوم کیا - اُس کے نظریے کے مطابق مرکبات میں عناصر کا ایک مخصوص اور معین تناسب ہوتا ہے اور اُس مخصوص توازن میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی مثلاً پانی کے ہر قطرے میں ' بحساب وزن ' ۸ حصے آکسیجن اور ایک حصہ ہائڈروجن ہوتا ہے[2] -

---

۱ - ایک گیس کا نام ہے ' جسے ہم سانس لینے میں استعمال کرتے ہیں اور جو دوسری چیزوں کو جلنے میں مدد دیتی ہے - ہوا کا پانچواں حصہ آکسیجن گیس ہوتی ہے اور اگر یہ نہ ہو تو آگ نہ سلگ سکے ' کھیتوں میں اناج نہ پکے اور انسان زندہ نہ رہ سکے -

۲ - اِس سلسلے میں " عنصر " کے موجودہ مفہوم کو مختصر طور پر بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے :—

دنیا میں جس قدر مادی اشیا ہیں اُن کے لیے وزن اور حجم کا ہونا لازمی ہے - طبیعیات کے اعتبار سے اجسام کی تین قسمیں ہیں : جامد ' مائع ' ہوائی ؛ مگر کیمیا کی رو سے اجسام کی اور تین قسمیں ہیں : مرکب ' آمیزہ (مخلوط) ' عنصر - مرکب (Compound) وہ ہے جو عناصر سے بنا ہو اور جس کے اجزا معمولی حیلہ و تدبیر سے الگ نہ کیے جا سکیں - جیسے آئرن سلفائڈ (Iron Sulphide) دو عنصروں لوہے

عنصر (Element) سادہ ترین چیز کو کہتے ہیں - وہ نہ تو آمیزہ ہوتی ہے اور نہ مرکب - متقدمین کے اربعہ عناصر دراصل عناصر نہیں ہیں - اب عنصر سے وہ شے تصور کیجاتی ہے جس سے کوئی اور عنصر حاصل نہ ہو سکے مثلاً لوہے کو کتناہی توڑیے یا پیسیے اُس کے ہر خوردبینی ذرے میں بھی لوہے کے خواص موجود ہوں گے - ایسے عناصر کی تعداد اب کئی سو ہے - زیادہ دقیق نظر سے دریافت کیا گیا ہے کہ ہر عنصر کی ساخت میں چھوٹے چھوٹے ذرات ہوتے ہیں جن میں سے ہر ذرے کو سالمہ (Molecule) کہتے ہیں - سالمہ بھی چھوٹے چھوٹے اجزا سے مل کر بنتا ہے اور اس کے چھوٹے سے چھوٹے جز کو جوہر کہتے ہیں - جب کسی شے کے سالمات میں ایک ہی قسم کے جواہر ہونگے تو ظاہر ہے کہ وہ شے بہت ہی سادہ ہوگی اور اُس سے کوئی دوسری سادہ شے پیدا نہ ہوسکے گی - ایسی ہی سادہ شے کو ہم عنصر کہتے ہیں جیسے لوہا، تانبا وغیرہ - لیکن اِس قاعدۂ کلیہ سے بعض سادہ دھاتیں مستثنیٰ

اور گندک کا مرکب ہے مگر معمولی حیلہ و تدبیر سے اُس سے لوہا یا گندک حاصل کرنا ممکن نہیں - یاد رکھنا چاہیے کہ مرکب اور اُس کے ترکیبی اجزا کی طبیعی خصوصیتیں مختلف ہوتی ہیں - علاوہ اس کے مرکب میں عناصر کا معین اور مخصوص توازن ہوتا ہے - بخلاف اِس کے آمیزے یا مخلوط (Mixture) میں اجسام کو کسی توازن میں ملایا جا سکتا ہے اور اُن کو بلاآسانی علحدہ بھی کیا جا سکتا ہے - ان کے طبعی خصوصیات میں کچھ فرق نہیں آتا - اگر شکر، ریگ، لوہے، گندک، پانی وغیرہ کو ملا دیجیے تو یہ چیزیں آسانی کے ساتھ پھر الگ الگ کی جا سکتی ہیں -

هیں - یعنی تھوریم (Thorium) ' یوریلیم (Uranium) ' ریڈیم (Radium) وغیرہ مثل لوهے یا تانبے کے عناصر هیں لیکن اِن عناصر میں ایک خاص بات یہ هے کہ اِن سے دوسرے عناصر خارج هوتے هیں جن کے جواهر تھوریم ' یوریلیم ' اور ریڈیم سے بالکل مختلف اور سادہ هوتے هیں -

ایک مدت تک لوگوں کا خیال رها کہ جوهر کي تقسیم نہیں هوسکتي یعنی کسی شے کا سب سے چھوٹا حصہ جو ممکن هوسکتا هے وہ جوهر هی هے لیکن موجودہ دور میں اِس خیال میں ایک زبردست تبدیلي واقع هوئی هے - جن متعدد سائنس دانوں نے اِس سمت میں قدم اُٹھایا هے اُن کے انکشافات مختصر طور پر یہاں بیان کیے جاتے هیں اِس لیئے کہ اِن سب سے جواهر کي حقیقت معلوم هوتي هے :-

ٹامسن (J. J. Thomson) نے دعوی کیا کہ تمام عناصر کی بستگي ایک ابتدائی مادے (Primary Stuff) سے عمل میں آئي هے - اِس ابتدائي مادے کے جواهر کو وہ الیکٹرون (Electrcn) سے تعبیر کرتا هے (جس کا ترجمہ " برقیہ " یا " برق‌پارہ " کہا جاسکتا هے) اور ابتدائی مادے کو منفي برق قرار دیتا هے - اُس کے نزدیک تمام عناصر کي تعمیر اِسی سے هوئی هے - ایک زمانہ تھا جب نہ زمین تھي نہ سورج ' نہ انسان تھا نہ حیوان ؛ تمام خلا برقي ابخروں سے بھري هوئي تھي - یہ برقی ذرات فضا کي تاریکی میں برقي آتش میں موجزن تھے - برق پارے مثبت بھي تھے اور منفی بھی اور اُن میں باهمي کشش عظیم طاقتوں کی بنا پر تھي لیکن رفتہ رفتہ اِن برق پاروں یا ذرات

کی توانائي کم هوتی گئي اور باهمي وصل سے جواهر دانوں (Grains of Atoms) کي ابتدا هوئی اور پهر اُن سے ایک زمانۂ دراز کے بعد هائڈروجن ' جو همارے عناصر میں سبکترین هے ' وجود میں آیا اور پهر تدریجی تکثیف سے دوسرے عناصر پیدا هوئے -

مادام کیوري اور اُس کے شوهر مسیو کیوري (Curies) ' ریمزے (Ramsay)[1] ' اور ردرفورڈ (Rutherford) کی تحقیقات سے ظاهر هوتا هے که دراصل ابتدائی عناصر چار هیں جن میں سے دو معدوم هیں ؛ بقیه دو یعني هائڈروجن اور هیلیم (Helium)[2] موجود هیں - اِن هی چار سے تمام عناصر کی تعمیر هوئی هے - اِن عناصر کو " قلبیه " (پروٹون Proton) کا نام دیا گیا هے - قلبیے مثبت برق کے اجزا هیں - اِن کے گرد الیکٹروں (منفي برقپارے) گردش کرتے هیں اور اِنهیں دونوں کی کمي بیشي سے مختلف عناصر پیدا هوتے هیں - ۱۹۱۱ع میں ردر فورڈ نے بیان کیا که جوهر کي ساخت میں

(۱) ایک وزنی مرکزه (nucleus) هوتا هے جو مثبت برقی بهرن (charge) کا هوتا هے -

(۲) مرکزے کے گرد منفی برقي بهرن کے ذرات گردش کرتے هیں -

---

۱ - یه کیمیادان ۱۸۵۲ع میں گلاسگو میں پیدا هوا اور ۱۹۱۶ع میں مرا - آرگن گیس کے انکشاف کا سهرا اِسي کے سر هے -

۲ - هیلیم - ایک گیس کا نام هے جو غیرعامل هے - وه نه جلتي هے اور نه معین احتراق هے - بهت هلکي هوتي هے اِس لیے اُس کو هوائي جهازوں میں بهرنے کے کام میں لاتے هیں -

(۳) مرکزے کے گرد ایک اور باهری حلقه هوتا هے - اِس میں بهی منفي برقپارے گردش کرتے هیں -

ڈینش سائنسداں پروفیسر بور (Bhor) نے اِس راے سے اتفاق کیا اور اِس قدر اضافہ کیا کہ جب منفي برقپارے (برقیے) ایک مدار سے دوسرے پر جست کرتے هیں تو شعاعوں کا اخراج هوتا هے -

لیوئس (G. N. Lewis) کہتا هے کہ هر ایک جوهر میں ایک خول یا چهلکا هوتا هے اور ایک گری یا مغز - گري میں کسی کیمیاوي تبدیلي کا اثر نہیں هوتا لیکن خول میں جو برقیے هوتے هیں اُن کي تعداد میں کیمیاوی تبدیلیوں سے فرق آجاتا هے -

اِن قولوں کے مطابق ایک جوهر میں بہت سے الیکٹرون یا برقیے هوتے هیں جو پروٹون یا قلبیوں کے گرد گردش کرتے هیں - دونوں قسم کے ذرات کا برقی بار برابر هوتا هے جس کی وجه سے ایک تعدیلی (neutral) نظام (مثل نظام شمسي کے) قائم هو جاتا هے -

پروفیسر بور ' جرمانی پروفیسر زومرفیلڈ (Sommerfeld) اور سر ولیم بریگ (Sir William Bragg) کے انکشافات سے اس خصوص میں بہت کافی ترقي هو چکی هے بلکہ سر ولیم بریگ اور اُن کے شرکاے کار کے تجربات سے تو قلبیے کی ساخت کا مسئله بهی حل هو جاتا هے -

الغرض سائنسداں اِس نتیجے پر پہونچے هیں کہ تمام

مادے کے جواہر کی تعمیر دو قسم کے ذرات یعنی مثبت اور منفی
برقوں سے ہوتی ہے جن کو اصطلاح میں قلبیے (Proton) اور
برقیے (Electron) کہتے ہیں - چونکہ ہائڈروجن کا جوہر
بہت سادہ ہے لہذا مثالاً اُسی کو لیجیے - اس میں وسط میں
ایک قلبیہ ہوتا ہے اور اُس کا نظام قائم رکھنے کے لیے ایک
برقیہ ہوتا ہے جو قلبیے کے اِرد گرد گردش کرتا رہتا ہے جیسے
کہ آفتاب کے گرد سیارے گردش کرتے ہیں - وزنی عناصر میں
ان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور ان کے مرکزے میں مثبت اور
منفی برقوں کی تعداد میں فرق ہوتا ہے - قلبیوں کی تعداد
ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے - اور جتنے قلبیے زیادہ ہوتے ہیں اُتنے ہی
اور برقیے باہری مدار پر مرکزے کے گرد گردش کرتے ہیں -
چنانچہ ہیلیم کے مرکزے میں چار قلبیے اور دو برقیے ہوتے
ہیں یعنی مرکزے میں دو آزاد مثبت بار ہیں لہذا توازن
قائم رکھنے کی غرض سے باہری مدار پر دو اور برقیے گردش
کرتے ہیں تو اس طریقے سے قلبیوں اور برقیوں کی تعداد برابر ہو
جاتی ہے - قلبیوں کی اِس بیشی پر مختلف جواہر پیدا
ہوتے ہیں - سونے کی صورت میں یہ بیشی ۷۹ ہے اور پارے
کی شکل میں ۸۰ - اگر کسی صورت سے پارے کے مرکزے سے
قلبیوں کی بیشی ۸۰ سے ۷۹ ہو جائے تو پارے کا جوہر سونے
میں تبدیل ہو جائے گا - اِسی طریقے پر یورینیم (Uranium)
میں ' جو سب سے زیادہ وزنی عنصر ہے ' یہ بیشی ۹۲ ہے - اگر
اِس میں سے ۹۱ قلبیے کم کردیے جائیں تو وہ پھر یورینیم کہلانے
کا مستحق نہ ہوگا - اگر دس جدا کردیے جائیں تو جست کا مرکزہ
باقی رہ جائے گا اور اگر ۱۲ نکال دیے جائیں تو سونے کا -

پروت کے دعوے کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ تمام اجسام کا وجود ایک ہی شے سے ظہور میں آیا ہے مگر اس دعوے کو ڈالٹن کے نظریۂ جواہر (Atomic Theory) نے رد کر دیا تھا - موجودہ دور میں تابکاری (Radioactivity)[1] کے انکشاف سے پھر پروت کے دعوے میں جان پڑ گئی ہے - یوں تو عنصر سے یہ مراد ہے کہ اس سے اور کوئی سادہ عنصر حاصل نہ ہوسکے لیکن "تاب کار عناصر" (Radioactive elements)[2] سے مسلسل اور پیہم طریقے پر دوسرے عناصر کا تکسر (Disintegration) ہوتا ہے جو تاب‌کار عناصر سے پھر نوع مختلف ہوتے ہیں ; جیسے ریڈیم ، کہ اس سے خود بخود نائٹون (Niton)[3] خارج ہوتی ہے اور نائٹون کا تکسر ہیلیم (Helium) میں ہوتا ہے جو اپنے ممتاز خواص رکھتا ہے اور نائٹون سے قطعی طور پر مختلف ہے - اس واقعے سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض عناصر کی تبدیلی ممکن

---

۱ - اُنیسویں صدی میں مادام کیوری نے ریڈیم معلوم کی جس سے نظریۂ تکسر کی بنا پڑی - اس عنصر اور اسی قسم کے دیگر عناصر سے پیہم اور مسلسل طریقے پر خاص قسم کی شعاعوں کا اخراج ہوتا ہے جن میں ہیلیم گیس بھی ہوتی ہے - اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ بہت سے عناصر کی تصیر ہیلیم سے عمل میں آئی ہے - تاب‌کاری کا یہ عمل ایک مدت تک جاری رہتا ہے اور بالآخر ایک ایسا ثقل باقی رہ جاتا ہے جو خود تاب‌کار نہیں ہوتا - ریڈیم کی صورت میں یہ سیسا ہے - تھوریم سے بھی سیسا حاصل ہوتا ہے مگر دونوں میں فرق ہے جس کی تفصیل یہاں نظر انداز کی جاتی -

۲ - تاب‌کار عناصر اُن کو کہتے ہیں جو ہمیشہ شعاعیں پھینکتے رہتے ہیں حتی کہ آخر میں وہ شعاعوں سے خالی ہو کر تاریک ہو جاتے ہیں -

۳ - ایک گیس کا نام ہے -

ہے اور دوسرے یہ کہ اگر کسی صورت سے ' جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ' جوہر کے مرکزے سے قلیہے کم کردیے جائیں تو بھی عناصر کی تبدیلی ممکن ہے - اب ہم اِس مسئلے کے متعلق کچھ اور ثبوت پیش کرینگے مگر اُس سے قبل بعض اُن قصوں کا بیان کرنا بے محل نہ ہوگا جو سونا چاندی بنانے کے متعلق مشہور ہیں - اگرچہ اُن سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ مریدان ارادت‌مند کی عقیدت‌مندیاں ہیں جو " پیراں نمي پرند مریدان مي پرانند " کا مصداق ہیں -

برانڈ (Brande) لکھتا ہے کہ " ۲۷ دسمبر ۱۶۶۶ع کو ایک شخص (Elias) الیاس نامی آیا - وہ سونا بنانا جانتا تھا - میں نے منت سماجت کرکے اُسے سونا بنانے پر راضی کر لیا - الیاس نے سیسا پگھلایا اور پھر اُس میں کوئی سفوف ڈال دیا جس سے نہایت عمدہ سونا بن گیا - چلتے وقت تھوڑا سا سفوف وہ مجھے دے گیا - ایک عرصے کے بعد میری بیوی نے سفوف کے آزمانے کي ضد کی - میں نے آدھا آونس (۱۶ ماشے) سیسا پگھلایا اور اُس میں جوں ہی وہ سفوف ڈالا سیسے میں ایک سنسناہٹ پیدا ہوئي اور بہت سے بلبلے نکلے - پندرہ منٹ میں سیسا سونے میں تبدیل ہوگیا - ہمیں بہت تعجب ہوا - میں اُس کو سنار کے پاس لے گیا تو اُس نے اُسے نہایت عمدہ بتایا اور پچاس فلورن في آونس دینے پر تیار ہوا " -

جیمس پرائس (James Price) ایک انگریز طبیب تھا - وہ ایک سرخ اور سفید سفوفوں کي مدد سے سونا چاندي بناتا تھا لیکن جب اُس سے ۱۷۸۲ع میں سونا بناکر دکھانے کو کہا گیا

تو وہ اپنے تجربے میں کامیاب نہ ہوسکا اور شرمندگی کے باعث خود کشی کرلی -

مان گیٹوس (Mangetus) راوي هے که ایک اطالوي نے گروس (M. Gross) نامی پادری کے روبرو ایک کُٹھالي میں رانگا گرم کیا اور دوسري میں پارا ؛ دونوں کو ملایا اور اُس میں ایک لال رنگ کا سفوف شامل کیا تو سونا بن گیا -

ایک بزرگ مجھ سے قصہ بیان کرتے تھے کہ میں جنگل میں رهتا تھا ایک دن میرے دروازے پر ایک فقیر نے دستک دي اور مجھ سے کہنے لگا که مجھے بھی سونا بنانا سکھا دو - میں نے کہا که مجھے سونا بنانا نہیں آتا مگر اُس نے یقین نہیں کیا اور کہا که اچھا پہلے میں بناکر دکھاتا هوں پھر تم مجھے دکھانا - چنانچه اُس نے لوهے یا کسي اور دهات کو پگھلایا اور اُس میں ایک بوٹي کا عرق جو میرے دروازے کے سامنے اُگی هوئي تھي شامل کیا - عرق کے شامل کرتے هي چاندي بن گئي - بعد ازاں میں کسي ضرورت سے گھر کے اندر گیا - واپس آکر دیکھتا هوں تو فقیر صاحب غائب هیں اور اُس بوٹی کا جو میرے دروازے پر اُگی هوئي تھی کہیں کوئي نشان تک باقی نہیں - میں نے دونوں کو تلاش کرنے کی انتہائی کوشش کي مگر سوائے ناکامی کے کچھ هاتھ نه آیا .. اس قسم کے بہت سے قصے هر ملک میں سنے جاتے هیں - مگر یه اسرار هیں ؛ علوم سے اِن کو کوئی نسبت نہیں - اِن قصوں کے مطابق سونا چاندی بنانے کے لیے صرف معمولی آنچ کي اور کسي سفوف یا بوٹي کے عرق کي ضرورت لاحق هوتي هے اور نہایت عمدہ چاندي

یا سونا بہ آسانی حاصل ہو جاتا ہے ؛ لیکن علمی تحقیق کو راز سے بھر ہے ۔ اُس کا کام یہ ہے کہ چن چن کر ہر ایک راز کو افشا کرے ۔ عناصر کی تبدیلی کی جو صورت علم کیمیا کی مدد سے ظاہر ہوتی ہے وہ کیمیاگری کے عمل سے زیادہ پیچیدہ مگر زیادہ قرین عقل ہے ۔

علم کیمیا کی رو سے عناصر کی تبدیلی کا ثبوت ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ۔ ایسٹرو فزکس (Astrophysics) کے دلائل :—
کبھی کبھی دو ستارے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں ۔ ٹکرانے سے وہ بالکل مشتعل ہو جاتے ہیں اور اُن کا وجود " سحابیہ " (Nebula) میں منتقل ہو جاتا ہے ۔ اُس وقت یہ " سحابیہ " سوائے مشتعل گیس کے اور کچھ نہیں ہوتا ۔ جب ایسے نوخیز سحابیوں کا طیفی (Spectral) مشاہدہ کیا جاتا ہے تو اُن میں ہائڈروجن کا اور چند ایسے عناصر کا وجود پایا جاتا ہے جن سے ہم واقف بھی نہیں ہیں ؛ لیکن جب اس مشتعل گیس کا درجۂ تپش (Temperature) کم ہوتا جاتا ہے تو دوسرے عناصر بھی آموجود ہوتے ہیں اور تپش کے اور زیادہ کم ہونے پر اور پیچیدہ عناصر آتے جاتے ہیں ۔ اس طریقے سے پانچ قسم کے کواکب کا طیفی مشاہدہ ہو سکتا ہے :—

(۱) ہیلیم کواکب ۔ اِن میں ہائڈروجن ، ہیلیم ، آکسیجن ، نائٹروجن (Nitrogen)[۱] اور میگنیسیم (Magnesium)[۲] پایا جاتا ہے ۔

---

۱ ۔ ایک غیرعامل گیس جو ہوا میں تقریباً چار بٹے پانچ حصہ ہوتی ہے ۔
۲ ۔ ایک دھات جو جلنے سے ایسی تیز روشنی دیتی ہے کہ آنکھوں میں چکاچوندھ پڑ جاتی ہے ۔

(۲) سیریین کواکب - اِن میں لوہے کا اور اضافہ ہو جاتا ہے -

(۳) سورج - اِس میں بہت سے دھاتي عناصر کا وجود
پایا جاتا ہے -

(۴) ایلتھریین کواکب - اِن میں تٹانیم (Titanium)[1]
بہت زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے -

(۵) کاربن کواکب - اِن میں کاربن (Carbon)[2] '
کیلسیم (Calcium)[3] اور بعض دھاتوں کا اضافہ
ہو جاتا ہے -

اب اگر یہ کواکب (جن کی تعمیر بہت پیچیدہ ہے اور جن میں بہت سے عناصر پائے جاتے ہیں) آپس میں تکرا جاتے ہیں تو اِن کا وجود مشتعل گیس کے سحابیے میں منتقل ہو جاتا ہے اور تمام وزني اور پیچیدہ عناصر غائب ہوکر سادہ عناصر ظاہر ہوتے ہیں مثلاً ہائڈروجن وغیرہ - سحابیے کے تھنڈے ہونے پر پھر وزنی عناصر آموجود ہوتے ہیں - اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ درجۂ تپش عناصر کے تبدیل کرنے کے واسطے ضروری و لازمي شے ہے - ہمارے کرۂ ارض میں بہت سے پیچیدہ عناصر پائے جاتے ہیں - اس کی وجہ بھي درجۂ تپش کا کم ہو جانا ہے - جبکہ یہ مشتعل آتش کا ایک گولا تھي تو اِس میں

---

۱ - ایک دھات کا نام ہے -

۲ - یہ ادھات یا غیردھات ہے - کوئلہ ' ہیرا اور گریفائٹ ' کاربن ہی کي مختلف شکلیں ہیں -

۳ - یہ بھي آدھات ہے -

بھي سادے اور سبک ترین عناصر کا وجود تھا - درجۂ تپش کے
کم ہونے پر دوسرے وزني عناصر عالم وجود میں آئے ہیں -

ان دلائل سے ظاہر ہے کہ عناصر کا وجود عارضی ہے -
درجۂ تپش کا اِس میں بہت کچھ دخل ہے - اگر ہمارے
قبضے میں وہ زبردست توانائی کسی صورت سے آ جائے تو ہم بھي
سادہ عناصر سے پیچیدہ عناصر حاصل کر سکتے ہیں - ہم تین
قسم کی توانائي یا قوت سے واقف ہیں :—

(ا) حرارت - معمل (یعلي تجربہ خانے) میں ہم تین
یا چار ہزار سے زیادہ درجۂ تپش حاصل نہیں کرسکے ہیں -
بخلاف اِس کے سحابیوں کا درجۂ تپش تیس چالیس ہزار درجے
ہوتا ہے تب کہیں عناصر میں تبدیلی واقع ہوتی‌ہے - لہذا یہ
قوت ہمارے مقصد کے لیے کارگر ثابت نہیں ہوسکتي -

(۲) تابکار اشیاء کی تحلیل - یہ قوت حاصل کرنے کا
دوسرا ماخذ ہے - یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ریڈیم سے خود بخود
نائٹون حاصل ہوتا ہے اور نائٹون سے ہیلیم خارج ہوتا ہے -
اِسی طرح اگر تانبے کے نمکوں کو نائٹون کے زیر اثر رکھیں تو اُن
سے لیتھیم (Lithium)[1] حاصل ہوتا ہے اور اسی طرح سے
تھوریم، سیسے، زرکونیم (Zirconium)[2]، تتانیم سے کاربن
ڈائي‌آکسائڈ حاصل کرسکتے ہیں - تانبا اور لیتھیم ایک ہي

---

۱ - ایک دھات کا نام ہے -　　　　۲ - ایک دھات کا نام ہے -

خاندان[1] کے رکن ہیں - دونوں میں باہمی کیمیائی رشتہ ہے - لیتھیم اس خاندان کا سبک‌ترین رکن ہے - تانبے کی تحلیل میں لیتھیم کا ظاہر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تانبے کا وزنی جوہر الگ ہوکر لیتھیم کے ہلکے جوہر میں جلوہ‌نما ہوا - یہی حال تھوریم اور کاربن کا ہے - کاربن اپنے خاندان یا اپنی جماعت کا سبک‌ترین فرد ہے اور اسی وجہ سے وہ تھوریم کی تحلیل میں پیدا ہوتا ہے - اس توانائی کی بنا پر بعض عناصر کی قلب ماہیت ممکن ہے -

(۳) بجلی - جب الومینیم کے برقیروں (Electrodes)[2] کو زیربرقیرہ (Cathode) کے اخراج میں رکھیں تو نےاون (Neon)[3] حاصل ہوتا ہے - یہ جوہری تحلیل کی مثال ہے - کولی (Collie) اور پیٹرسن (Patterson) کے تجربات سے جوہری تالیف کا ثبوت ملتا ہے ; پہلی مثال میں وزنی چیز سے ہلکی چیز حاصل ہوتی

---

۱ - علم کیمیا میں دھاتوں اور اَدھاتوں کی جماعت‌بندی کردی گئی ہے جسے ہم طبقہ یا خاندان کہہ سکتے ہیں - تفصیل کے لیے کیمیا کی درسی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے -

۲ - جس برقی عمل سے کسی مائع کی تحلیل ہوتی ہے اس کو برق پاشیدگی کہتے ہیں اور مائع کو برق‌پاشیدہ - دھات کی تختی یا تار کا سرا جس میں ہوکر برقی رو کسی برق پاشیدہ میں گذرتی ہے اس کو زبربرقیرہ (anode) کہتے ہیں اور وہ چیز جو کہ اس کو برق‌پاشیدہ سے باہر لے جاتی ہے زیربرقیرہ (cathode) کہتے ہیں اور زبربرقیرے اور زیربرقیرے کو مجموعی صورت میں صرف برقیرے کہتے ہیں -

۳ - نےاون ایک گیس کا نام ہے -

اور دوسري میں هلکي سے وزنی لهذا اِن تعاملات کی بنا
جواهر کي صرف شکشت و ریخت هی ممکن نهیں بلکه تع
بهي ممکن هے - سادہ شے سے پیچیدہ اور اُس سے پهر سادہ
حاصل هو سکتي هے - ردرفورڈ کهتا هے که سبک ترین عن
مثلاً نیئون میگنیسیم سلیکون (Silicon)[۱] ' گندک - کلور
کا تکسر ممکن هے لیکن هائڈروجن ' هیلیم ' لیتهیم ' کاربن اور آکسیج
میں ممکن نهیں - نکل (Nickel) ' تانبا ' جست ' سلی
(Selenium) ' کرپٹون (Krypton) ' مولبڈینم (Molybdenum
پلاڈیم (Palladium) ' چاندي ' زینون (Xenon)[۲] میں تک
حاصل نهیں هوا - کیلسیم ' لوهے وغیرہ کے تعاملات ابهي نتیجه
ثابت نهیں هوئے هیں - اِس کی وجه یه هو سکتي هے که
ابهی تک اُن تعاملات یا آلات سے ناواقف هیں جن کے ذریعے
اِن چیزوں میں تکسر تکمیل کو پهنچ سکے - بهر حال قل
ماهیت کا ثبوت کافی هے - اِس سے پیشتر یه بیان کیا جا
هے که اگر کسی عنصر کے جوهر کے مرکزے میں ایک قلبیے
کمی کر دی جائے تو دوسرا عنصر عالم وجود میں آجاتا هے
پارے کے جوهر کے مرکزے میں ۸۰ قلبیے هوتے هیں - اگر اُن مر
سے ایک کم کر دیا جائے تو اُس سے سونا حاصل هو جائے
کیونکه سونے کے مرکزے میں ۷۹ قلبیے هوتے هیں - پرفیسر میتھ
(Matthew) اِس تغیر کے پیدا کرنے میں کامیاب هوا هے
اُس نے پارے کے بخارات سے بهرے هوئے لیمپ میں برقی

---

۱ — یه ادهات هي یعني اِس کا شمار دهاتوں میں نهیں -

۲ — کرپٹون اور زینون ' گیسوں کے نام هیں ؛ مولبڈینم اور پلاڈیم ' دهاتوں کے

گذاری ؛ پارے کے جوہروں کو تیز رفتار برقیوں کی بڑی تعداد سے ٹکرانے کا موقع دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سونا بن گیا ۔

الکیمیا کی اِبتدا ' اُن روایتوں کو چھوڑ کر جو اُس کے متعلق عوام میں مشہور ہیں ' یونانیوں کے فلسفے کے ساتھ ساتھ ہوئی جبکہ اُنھوں نے اجسام کی حقیقت اور ' ہیولی ' کی طرف توجہ مبذول کی ۔ تجربہ شاہد ہے کہ جب کسی قوم کا ستارۂ اقبال اوج پر ہوتا ہے تو اُس میں ہر قسم کی ترقی کے آثار نظر آتے ہیں خواہ وہ تہذیب و تمدن کے متعلق ہوں یا علوم و فنون کے ۔ جو قدم بھی اٹھتا ہے وہ بہتری ہی کی طرف ہوتا ہے ۔ قدرت کی طرف سے اِنسان کو ایسا ملکہ و دیعت ہوا ہے جو خود بخود اُس کی طبیعت کو ایجاد و اختراع کی طرف مائل کرتا ہے ۔ عقل نے ہر مصیبت اور مشکل کے وقت انسان کی رہبری کی ہے اور یہ اِسی کی بدولت ہے کہ جہل و ظلمت کے پردے رفتہ رفتہ اُس کے سامنے سے ہٹتے گئے ہیں اور ہٹتے رہینگے - یونانیوں نے علوم فنون میں جو ترقی کی وہ محتاج بیان نہیں ۔ اُن کے بعد اُن کے جانشینوں نے اُن کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پودہ خوب پھولا پھلا چنانچہ الکیمیا میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی ۔ متقدمین کو بہت سی دھاتیں معلوم تھیں ۔ ان کے اور اُن کے نمکوں کے جو طبیعی اور کیمیاوی خواص تھے اور اُن کا نظام انسانی پر جو اثر ہوتا ہے اُس کو بھی وہ جانتے تھے ۔ انھوں نے مختلف دھاتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نیز ادھاتوں کے ساتھ ملایا ۔ اس طریقے پر ملغم یا بھرتیں تیار ہوئیں ۔ اُن کے خواص کی بھی جانچ ہوئی ۔ ان میں

کہیں تو چمک زیادہ آ گئی تھی اور کہیں مختلف رنگ پیدا ہو گئے تھے - اِنہیں خواص (چمک اور رنگ) کی بنا پر غالباً لوگوں کے دلوں میں سونا چاندی بنانے کا خیال پیدا ہوا - اور وہ بھی غالباً اُس وقت ہوا جبکہ اُس کے سمجھنے والے سپرد زمین ہوچکے تھے اور اُن کے جانشین وہ لوگ تھے جن کو کسی بات کی بھی تمیز نہ تھی - یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کی اکثر قومیں پورے عروج کو پہنچ چکنے کے بعد زوال کی طرف مائل ہو گئی تھیں - زرا غور کیجیے کہ اگر کوئی نام نہاد طبیب فن کو باقاعدہ حاصل کیے بغیر کسی کتاب سے ایک دو نسخے لے کر اُنہیں حفظ کر لے تو اُس کی رائے کی بحیثیت طبیب کے کیا وقعت ہو سکتی ہے - اِسی طرح اگر کوئی شخص علم کیمیا کی باقاعدہ تعلیم حاصل کیے بغیر اُس کے کسی مسئلے پر غور کرنے بیٹھے تو وہ اُسے کس حد تک سلجھا سکتا ہے - کیمیاگروں کا شمار بھی اُنہیں لوگوں میں ہے جو ہلدی کی گانٹھ رکھ پنساری ہو گئے ہیں اور کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے - اُنہوں نے صرف یہ دیکھا کہ مختلف دھاتوں اور ادھاتوں کے ملانے سے چمک اور رنگ پیدا ہو گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ سونے چاندی کا سا رنگ اور چمک پیدا نہ ہو سکے - بےجا معتقدمندی نے اُنہیں قصے کہانیوں اور اسرارپرستی کی بھول بھلیاں میں ڈال دیا - مگر اِس گروہ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا گروہ بھی تھا جس نے تحقیق کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا - اِس دوسرے گروہ کی جد و جہد کا نتیجہ علم کیمیا کی صورت میں رونما ہوا جس کا ذکر اِس مضمون میں کیا جا چکا ہے - اِس

تحقیق و تدقیق سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مادے کی حقیقت کا مسئلہ اِس حد تک حل ہو گیا کہ ' جزولایتجزیٰ ' کی قلعی کھل گئی - ممکن ہے کہ زمانۂ مستقبل میں کوئی 'یسا طریقہ معلوم ہو جائے جس سے سونا چاندی بہ آسانی بنایا جا سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سونے چاندی سے بہتر دھاتیں معلوم ہو جائیں اور سونے چاندی کی کچھ قدر و قیمت ہی باقی نہ رہے -

علم کیمیا میں برابر ترقی ہوتی رہی ہے - متقدمین نے جو باتیں معلوم کی تھیں وہ موجودہ دور کے انکشافات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں - کیمیا کی متعدد شاخیں ہو گئی ہیں جن میں ہر ایک کو ایک مستقل علم کا رتبہ حاصل ہے اور ایک شخص کا کام نہیں ہے کہ وہ اُن سب سے واقف ہوسکے- پھر اِن شاخوں کی اور چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں جن کے ماہر اُن کے خاص مسائل کا روز افزوں کامیابی سے خیر مقدم کر رہے ہیں - اس بات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ یہ علم ابھی اور کہاں تک ترقی کرے گا - عناصر کی قلب [ماہیت ممکن ہے اور سونا بھی بنایا جاسکتا ہے لیکن نہ اِس طرح کہ مرید صاحب نے دھات کو پگھلایا اور پھر صاحب نے اُس پر چھو منتر کردیا اور سونا تیار ہو گیا -

یہ مسئلہ ابھی پورے طور پر حل نہیں ہوا ہے اور جب تک حل نہ ہو جائے ارذل دھاتوں سے سونا بنانے کی کوشش محض تضیع اوقات ہے ؛ ہمیشہ " ایک ہی تاو کی کسر" رہیگی - دھاتوں کی قلب ماہیت اِن آسان طریقوں سے ممکن نہیں جو کیمیاگروں کے اسرار و رموز سے ہیں لہذا ہم کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے :—

اعیا الفلاسفة الماضین فی العقب
گذشتہ زمانے کے فلسفی مدتوں سونا بنانے کی کوشش میں رہے

ان یصنعوا ذهباً الا من الذهب
مگر آخر تھک کر رہ گئے اور بغیر سونا ملائے سونا نہ بنا سکے

او یصنعوا فضة بیضاء خالصة
اسی طرح انھوں نے سفید اور خالص چاندی بنانے کی کوشش کی

الا من الفضة المعروفة النسب
مگر اس میں بھی اُسی طرح نا کام رہے اور بغیر کھری چاندی ملائے چاندی نہ بنا سکے

فقل لطالبها من غیر معدنها
پس اس شخص کو بتلا دو جو اُسے اپنے طور پر بنانا چاھتا ھو

ضیعت عمرک فی التکلید والتعب
کہ تو نے اپنی عمر فضول تکان اور پریشانی میں ضائع کی

ملک عنبر

(۱)

(از ڈاکٹر بنارسي پرشاد سکسینا ایم ' اے ' بي ' ایچ ' ڈي (لندن))

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد اُسکے باقیات سے پانچ چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہوئیں ' اُن میں سے ایک ریاست احمد نگر تھی - اسکي تاریخ حیات میں ' تلوار کی جھنکار اور جنگ و جدل کی وحشت زائیوں کے علاوہ کوئي ایسي بات نہیں ملتی جو مذہبی یا سیاسی نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہو ' احمد نظام شاہ سے لیکر حسین سوم تک کوئی بھی بادشاہ ایسا نہیں ہوا جسکو جا و بیجا جاہ دا‌ریوں کے باعث ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں بہادروں کا خون نہ بہانا پڑا ہو - اسلئے یہہ کہنا غیر مناسب نہ ہو گا کہ ابتدا ہي سے اس ریاست کي سرشت میں فتنہ و فساد کا مادہ زیادہ تھا ' یا یوں کہیے کہ اُس کے خون ہی میں ایک قسم کا زہر بھرا ہوا تھا - زبردست اور زیردست راجاؤں اور اُنکے حامیوں اور مخالفوں کی سازشیں ' اور مذہبي مظالم کے نفرت‌انگیز مظاہرے ' بس شروع سے آخیر تک اس سلطنت کی یہي کہانی ہے - تعجب تو یہہ ہے کہ ان حالات کے باوجود اس ریاست کا جھنڈا تقریباً ایک صدي تک لہراتا رہا اور یہاں کے فرمانروا فخر و ناز سے اپني گردنیں اونچي کئے رہے -

اگر نگاہ تعمق سے دیکھا جائے تو دنیا کے زیادہ تر کیا تقریباً سبھی ریاستوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستان ایک ہی طرح کی ہے - لیکن احمد نگر کی تاریخ میں خاص بات یہہ ہے کہ ایک بار اُس کا زوال ہو کر پھر اُسکا عروج ہوا، یہہ کہا جا سکتا ہے کہ یہہ بجھتے ہوئے چراغ کا آخری سنبھالا تھا مگر اُسکے شعلے سے جو آگ بھڑکی اُسنے بڑے بڑوں کے دلوں کو لرزا دیا - جو خوشحالی، جو کامیابی، اور جو شہرت ایک صدی کے اندر وہاں کے کسی راجہ کو حاصل نہ ہوئی تھی وہ پچیس سال کے اندر ایک اجنبی، غیر ملکی حبشی نے اپنی قوت بازو اور دانشمندی سے حاصل کر لی - کیسا عجیب واقعہ ہے کہ جس سیاسی نظام کا بیج ملک عنبر نے بویا اُسکے پھلوں کا مزہ نہ تو خود اسکو اور نہ اُسکے بعد میں آنیوالوں کو ملا بلکہ اُسکی لذتوں سے ہندو بہرہ‌یاب ہوئے - عنبر کا نام تو اُس زمانے کی تمام تاریخی کتابوں میں ملتا ہے لیکن اُسکا علحیدہ مستقل طور پر کہیں ذکر نہیں ملتا - افسوس کی بات تو یہ ہے کہ سنہ ۱۵۹۰ع کے بعد ریاست احمد نگر کی مفصل تاریخ، فرشتہ کے سوا کسی دوسرے همعصر مورّخ نے نہیں لکھی - برہان دوم کی اجازت سے علی بن عزیزاللہ طبا طبائی نے برہان مآثر نامی ایک کتاب لکھی لیکن سر اوزلے ھیگ آنجہانی کی رائے ہے کہ تاریخی نقطۂ نظر سے یہہ کتاب کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور بات بھی یہی ہے - اِسلئے اس کا سہارا لینا فضول ہے - اگر اسکی خیال آرائیوں کا خلاصہ کر کے صداقت کا عنصر دریافت بھی کیا جائے جب بھی عنبر کی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی -
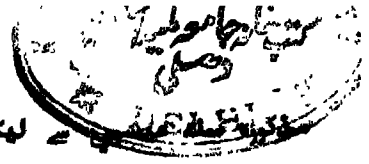
[illegible] سے لیکر دس برس تک احمد نگر حوادث کا شکار رہا ' اُسی لئے اس ریاست میں نہ کسي مستقل نظام حکومت کي اشاعت کیجاسکی اور نہ کسي طرز تعلیم کی بنیاد قائم ہو سکی - مرتضی نظام شاہ دوم اور حسین نظام شاہ کے دربار میں کسي بڑے ذی‌علم شخص کی موجودگی کا ذکر نہیں آتا ' یہي وجہہ ہے کہ اُنکے دربار کی کوئي ایسی تاریخي کتاب نہیں ملتي جس میں اس ریاست کو نئي زندگی دینے والے شخص (ملک عنبر) کے محاسن بیان کئے گئے ہوں -

جس زمانے میں عنبر نے عملي دنیا میں قدم رکھا اس زمانے میں احمدنگر کا نام ہي نام باقي رہ گیا تھا ' اُسکا خاکہ بگڑ چکا تھا اور اُسکي شہرت فنا ہو چکي تھی - اقبالمند اکبر نے احمد نگر کے قلعہ پر قبضہ کر ہی لیا تھا اور اپنے بڑے بڑے سرداروں کو جنوبي سر حد کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیا تھا ' اُدھر عادل شاہ اور قطب شاہ اس ریاست کے ٹکڑوں کو ہڑپ کر لینے کے لئے منہہ کھولے بیٹھے تھے - یعني یہہ کہ اپنے مقاصد کي تکمیل کے لئے عنبر کو اپنے ہمعصر تمام فرمانرواؤں کی دشمني مول لینا پڑي - یہی وجہ ہے کہ مغل عادل شاہي اور قطب شاہي کتابوں میں عنبر کا ذکر تو ضرور ملتا ہے لیکن مفصل حال نہیں ملتا - بھلا اپنے دشمن کا خصوصیت سے کوئي کیوں ذکر کرتا - مغلوں نے تو اُسکو بہت ہي تلخ اور نفرت انگیز الفاظ میں مخاطب کیا ہے - خود جہانگیر نے جو اپني تہذیب اور مروت کے لئے مشہور ہے ' عنبر کو " کلسونہا " (سیاہ رو) بدبخت اور بدذات کہہ کر اُسکي اہانت کي ہے -

معتمد خان نے اُسے بد بخت کہہ کر اپنی نفرت ظاہر کی ہے ۔ خافی خان اپنی جنوبی ہند کی تاریخ میں لکھتا ہے کہ برہان‌پور کے امرا نے شہنشاہ جہانگیر کے پاس عرضداشت بھیجی جس میں یہ جملے لکھے تھے کہ " اگر اس کالے رنگ والے اور داغدار نسل کے غلام کی تنبیہ کا مناسب انتظام نہ کیا جائیگا تو ہم راجپوت بہادروں کیطرح اپنی جانوں کو فدا کردینگے ۔ بیجا پور اور گولکنڈا والوں نے بھی اِسی قسم کے الفاظ کا استعمال کیا ہے ۔ مرہٹوں سے یہ امید تھی کہ وہ عنبر کے حالات زندگی پر کچھ زیادہ روشنی ڈالینگے ' کیونکہ ایک طرح سے وہی اُن کو سیاسی زندگی بخشنے والا تھا لیکن ایک مسلمان کے احسان کا اُن کو کیونکر اعتراف ہو سکتا تھا ۔

مواد کی اتنی کمی ہونے کے باوجود اُس زمانے کی کتابوں کے متفرق بیانات کی بنیاد پر ' عنبر کے حالات زندگی پر تھوڑی بہت روشنی تو ضرور ہی ڈالی جا سکتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ حبشیوں کی نسل کا تھا ' اُسکی ایک تصویر سے جو مسٹر ان ' سی ' مہتا کے پاس ہے پتہ چلتا ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی تھا ' اُس کی باھیں لمبی اور گاودم ' اُس کا سینہ چوڑا ' کمر شیر کی کمر کی طرح پتلی اور گردن موٹی اور مضبوط تھی ۔ اُس کے جسم کے ایک ایک عضو سے پھرتی ٹپکتی تھی ' اس کے چہرہ سے بہادری ' ہونٹھوں سے ثبات عزم اور آنکھوں سے دور اندیشی نمایاں تھی ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سرداری کے بہت سے صفات کی اپنے میں اہلیت رکھتا تھا ۔

بخارا اور بغداد کے بازاروں میں خریدے ہوئے غلاموں نے

هندوستان کے سیاسی اسٹیج پر قابل قدر کارنامے دکھلائے ہیں -
قطب‌الدین ایبک ، شمس‌الدین التمش ، غیاث‌الدین بلبن کے نام
تو اس ملک کے قرون وسطی کی تاریخ میں غیر فانی طور پر
ثبت ہیں ، عنبر بھی اسی مالے کا ایک قیمتی رتن تھا -
جوانی میں ابھرنے کے لئے بچپن ہی میں اس کی قسمت پھوٹ
گئی تھی - کار کنان قضا و قدر نے اس کو ماں باپ کی
محبت اور ان کے سائے سے محروم کر دیا تھا - سوداگروں کے
ہاتھ پڑ کر بغداد کے بازار میں بکنے آیا - یہاں میر قاسم یا
خواجہ بغدادی نامی سوداگر نے اسے خرید لیا - قاسم اپنا مال
بیچنے جنوبی ہند میں آیا - یہاں احمدنگر میں میرک‌دبیر
یعنی چنگیز خاں سے اس کا سودا پٹ گیا - اور اس نے
اس گاہک کے ہاتھ عنبر کو بیچ ڈال - قسمت کے کھیل تو
دیکھئے کہ آدمی کو کیا کیا ناچ نچاتی ہے - کہاں حبش اور
کہاں ہندوستان - کون جانتا تھا کہ جب عنبر گھر سے نکل کر
پردیس میں پہونچے گا تو عزت و شہرت کے بام فلک تک پہونچ
جائیگا - چنگیز خاں خود حبشی تھا - بات کی بات میں اپنے
ہموطن کے صفات کو پہچان گیا - سمجھ گیا کہ غلام ہے تو کیا
ہوا ، یہہ نوجوان ہونہار ہے - اپنی حیثیت و عزت کے قیام
کے لئے اس نے ایک ہزار غلاموں کی ایک پلٹن بنائی تھی -
اسی فوج میں اس نے عنبر کو بھی داخل کر لیا -

اس زمانے میں احمد نگر کا حکمران مرتضی اول تھا ، تخت
حکومت پر بیٹھنے کے وقت وہ صرف ایک لڑکا تھا ، اسی وجہ
سے بعد کے چھہ سال تک عنان حکومت کی ماں خوانچہ ہمایوں

کے هاتھ میں رهی ' مرتضی کو سیاسی امور کی طرف نہ دلچسپی تھی اور نہ اُس کو اُس کی ضرورت محسوس هوتی تھی ' وہ اپنا وقت کھیل کود یا پڑھنے لکھنے میں صرف کیا کرتا تھا - ماں نے بیٹے کی بے توجہی کو دیکھ کر هاتھ پاؤں پھیلانا شروع کیا - بڑے بڑے عہدوں پر اپنے رشتہ داروں کو مقرر کیا اور جن لوگوں سے اُس کو خطرہ تھا اُن کو سرکاری نوکری سے بر طرف کر دیا - بہت هی جلد سلطنت کے خاص خاص عمال خوانزہ کے اس طرز عمل سے بد دل هو گئے - اور اُنہوں نے ملکہ کے خلاف سازشیں شروع کردیں - اِس تحریک کے سربرآوردہ لوگ زیادہ تر بھی غیر ملکی حبشی تھے - اُنہیں نے مرتضی کو اُس کی ماں کے خلاف اوبھارا اور اُس کو تخت سے علحدہ کر دینے کی صلاح دی - ایک بار جب مرتضی کو صاف طور پر یہہ معلوم هو گیا کہ وہ کتنی سخت بیڑیوں میں جکڑا هوا هے تو اِن بندشوں سے آزادی پانے کے لئے اُس نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ؛ چنانچہ جلد هی اُس کی تدبیریں کارگر هو گئیں - خوانزہ کو شاهی محل کے عیش و آرام کے بدلے قید خانہ کی تکلیف اُٹھانی پڑی ' اور سلطنت کو اپنے هاتھ میں لیتے هی مرتضی نے اپنی ماں کے طرفداروں کو نکال باهر کیا اور اُن کی جگہوں پر اپنے نئے حلقۂ احباب میں سے لوگوں کو مقرر کیا اور اس موقع پر مہرک دبیر یعنی چنگیز خاں کی قسمت چمکی ' کیونکہ اُس کو سپہ‌سالار کا رتبہ عطا هوا -

چنگیز نے اپنے مالک کی جی جان سے خدمت کی ' سنہ ۱۵۶۹ع میں عادل شاهی فوج کو اُس نے حدود سلطنت سے نکال باهر

کہا اور علی عادل شاہ کو مجبور کیا کہ وہ بِدر اور برار پر نظام شاہی تسلط تسلیم کرے ' اس بہادر سپاہی کی شہرت و ناموری کو دیکھکر ' دوسرے نظام شاہی سردار جلنے لگے - بِدر کے حملے کے زمانے میں موقع پاکر اُنہوں نے مرتضی کے کان بھرے کہ چنگیزخان کا دل ' حسد اور برائی سے آلودہ ہے ' لیکن اس کا یہ خیال ہے کہ بدر پر قبضہ کرکے ' اپنی علحدہ خود مختار حکومت قائم کرے - چنگیز کو اپنے دشمنوں کی فریب کاریوں کا ذرا بھی پتہ نہ چلا ' سیدھے سپاہی کے طرح وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں لگا رہا ' اسی لیے وہ اپنے مالک کے اندیشوں کا تدارک نہ کر سکا - چنانچہ جب ایک دن مرتضی نے کہا کہ میں تھک گیا ہوں اور ہم لوگوں کو گھر واپس چلنا چاہیے تو چنگیز نے سادہ دلی سے یہ جواب دیا کہ بدر پر بغیر پوری طرح قبضہ کیے ہوئے واپس ہونا مناسب نہیں معلوم ہوتا - یہ سن‌کر مرتضی کا اندیشہ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے شاہی طبیب کے مدد سے چنگیز کو شربت میں زہر ملوا کر پلا دیا - مرتے وقت چنگیز نے مرتضی کو ایک خط لکھا جس میں اُس نے بہت سی قیمتی نصیحتیں کیں - رفیع‌الدین اپنی کتاب تذکرۃالملوک میں لکھتا ہے کہ اگر چنگیز کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو سارے دکھنی خطے میں ایک تہلکہ مچ جاتا - اُس کا خود بھی یہی قول تھا کہ یہ میری زندگی کی تمنا ہے کہ ایک بار شہنشاہ اکبر سے جنگ کروں ' اگر کام آیا تو لوگ یہی نہ کہیں‌گے کہ میرک‌دبیر مرگیا اور اگر فتح حاصل ہوئی تو ابدالآباد تک صفحۂ عالم پر میرا نام ثبت رہےگا - یہ تھا ایک بہادر جنگجو کا خیال! -

اپنے سپہ سالار چنگیز کی موت کے بعد (سنہ ۱۵۷۵ع) عنبر سرکاری فوج میں بھرتی ہو گیا ' لیکن اب تو نظام شاہی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا - اپنی زندگی کے آخری حصے میں مرتضیٰ پاگل ہو گیا ' جنون کے عالم میں اس نے ایک دن اپنے بیٹے حسین کے بستر<ins></ins>ے میں آگ لگادی مگر حسین قسمت کا دھنی تھا ' کہ صاف بچ گیا ' اُس کا دل مجنون باپ سے بدلا لینے کے لیے بیقرار ہو گیا ' چنانچہ جب موقع ملا تو اُس نے مرتضیٰ کو ایک حمام میں بند کرکے نیچے سے آگ جلوا دی - بیچارہ بُھن کر کباب ہو گیا ' باپ کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ کرکے حسین گدی پر بیٹھا ' آیندہ سازشوں کے خوف سے اپنے پیشوا مرزا خان کے کہنے سے اُس نے نظام شاہی خاندان کے پندرہ شاہزادوں کو قتل کرا دیا مگر تین سال کے اندر ہی مرزا خان نے دغا کی اور اپنے مالک کو قتل کرا دیا - اس قتل و خون کے بعد اس نے برہان دوم کے چھوٹے بیٹے اسمعیل کو لوہاگڑہ کے قلعہ سے لاکر احمدنگر کی گدی پر بیٹھایا - لیکن مرزا خان بہت دنوں تک آرام سے نہ رہ سکا ، ' اس کے مظالم سے پائہ تخت میں بڑی ہلچل مچ گئی - اپنے خلاف تحریکوں کی اُمنڈتی ہوئی گھٹاؤں کو دیکھکر وہ جان کے خوف سے ' احمدنگر سے بھاگ نکلا - ریاست کے انتظام کا بار اب جمال خان کے کندھوں پر پڑا ، ' یہ دکھنی مسلمان تھا اور اس کی طاقتوں کی بنیاد میں دکھنیوں کی جماعت تھی جس کا وہ سرغنہ تھا -

جمال خان نے پیشوا کا عہدہ اختیار کرتے ہی ایک نئے عقیدے کی تبلیغ شروع کی ' سولہویں صدی کے آخری نصف حصے

میں مسلمانوں کے ایک انقلابی جماعت نے عوام میں یہ یقین
پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بارھویں امام یعنی امام مہدی کی
پیدایش ہو چکی ہے اور اب اسلام میں ایک نئی بیداری پیدا
ہوگی - اس جماعت کے پیرو مہدویہ کہلاتے تھے - جمال خاں بھی
مہدوی فرقے میں تھا اور اس نے اِس بات کی کوشش کی کہ
احمدنگر اس مہدوی تحریک کا مرکز بن جائے - چنانچہ شیعہ
مذہب کو نیست و نابود کرکے مہدویہ عقیدے کو سلطنت کا
مذہب قرار دیا - تمام ہندوستان کے مہدویہ عقیدے کے لوگ
احمدنگر میں آکر جمع ہو گئے ، انھوں نے جمال خان کو اپنا
خلیفہ تسلیم کیا اور اس کے لیے اپنے تن من دھن کو نثار کر
دینے کے لیے آمادہ ہو گئے - جمال خان کے مذہبی خیالات اور اُس کی
حکمت عملی برار کے امرا کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی ،
اور انھوں نے صلابت خان کی سرکردگی میں اُس سے جنگ شروع
کردی ، اُدھر بیجاپور کی طرف سے بھی حملہ کر دیا گیا -
جمال خان نے بڑی ہمت سے کام لیا ، پہلے صلابت خان کو
شکست دی پھر بیجاپوری فوج کی طرف بڑھا ، پندرہ روز تک
دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں رہیں ،
آخر میں صلح ہوگئی - جمال خان میدان جنگ سے دارالسلطنت
میں واپس آیا اور اس نے اپنا غصہ غیر ملکی لوگوں پر اُتارا ،
یعنی تقریباً تین سو آدمیوں کو ملک چھوڑ دینے کی سزا دی
گئی - یہ واقعہ سنہ ۱۵۹۰ع کا ہے -

عنبر کو اب سرکاری نوکری کرتے ہوئے پندرہ سال ہو چکے
تھے ، احمدنگر کی حالت میں جو انقلابات ہوئے وہ اُنھیں

خاموشی سے دیکھتا رہا ' اس کے سوا وہ اور کرھی کیا سکتا تھا '
کوئی بھی تو غیر ملکی شخص باقی نہیں رہ گیا تھا جس کا
وہ سہارا لیتا - جب جمال خان نے تمام غیر مُلکیوں کے خلاف
اپنی کارروائی شروع کی اور ان کو احمدنگر سے نکال باھر کیا تو
پھر عنبر کی کیا ھستی تھی کہ وھاں رُکا رھتا اور اپنی جان کو
خطرے میں ڈالتا ' کچھ دنوں ادھر اودھر بھٹکتا پھرا اور جس
طرح ھوسکا مصیبت کے دن بسر کرتا رھا - فرشتہ بھی اسی
مصیبت میں مبتلا ھوا اور اس نے احمدنگر سے بھاگ کر
بیجاپور میں پناہ لی اور وھیں اپنی مشہور تاریخ کی کتاب تیار کی -
احمدنگر کی یہ بگڑی ھوئی حالت دیکھکر شہنشاہ اکبر کے منھ
میں پانی بھر آیا - اگر ممکن ھوتا تو وہ اسی وقت اس
ریاست کو ھڑپ کر لیتا ' لیکن اس کی طاقت اور توجہ تو
دوسری طرف تھی - عبداللہ خان اُزبک کی بڑھتی ھوئی ریاست
اور اثر کو دیکھکر وہ خائف ھو رھا تھا اور اُس نے اپنی پوری طاقت
سلطنت کے شمالی مغربی حدود کو محفوظ رکھنے میں لگا رکھی
تھی - تاھم چال سے باز نہ آیا اور اُس نے برھان دوم کو جو
بہت دنوں سے اس کی پناہ میں تھا اُبھارا کہ وہ جاکر احمدنگر
کے تخت پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے - اکبر نے یہ بھی تجویز
کی کہ وہ اس کی مدد کے لیے مغل سپاھیوں کی ایک پلٹن
ساتھ کر دے ' لیکن برھان نے اسے قبول نہیں کیا ' وہ اپنی
کوشش میں کامیاب ھوا ' جمال خان لڑائی میں مارا گیا اور
اسمعیل گرفتار کیا گیا اس کے بعد برھان تخت پر متمکن
ھوا ' اپنے آبا و اجداد کی طرح اس نے شیعہ مذھب کو از سرنو
رائج کیا اور ملک سے نکالے ھوئے بدیسیوں کو پھر سے بلا لیا -

اکبر کو امید تھی کہ برہان اس کا احسان مانے گا ' اور تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کا اقتدار تسلیم کریگا - لیکن برہان نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا - اس پر اکبر بہت خفا ہوا اور بدلا لینے کا موقع ڈھونڈھنے لگا - بیچارا برہان ایک دن بھی سُکھ کی نیند نہ سو سکا ' برابر اندرونی اور بیرونی جھگڑوں میں مبتلا رہا - مسلسل محنت ' بیماری اور افکار سے وہ تھک گیا اور سنہ ۱۵۹۵ع میں انتقال کر گیا - اس کا مرنا تھا کہ احمدنگر میں خانہ جنگی شروع ہو گئی - اس زمانے میں ریاست میں امیروں کے چار گروہ تھے -

(۱) میاں منجھو اور اُس کے دکھنی معتمدین - یہہ لوگ احمد دوم کے طرفدار تھے اور بیجاپور کی سر حد پر اس اُمید پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ ابراهیم دوم ان کی مدد کریگا -

(۲) افریقہ کے باشندے - ابہنگ خاں اور حبش خاں جو شاهزادہ علی کے طرفداروں میں تھے ' یہہ لوگ بھی جنوبی سرحد پر اُسی مقصد سے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے جو پہلے گروہ والوں کا مقصد تھا -

(۳) اخلاص خاں جو ایک دوسری افریقی گروہ کا سردار تھا ' دولت‌آباد کے قریب ڈیرا ڈالے ہوئے تھا اور ایک غیر معروف لڑکے موتی شاہ کا طرفدار بنا ہوا تھا -

(۴) چاند بی‌بی جو احمد نگر میں ایک بچے بہادر نامی کی حفاظت اپنے ذمہ لئے تھی -

شروع میں اخلاص خاں اور میاں منجھو همخیال تھے لیکن بعد میں دونوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور اخلاص خاں نے موتی شاہ کو اپنا سردار تسلیم کر لیا ' اس پر میاں منجھو نے

شہزادۂ سلطان مراد سے جو اس وقت گجرات کا گورنر تھا مدد
کی درخواست کی - اکبر تو اس موقع کا منتظر ھی تھا اس
نے فوراً ھی مراد اور خانخاناں کو اجازت دیدی کہ اپنی اپنی
باقاعدہ فوج لیکر منجھو کی مدد کو پہونچیں - خاندیش کے
حکمراں علی خاں کو بھی اسی غرض سے ایک خط لکھا - مراد
اور خانخاناں نے بڑی تیزی سے کام لیا اور احمد نگر پہونچکر
قلعہ کا محاصرہ کر لیا - علی خاں بھی آ تو پہونچا لیکن
اُس کی ھمدردی دکھنی بھائیوں کے ساتھ تھی - اخلاص خاں
اور ابھنگ خاں نے محاصرہ توڑنے کی کوشش ضرور کی لیکن مغل
سرداروں نے اُن دونوں کو پسپا کر دیا - مراد اور خانخاناں کے
درمیان رشک و حسد ھونے کے باعث اس فتح سے پوری طرح فائدہ
نہیں اُٹھایا جا سکا - آخر میں گولکنڈہ اور بیجا پور سے امدادی
فوج کے آنے کا حال سنکر مراد نے چاند بی‌بی سے صلح کر لی اور ،
مغلوں کو اپنی محنت کے بدلے میں ، برار کا صوبہ ملا -

آئی ھوئی مصیبت کو اس طرح ٹال کے چاندبی‌بی نے بہادر شاہ
کی بادشاھی تسلیم کرائی - میاں منجھو نے خانہ جنگی شروع
کرنے کی ایک بار اور کوشش کی لیکن ابراھیم دوم نے اُس کو
اور اُس کے سردار احمد کو بیجا پور بلا لیا - احمد نگر میں
محمد خاں ، پیشوا کے عہدہ پر فائز ھوا لیکن اُس نے اپنے غرور
اور مظالم سے وھاں کے امرا کو اسقدر تنگ کیا کہ چاند بی‌بی
کو بیجا پور سے مدد مانگنی پڑی - ابراھیم نے سہیل خاں کے
ساتھ ایک فوج بھیجی جو چار مہینے تک احمد نگر کا محاصرہ
کئے رھی - محمد خاں نے خانخاناں سے مدد کی درخواست کی

لیکن اُس کی چال معلوم ہو گئی اور وہ قید کر لیا گیا -
چاند بی‌بی نے ابہنگ خاں کو پیشوا کے عہدہ پر مقرر کیا -

ابہنگ خاں کے نیا عہدہ اختیار کرتے ہي پھر ملکُوں کا ستارہ چمکا ' اُس نے حبشیوں کی ایک فوج جمع کي اور اُن کي مناسب تکریم و عزت کی ' اس کي فراخ دلی کا حال سنکر حبشیوں کي ٹولیوں کی ٹولیاں جو ابتک منتشر تھیں احمد نگر آئیں ' عنبر سے بھي نہ رہا گیا ' وہ بھي اُسي طرف روانہ ہو گیا ' سطوربالا میں یہہ کہا گیا ہے کہ جمال خاں کے مظالم سے تنگ آکر عنبر احمد نگر فرار ہو گیا یا ملک بدر کر دیا گیا تھا ' کچھہ دنوں ایدھر اودھر بھٹکنے کے بعد جب روزي کا کہیں سہارا نہ رہا تو وہ بیجاپور پہونچا اور اُس نے وہاں سرکاري نوکري کر لي ' وہیں سے بیٹھے بیٹھے احمد نگر کی خراب حالت کا تماشا دیکھتا رہا - سچ تو یہہ ہے کہ بیجا پور میں اِس کا جی نہیں لگتا تھا ' لیکن احمد نگر آنے کی بھی آسانیاں نہ تھیں - اب جب موقع ملا تو وہ چوکا نہیں ' جیسے ہي وہ اپنے پرانے شہر میں آیا ویسے ہي اُسے ٹھکانے کي نوکری مل گئي - ابہنگ خاں نے اُسے اپني فوج میں داخل کر لیا -

مغلوں کی زیادتیوں سے مجبور ہو کر ' ابہنگ خاں کو فوراً ھی لڑائی کرنے کی تیاری کرنی پڑي ' اپنی پہلی حکمت عملی کے مطابق اُس نے بیجا پور سے مدد چاھی - لیکن خانخاناں کی قوت اور ھوشیاری کے سامنے گولکنڈہ اور بیجا پور کی متحدہ فوجیں بھی مقابلے پر نہ لڑ سکیں - سنہ ۱۵۹۷ع کے فروری کے مہینے میں دریاے گوداوری کے کنارے سون پت کے مقام پر دکھنیوں کو

شکست فاش ہوئی - احمد نگر پر بدبختی کے کالے بادل گھرنے لگے ' اُس کے زوال میں تو کوئی کسر رہ نہ گئی لیکن اگر تھی بھی تو وہ جلد ھی پوری ھو گئی - ابھنگ خاں نے اپنے ھاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے اور اس بات کی کوشش کی کہ علمان حکومت پوری طرح اسی کے ھاتھ میں آ جائے - چاند بی‌بی اس ڈھٹائی کو کیونکر برداشت کر سکتی تھی نتیجہ یہہ ہوا کہ دونوں کے آپس کے تعلقات میں گتّھیاں پڑ گئیں یہاں تک کہ ابھنگ خاں ' چاند بی‌بی کو قید کرنے کا موقع تلاش کرنے لگا - چاند بی‌بی بڑی ھوشیار عورت تھی ' اُس نے قلعہ کے پھاٹک بند کر لئے اور محفوظ ھو کر بیٹھ رھی مگر ابھنگ خاں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا - جب اکبر کو اس خانہ جنگی کا پتہ چلا تو اُس نے دانیال اور خانخاناں کو دکن کی طرف روانہ کیا اور خود بھی اُسی طرف مراجعت کی ' خانخاناں اور دانیال نے احمد نگر پر حملہ کیا ' ابھنگ خاں نے اُن کو راستے ھی میں روک لینے کی کوشش کی لیکن شاھی فوج کو دیکھتے ھی گھبرا گیا ' اور چاند بی‌بی کی مدد تو در کنار ' میدان سے نکل بھاگا - اور جُنیر پہونچکر دم لیا - مصیبت کے زمانے میں خود داری کو چھوڑ کر چاند بی‌بی نے اپنے محل کے خواجہ سرا چیتا خاں سے مشورہ کیا اور قلعہ کو مغلوں کے سپرد کر دینے کی رائے قائم کی - چیتا خاں نے دغابازی کی ' فوج کو جمع کر کے اُس نے یہہ اعلان کیا کہ چاند بی‌بی تو مغلوں سے ملی ہوئی ہے - سپاھی غصے کے مارے اندھے ھو گئے اور طیش میں آ کر انھوں نے بڑا ھی غضب کر ڈالا یعنی بے گناہ چاند بی‌بی کی

جان لے لی - ادھر مغلوں نے قلعہ کی دیواروں میں سرنگیں
پوری کر لی تھیں اور اُن میں بارود بھر دی تھی - جیسے ھی
اُن کو چاند بی بی کے قتل کا پتہ چلا ویسے ھی اُنھوں نے بارود
میں آگ لگا دی ' دھائیں دھائیں کر کے دیواریں جا بجا سے
گر گئیں ' مغلوں کی فوجیں قلعہ میں گھس پڑیں ' اور اُنھوں
نے بہادر نظام شاہ کو قید کر لیا اور قلعہ پر اپنا جھنڈا
گاڑ دیا -

(۲)

اس طرح سنہ ۱۵۹۹ع میں احمد نگر کی آزادی و
خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا ' لیکن کئی وجوہ سے مغلوں کا
اُس پر پوری طرح اقتدار نہ قائم ہو سکا - اصل وجہ تو یہہ
تھی کہ سلیم کی بغاوت نے اکبر کو دکھن سے واپسی کے لئے مجبور
کیا ' دوسرے یہہ کہ بہت سے سردار جو نظام شاھی ملازمت سے
برطرف ہو چکے تھے وہ اس امر کی کوشش کرنے لگے کہ اپنے
لئے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں ' اُن سرداروں
میں سے دو شخص نمایاں طور پر پیش پیش تھے ' ایک تو
عنبر اور دوسرا راجو پولاد - جس وقت ابھنگ خاں ' احمد نگر
کے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اُس وقت عنبر نے اپنی مستعدی
اور کار گذاری سے اپنے مالک کو ایسا خوش کیا کہ اُس نے اس
کو ڈیڑھ سو سواروں کا نائک بنا دیا ' لیکن جب مغلوں کے آنے
سے خوف زدہ ہو کر ابھنگ خاں بھاگ گیا تو عنبر بھی ریاست
کے سرحدی صوبے کی طرف روانہ ہو گیا ' نہاوندی اور فرشتہ
دونوں کا قول ہے کہ تلنگانا کی سرحد سے بیدر کے ایک کوس

تک ' احمد نگر کے دکھن چار کوس تک اور دولت‌آباد سے بیس کوس چھوڑ کے بندرگاہ تک عنبر ھی کا دور دورہ تھا ' یہاں اُس نے چوری اور ڈکیتی کا انسداد کر کے امن قائم کیا ' تھوڑے ھی دنوں میں اُس کے پاس قریب تین ہزار سواروں کی ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی - اسی فوج کو لیکر اُس نے بدر پر چھاپا مارا ' قلعہ والوں نے اُس کا سامنا کیا لیکن عنبر نے دم کے دم میں اُن‌کو شکست دیدی ' یہہ پہلی آزاد فتح تھی جو عنبر نے اپنی ذاتی قوت بازو سے حاصل کی ' اُس کے بعد اُس کا حوصلہ روز بروز بڑھتا گیا -

جس طرح عنبر بیجاں ریاست کے ایک صوبے میں اپنی خاطر خواہ کارروائی انجام دے رھا تھا ٹھیک اسی طرح راجو پولاد نے بھی دوسرے صوبے میں اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا ' اس نے دولت‌آباد کی شمالی سرحد سے لیکر گجرات تک اور دکھن کی طرف احمد نگر کے چھہ کوس کے گرد و نواح کا حصۂ ملک اپنے قابو میں کر لیا تھا - پولاد در اصل امیر سعادت خاں کا غلام تھا لیکن ابھنگ خاں کے کہنے میں آ کر اس نے دغابازی کی اور اپنے مالک کی جائداد پر قبضہ کر لیا - مغلوں کی فتح کے بعد اُس نے ایک نظام شاہی شہزادے ' مرتضیٰ کو جو تخت پر بٹھلایا جا چکا تھا اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا اور ضرورت کے مطابق اُسے کچھہ گاؤں اور اوسا کا قلعہ بھی دے دیا - تھوڑے ھی دنوں میں اُس نے آٹھہ یا نو ہزار سوار جمع کر لئے اور مغلوں کی چوکیوں پر چھاپا مارنے لگا ' جو کوئی ملتا اُسے لوٹتا اور کبھی کبھی تو ھاتھی ' گھوڑے اور باردانہ تک اُڑا لیجاتا '

مگر جب اُس نے عنبر کے عروج کو دیکھا تو اُس کے دل میں حسد کی اگ بھڑکنے لگی ' نتیجہ یہہ ہوا کہ دونوں کے درمیان نزاع پیدا ہو گئی اور ایک دوسری کی جان کا گاھک بن گیا ۔

ہوشیار خانخانان ابھی دکھن ہی میں تھا ' جب اُسے عنبر اور پولاد کے باھمی جھگڑوں کا پتہ چلا تو اُسکی سمجھ میں آیا کہ موقع اچھا ہے ' ایک ایک کر کے دونوں کو شکست دیکر اُنکی طاقت اور ترقی کی جڑ ہی کاٹ دینا چاہیے ' اس خیال کے ماتحت سنہ ۱۰۱۰ع میں خانخاناں نے ایک فوج اس مقصد سے بھیجی کہ تلنگانا کی سرحد پر جو عنبر کے مقبوضات ہیں قبضہ کر لے ' مغلوں کو شروع میں اپنے مقاصد میں کامیابی تو ہوئی لیکن عنبر نے جلد ہی اُن کو پسپا کر دیا ۔ اب خانخاناں نے اپنے بڑے بیٹے ایرج کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ عنبر کی تنبیہ کے لئے روانہ کیا ۔ ناندیر کے قریب دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی ' عنبر زخمی ہو کر گھوڑے پر سے گرپڑا ممکن تھا کہ وہ قید بھی ہو جاتا لیکن اس کے حبشی اور دکھنی غلام اُس کو میدان جنگ سے اُٹھا لیگئے ۔ تندرست ہو جانے پر اُس نے پھر فوج بھرتی کرنا شروع کر دی ' یہہ دیکھ کر خانخاناں نے اُس سے مصالحت کی سلسلہ جُنبانی شروع کی ' عنبر کو راجو کی طرف سے تو کھٹکا تھا ہی ' اس لئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر وہ خانخاناں سے ملنے گیا ' مغلوں نے اس کی مناسب طور پر خاطر و مدارات کی ' دونوں نے آپس میں صلح کر کے اپنے اپنے ملک کی سرحدیں طے کر لیں ۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد کچھ دکھنی سرداروں نے

عنبر کا ساتھ چھوڑ دیا اور مرتضی نظام شاہ سے مل کر اُسے اس امر کے لئے تیار کیا کہ وہ عنبر کو شکست دیے ' ان لوگوں نے اوسا کے قریب ایک فوج بھی جمع کی لیکن لڑائی میں عنبر ہی کی فتح رہی ' اور مرتضی کو صلح کرلینا پڑی ' اب تو نظام شاہ کٹھہ پتلی کیطرح عنبر کے قابو میں آگیا ' یہہ ۱۶۰۳ع میں اسکو لیکر پرندا کے قلعہ کیجانب بڑھا ' وہاں کے قلعہ کے محافظ منجھن خاں نے پھاٹک بند کرلیا اور یہہ پیام بھیجا کہ وہ مرتضی کو تو قلعہ میں آنے دیگا لیکن عنبر کو نہیں آنے دیگا ' کیونکہ وہ مغلوں سے ملا ہوا ہے ' ایک مہینہ تک یہہ کشاکش رہی ' آخر کار منجھن خاں قلعہ سے بھاگ گیا ' عنبر اس میں داخل ہوا اور وہیں مرتضی کو تخت پر بیٹھا یا ' اسکے بعد نظام شاہ اسی قلعہ میں رہنے لگا -

عنبر کا مخالف راجو برابر مغلوں سے لڑتا ہی رہا ' اسکے حملوں سے تنگ آکر ایک بار دانیال نے (جو اسوقت دکھنی مغل صوبے میں شہنشاہ اکبر کا نمایندہ تھا) ' راجو کو کہلا بھیجا کہ اگر مرد ہو تو میدان میں آکر لڑو ' اس دھوکے دھڑی سے کیا فائدہ - راجو نے جواب دیا کہ اگر میں میدان جنگ میں آکر تم سے لڑوں اور تمہاری فوج کو کچھہ نقصان پہونچ جائے تو تمہاری مدد کے لئے شہنشاہ اکبر دس گنی فوج اور بھیجدیگا لیکن اگر مجھے نقصان پہونچا تو بھلا میری مدد کو کون آئیگا ' میں تو مفت ہی میں مر مٹونگا ' لیکن میں اپنے طرز عمل سے باز نہ آونگا ' چاہے مجھے آگرے ہی تک کیوں نہ جانا پڑے - فرشتہ نے لکھا ہے کہ جب ۱۶۰۴ع میں شاہزادہ دانیال ' ناسک

اور دولت آباد کے واسطے ' احمد نگر کو عادل شاہ کي لڑکي سے بیاہ کرنے جارھا تھا اس وقت اس نے راجو سے صلح کا ارادہ کیا ' اسکے انکار کرنے پر ' اسے سزا دینے کے لئے ایک مغل فوج بھیجدی گئي ' جس سے ڈرکر راجو اپنے ملک کو فرار ہوگیا ' لیکن رفیع‌الدین‌شیرازي کا قول اس سے مختلف ھے ' اسکي راے کے مطابق راجو اور دانیال کے درمیان صلح ہوگئی اور یہہ طے ھوا کہ کچھہ مقامات کی مالگذاري دونوں نصف نصف تقسیم کرلیا کریں ' اس معاھدے کی تکمیل کے لئے ھر مقام پر مغل اور راجو دونوں کے نمایندے کام کرتے تھے - کہنے کا مطلب یہہ ھے کہ راجو کي قوت اور شُہرت روز بروز بڑھتي جارھی تھی -

یہہ دیکھکر مرتضی کے بھي جي میں آیا کہ اسکي مدد سے وہ عنبر کي سرکردگی سے کسي طرح چھٹکارا پاجائے ' چنانچہ راجو کے پاس اُس نے عنبر کی شکایتیں لکھہ بھیجی ' اور اسکو اپنے پاس بلایا - راجو تو اس موقع کا منتظر ھي تھا فوراً پرندا جاپہونچا اور عنبر کو نیست و نابود کرنے کي اجازت حاصل کر لی ' اُن دونوں کے درمیان کئي لڑائیاں ہوئیں لیکن عنبر ھی کی ھر بار شکست ھوئی - مجبور ھو کر خانخاناں سے اسنے مدد کي التجا کي اور مغل فوج کی مدد سے راجو کو دولت آباد بھیجنے کے لئے مجبور کر دیا - اسی اثناء میں شہزادہ‌دانیال کا برھان پور میں انتقال ھو گیا جسکی وجہہ سے خانخاناں کو جالنا پور سے برھان پور آنا پڑا - اب انتقام کے خیال سے عنبر نے ایک بڑي فوج جمع کی مگر خانخاناں کے کہنے سے اسنے راجو سے صلح کرلی -

پرندا پہونچکر عنبر کو معلوم ہوا کہ راجو کي کارروائی
میں بہت کچھہ مرتضیٰ کا ھاتھہ تھا ؛ یہہ معلوم کرکے اُسے
بہت غصہ آیا اور اسنے اُس جگہہ سے اسے علحدہ کر دینے کا
ارادہ کر لیا ' مگر عادل شاہ کے کہنے سے اسکو عملی صورت نہیں
دي - اب عنبر کی زندگي میں ایک نئے باب کي ابتدا ہوئي'
عادل شاہ اور خانخاناں دونوں نے یہہ سمجھہ لیا کہ وہ ہونہار
سپاھي ھے - خصوصاً عادل شاہ تو اسکی بہادری اور کار گذاری
کو دیکھہ کر بہت ھی معتقد ہو گیا تھا - روز بروز اس سے
تعلقات بڑھانے لگا - ایک دور اندیش سیاست داں کیطرح اُسے اس
بات کا پورا یقین ہو گیا کہ اسکی سلطنت کی مستقبل میں
حفاظت کی ایک ھي تدبیر ھے وہ یہہ کہ وہ احمد نگر کے بیجان
جسم میں ازسرنو روح پھونکنے کا انتظام کرے ' اس مقصد کي
تکمیل کیلئے اُس کو عنبر ھي ایک موزوں شخص معلوم ہوا
اسي لئے عادل شاہ نے اُس کو یہہ صلاح دی کہ وہ مرتضیٰ سے
بجائے مخالفت کے دوستی بنائے رکھے ' کیونکہ اگر احمد نگر کی
شہرت و ناموری کے احیاء کا اگر کوئي انتظام تھا تو مرتضیٰ ھي
کے نام کے بل پر تھا ' اسلیے عنبر مرتضیٰ کو لیکر جُنّیر پہونچا
اور وھاں نظام شاھی جھنڈا ازسرنو بلند کردیا ' اپنے مالک کو
زیادہ یقین دلانے کے لئے اُسنے اپني لڑکي کا اسکے ساتھہ عقد
بھی کر دیا - اس میں ایک خفیہ چال یہہ بھي تھي کہ ابھي
تک تو اسکی حیثیت ایک غلام کی تھی ' لیکن اب اسکا
رشتہ شاھی خاندان سے ہو گیا اور وہ امیروزیر کا خطاب بے
تکلف اختیار کرسکتا ھے - یہہ بات اس صدي میں غیر اھم
معلوم ہوتی ھے لیکن ھندوستان کے قرون وسطیٰ میں اسکی جو

اہمیت تھی اُسکی پوری تشریح کرنا یہاں غیر ضروری ہوگا، عنبر اب چنگیز خانی یا ابہنگ خانی عنبر نہیں رہا -

عادل شاہ نے عنبر کو صرف اچھی رائے ہی نہیں دی بلکہ اُسکی حیثیت کو زیادہ مضبوط کرنے کے لئے قندھار کا قلعہ بھی اُسے سپرد کر دیا، اس نظر عنایت کے لئے شکرے کے ساتھ عنبر نے عادل شاہ کو لکھا کہ "جب تک میرے جسم میں جان ہے، میں مغلوں کی مخالفت کروں گا، ممکن ہے کہ اُنہیں دکھن سے نکال بھی دوں" - یہہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عنبر نے اس عہد کو جی جان سے نباہا - قندھار کے ملتے ہی، عنبر کو اب اس بات کی عجلت ہوئی کہ کسی طرح راجو کا کام تمام کردے، اُس نے فوراً ہی ایک فوج راجو کو شکست دینے کے لئے بھیجی، بڑی کوششوں کے بعد دشمن گرفتار کیا گیا اور اُس کو قتل کر ڈالا گیا - اب تمام احمد نگر میں عنبر کا طوطی بولنے لگا، اور اب اُسی کا بول بالا تھا -

اسی زمانے میں شہنشاہ اکبر کا اگرہ میں انتقال ہو گیا، اس سانحہ کے ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد یعنی ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۶۰۵ع کو سلطان سلیم تخت سلطنت پر بیٹھا اور اُس نے نورالدین جہانگیر کا لقب اختیار کیا، انتظام سلطنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اکبر کے جو حوصلے تھے وہی اب جہانگیر کے مقاصد قرار پائے، صرف فرق اتنا تھا کہ نہ تو مرحوم شہنشاہ کا سا حوصلہ کسی میں تھا اور نہ ویسی صلاحیت کار - تھوڑے ہی دنوں کے بعد جہانگیر نے خانخاناں کو دکھن سے بلا لیا، خانخاناں کا جانا تھا کہ عنبر اور بھی آزاد ہو گیا، اب وہ بے خوفی سے

اپنا کام کر سکتا تھا ' پہلے تو اُس نے اس امر کا انتظام کیا کہ دولت‌آباد کو پھر سے آباد کرے ' مغلوں کے لگاتار حملوں اور مرہٹہ سرداروں کي غارتگري کے باعث یہہ خوشحال شہر بالکل ویران ہو گیا تھا ' عنبر نے یہاں کے نظام حکومت اور تحفظ کا ٹھیک ٹھیک بندوبست کیا اور یہاں کی رعایا کو ہر طرح کی آسانیاں بہم پہونچائیں ' اُن کو اس بات کا یقین دلانے کی بھی کوشش کی کہ وہ بے کھٹکے اس شہر میں رہ سکتے ہیں ' چنانچہ بہت جلد دولت‌آباد میں پہلے کي سی رونق آگئي ' صرف یہي نہیں بلکہ چاروں طرف کا ملک بھي عنبر کے ہاتھہ لگ گیا اور لوگوں کو صاف صاف معلوم ہونے لگا کہ احمد نگر کي سوئي ہوئي قسمت دوبارہ جاگ اُٹھي ہے - دو برس کے اندر اُس نے مغلوں کے ہاتھہ سے احمد نگر کي پوري ریاست واپس لے لي -

مجبوراً جہانگیر نے دوبارہ خانخاناں کو دکھن کي طرف روانہ کیا اور اُس کو تاکید کر دی کہ فوراً هی عنبر کي بڑھتي ہوئي طاقت کو دبا دے ' عنبر نے اپني کارروائیوں سے مغلوں کو ناراض کر هي دیا تھا اِس لئے اُس کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ عادل شاہ سے اپنی دوستی اور مضبوط کرے ' چنانچہ اس نے یہہ تجویز عادل شاہ کے پاس بیجاپور میں بھیج کر کہ اگر بادشاہ مناسب سمجھے تو اپنے کسی امیر کی لڑکي ؛ ساتھہ اُس کے بیٹے کا عقد کرا دے . عادل شاہ نے اس کو قبول کر لیا اور یاقوت خاں حبشي کي لڑکی کا عقد عنبر کے بیٹے عزیزالملک کے ساتھہ کردیا ' برات بیجاپور گئی ' چالیس روز تک هاں خوب جشن رها ' دولہا ' دولہن کا خیر مقدم احمد نگر

نئے دارلسلطنت جُنّیر میں فروری سنہ ۱۶۰۹ع میں کیا گیا - یہہ عنبر اور عادل شاہ کی جانب سے خانخاناں اور جہانگیر کو ایک طرح کا اعلان جنگ تھا - خانخاناں نے کوشش تو بہت کی لیکن اپنے ' ماتحت افسروں کو قابو میں نہ رکھہ سکا اس لئے عنبر کے خلاف کچھہ کرتے دھرتے نہ بن پڑا -

جہانگیر نے اس مقصد کے لئے کہ سرکاری عمال میں زیادہ اتفاق ہو جائے کا سنہ ۱۶۱۰ع میں امیرالامرا ' مرزا شریف ' آصف خاں ' جعفر بیگ اور شاهزادۂ پرویز کو دکھن کے صوبے میں بھیجا - ان لوگوں کے آنے کے بعد اپنی آزاد رائے کے مطابق خانخاناں نے برسات کے زمانے میں دشمن پر حملہ کر دیا ' لیکن اپنے ساتھہ کھانے پینے کا کافی سامان نہیں لیا ' بھلا عنبر اس موقع سے فائدہ اُٹھانے میں کب چوک سکتا تھا - مغلوں کو دھوکا دیکر گھاٹیوں میں بہکا لے گیا اور وہاں اُن کو ' گرسنگی کا شکار بنا دیا - تمام افسران فوج خانخاناں سے ناخوش ہوگئے اور اس پر دغابازی اور ناقابلیت کا الزام لگانے لگے - در اصل مغلوں کو اس ناعاقبت اندیشی سے نقصان بھی بہت پہونچا - احمد نگر کا قلعہ اُن کے ہاتھہ سے نکل گیا ' آصف خاں شہنشاہ کو لکھہ ہی چکا تھا کہ بغیر آپ کی موجودگی کے کچھہ کام نہیں کر سکتا جب جہانگیر نے یہہ تجویز اپنی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کی تو خان جہاں لودی نے کہا کہ آپ کے جانے کی ضرورت نہیں ' میں بیڑا اُٹھاتا ہوں کہ اس کام کو پورا کئے بغیر میں منھہ نہ دکھاؤں گا -

جہانگیر اسکی باتوں میں آگیا اور اُسے دکھن روانہ کر دیا -

خاں جہاں نے دکھن پہونچتے ہی جہانگیر کو لکھ بھیجا کہ جب تک خانخاناں یہاں رہے گا کوئي کام نہیں بن سکتا۔ شہنشاہ نے فوراً ہی خانخاناں کو واپس بلا لیا اور خانجہاں کي کار گذاري کی تعریف کرنے لگا -

خانجہاں نے ایک بڑی اہم تدبیر سونچي یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت کیطرف سے اسکی تحریک ہوئی کہ عبداللہ خاں گجرات سے چل کر ناسک اور ترمبک کی طرف سے اور خانجہاں اور مان سنگھ وغیرہ ' برار اور خاندیش کی جانب سے احمد نگر میں داخل ہوں اور چاروں طرف سے دشمن کو گھیر کے اسکو بالکل نیست و نابود کردیں - تدبیر تو بہت عقلمندي کي تھی لیکن عبداللہ خاں کی سُستي کے باعث ناکامیاب رہی ' شکست کا حال سنکر جہانگیر بہت ناخوش ہوا ' اسلیے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ خود جاکر کام پورا کرے لیکن پھر یہہ ارادہ فسخ کر دیا خانخاناں کي قابلیت اور اسکي قدر و قیمت اب لوگوں کو معلوم ہوئی اور وہ دوبارہ دکھن روانہ کیا گیا - جب وہ ۱۶۱۲ع میں دکھن پہونچا تو اسکے لئے میدان صاف تھا ' جعفر بیگ ' آصف خاں ' اور شریف دونوں ' مرچکے تھے -

عنبر اس زمانے میں بڑی آفت میں تھا ' حبشی اُمرا ایک ایک کر کے سب اسکے خلاف ہوتے جارہے تھے - خانخاناں بڑی چالاکی سے اس باہمی رنجش کی آگ کو مشتعل کر رہا تھا یہاں تک کہ امیروں نے سپہ سالار اخلاص خاں تک کو قید کر لیا اور مرتضی سے کہا کہ عنبر کو اسکے عہدے سے گرا کے کسی دوسرے قابل آدمی کو پیشوا و کیل مقرر کرے - ان لوگوں نے

ادھر شاھزادۂ پرویز اور خانخاناں کے پاس بھی مرفداشتیں بھیجیں - اُن میں سے کچھ کو خانخاناں نے اچھی جاگیریں دیں اور کچھ کو اچھے منصب دئے ' اپنی طاقت کو کمزور ہوتے دیکھ کر عنبر نے عادل شاہ سے درخواست کی کہ وہ ملّا محمد لاری کو بھیجدے کہ وہ آکر آپس کے نفاق کو مٹائے - ملّاجی تشریف تو لائے لیکن جس غرض سے بلائے گئے تھے وہ پوری نہیں ہوئی ' بلکہ عنبر کی فوج پر انکی موجودگی کا اُلٹا ھی اثر پڑا ' حبشی امرا تو لالچ میں پڑے تھے وہ بھلا کیونکر کہنا مان سکتے تھے ' دوسرے جب انہوں نے دیکھا کہ ملّا جی اور مغل سپہ سالار میں دوستی ہے تو وہ اور بھی بے خوف ھوگئے ' یہہ بات دیکھکر عنبر کو بھی شبہہ ہونے لگا اور اسنے عادل شاہ کو لکھ بھیجا کہ ملا جی کو بلا لیں ' کہتے ھیں کہ جب ملاجی واپس جارہے تھے تو راہ میں ' مغل سپہ سالار شاہ نواز خاں اور اسکے بھائی داراب خاں نے پالکی کے قریب آکر اُن کو سلام کیا ' اس تعظیم و تکریم کا معاوضہ ملّا جی کو بیجا پور پہونچکر ادا کرنا پڑا ' وھاں اُنکی سب جاگیریں ضبط کرلی گئیں اور وہ دو برس تک بیکار بیٹھے رہے ' یہہ سب عنبر کو خوش کرنے کے لئے کیا گیا تھا -

باقی حبشی امرا ' روزانہ مغل نائب سپہ سالار سے یہی تجویز کرتے تھے کہ وہ عنبر سے جنگ شروع کردے - بہت غور و فکر کے بعد شاہ نواز خاں نے یہہ بات مان لی اور احمد نگر میں داخل ہوا ' لوٹتا جھگڑتا پٹن تک تو پہونچ ھی گیا یہاں اُسنے پڑاو ڈال دیا - جلد ھی جاسوسوں نے آکر خبر دی کہ عنبر بھی چالیس ہزار

کا ایک جم غفیر لئے ہوئے اُسی طرف بڑھا چلا آرہا ہے -
شاہنواز کا پڑاؤ بہت ہی محفوظ جگہہ پر تھا کیونکہ اس کے
اور غنیم کے فوج کے درمیان دریا حائل تھا اس لئے وہ ذرا
بھی خوف زدہ نہیں ہوا - دوسرے دن عنبر آہی پہونچا -
بہت ہی گھمسان لڑائی ہوئی عنبر کی فوج تتر بتر ہوگئی اور
خود اُسے بھی میدان سے بھاگنا پڑا - غنیم نے کھرکی پر جو اب
نظام شاہی دارالسلطنت تھا حملہ کر دیا - اور وہاں کے تمام
شاہی عمارات کو مسمار کر ڈالا - غریب عنبر یہہ سب دیکھتا
رہا - ایسی حالت میں کرہی کیا سکتا تھا - اِس موقع پر مصنف
تذکرۃالملک بھی احمد نگر میں عنبر کی فوج میں موجود تھا
اس نے یہہ تمام تفصیلات بیان کئے ہیں - مغلی حملہ اور امرا
کے بغاوت کا نتیجہہ یہہ ہوا کہ نو اصلاح شدہ ریاست کے ہاتھہ
سے ملک کا بہت سا حصہ نکل گیا - اور مغلوں کا جھنڈا
لہرانے لگا - خانخاناں بھی اب اپنا سر بلند کرسکتا تھا -

احمد نگر کی وقتی بربادی ہو ہی رہی تھی کہ شاہزادۂ
خُرم بھی اپنی فوج لیکر دکھن آپہونچا - بیجا پور اور گولکنڈہ
نے ڈرکر صلح کرلی - مجبور ہو کر عنبر نے بھی اپنا سر
جھکا دیا - چڑھتی ہوئی آندھی کے سامنے کون اپنی جان
دیتا لیکن شاہزادے کے واپس جانے کے بعد عنبر نے پھر اپنی
چالیں شروع کر دیں سنہ ۱۶۲۰ع میں اُس عہد کو جو
چار برس پہلے مغلوں کے ساتھہ ہوا تھا عنبر نے توڑ ڈالا -
احمد نگر اور برار کا زیادہ حصہ ازسر نو اس کے ہاتھہ آگیا اور
مغلوں کو منھہ کی کھانی پڑی - خانخاناں تو بہت

هی شرمندہ ہوا یہاں تک کہ رو پڑا - جہانگیر کو لکھ بھیجا کہ اگر جلد مدد نہ آئی تو میں جان دیدوں گا - لاچار ہوکر شہنشاہ نے شاہ جہاں کو دوبارہ دکھن بھیجا - آتے هي اُس نے میدان مارا - بیجاپور اور گول کنڈہ کو توڑ کر اپنی طرف ملا لیا اور عنبر کو اکیلا کر دیا - آخر کار ۱۶۲۱ع میں تینوں ریاستوں نے صلح کر لی اور بیجا پور نے اٹھارہ لاکھ گول کنڈہ نے بیس لاکھ اور احمد نگر نے بارہ لاکھ روپیہ خراج دینا منظور کیا - اس کے کچھ عرصہ بعد شاہ جہاں نے اپنے باپ کے حکم کے خلاف ورزي کي اور باغي هو گیا - اس موقع پر عنبر نے جو پالیسي برتي اُس کا تفصیلی حال ڈاکٹر بینی پرشاد کی کتاب " جہانگیر " میں موجود ہے یہہ تحریک احمد نگر کے لئے مفید هي ہوئي کیونکہ جب سلطنت کي ساري طاقت شاہ جہاں کو شکست دینے میں لگي ہوئی تھی اس وقت عنبر کو اپنے زائل شدہ اقتدار کے دوبارہ حاصل کرنے کا اچھا موقع مل گیا - احمد نگر کي آزادی کا جھنڈا پھر سے لہرانے لگا اِسي لئے وہ عنبر کا مرھون منت تھا - اس نے ایک طرف تو بیجا پور کو نیچا دکھایا اور دوسری طرف مغرور شاهزادہ شاہ جہاں کو پناہ دے کر اپنی فراخ دلي کا ثبوت دیا - اس طرح اُس نے ساري زندگي احمد نگر هي کی خدمت میں صرف کي اور اُس کو دوبارہ زندہ کرکے ۱۶۲۶ع میں انتقال کیا - سچ تو یہہ ہے کہ دکھن کي تاریخ میں اُس کا نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے -

(ترجمہ)

کچھه بکھرے هوئے ورق

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم - اے - پی - ایچ - ڈی)

کئي برس هوئے کچھه پراگندہ ورق بلگرام کے ایک گھرانے سے هاتھ آئے - اُن کے ساتھ ایک مجلد مجموعہ تھوڑے سے خطوں اور متفرق شعروں وغیرہ کا بھی تھا -[1] دیکھنے پر معلوم هوا کہ بعضی چیزیں نایاب ' مگر افسوس کہ نا مکمل ' هیں - بہت دنوں کوشش جاری رهي کہ کھوئے هوئے ورقے مل جائیں ' مگر کامیابي نہ هوئي - اِن پریشان ورقوں اور مجلد مجموعے میں فارسي اور اُردو کے مکتوب اور شعر ملے جلے هیں -[2] مرزا غالب کي بھی بعض تحریروں کی نقلیں اِن میں هیں - کہیں کہیں کتابت کی تاریخ بھي درج هے - یہ تاریخیں ۱۹ اپریل ۱۸۶۵ع سے لے کر ۲۳ اکتوبر ۱۸۷۹ع تک کي هیں - اِس لیے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ هو گا کہ جن تحریروں پر

---

۱ - یہ سب چیزیں شیخ امیر احمد صاحب " رسوا " خلف شیخ لطیف احمد عثمانی " لطیف " بلگرامی کي مہربانی اور دریا دلي سے مجھه تک پہنچیں ' ان کا شکریہ اِس مقام پر بھي ادا کیا جاتا هے - " لطیف " بلگرامي کا ذکر آگے آتا هے - (ص) -

۲ - اِس مضمون میں صرف اُردو کي چیزوں کا ذکر کرنا مقصود هے - فارسي

کوئي تاریخ نہیں ہے وہ بھی غالباً اِسی چودہ برس کے عرصے میں کسي وقت ' یعنی غالب کي اخیر زندگی میں یا اُن کے مرنے کے تھوڑے هي دن بعد ' لکھی گئی تھیں -

اِس سارے مواد پر نظر ڈالنے سے معلوم هوتا هے که لکھنؤ کے مضافات میں بھي غالب کی زندگي هي میں اُس کي نظم و نثر کا ایسا کچھ چرچا تھا که اگر سعدي کي طرح غالب بھي یہ کہتا تو بیجا نہ هوتا کہ :—

" قصب الجیب حدیثش چون نیشکر مي‌خورند و رقعهٔ منشآتش همچو کاغذ زر مي‌برند - "

بلگرام کے دو نہایت سربرآوردہ شاعر ' سید فرزند احمد " صفیر " اور میر غلام حسنین " قدر " کہ دونوں نحو اور عروض وغیرہ کے بڑے ماهر تھے ' لکھنؤ کے اُس زمانے کے نامي اساتذہ کي شاگردي کرنے کے بعد غالب کی طرف رجوع هوئے تھے - اِس لیے کوئي اچنبھے کي بات نہیں کہ بلگرام اور اُس کے قرب و جوار کے ادبی حلقوں میں " غالب ' غالب " کا آوازہ بلند تھا ' اور لوگ نہ صرف شعر میں بلکہ اُردو کي انشاپردازی اور خاص کر خطوط نویسی میں غالب کا تتبع کرنے میں کوشاں تھے - قدر اور صفیر کے علاوہ بعضے اور بلگرامیوں کو بھی غالب سے تلمذ تھا - اِن میں ایک شیخ لطیف احمد " لطیف " بلگرامي تھے - اِن کے نام ایک خط " مکمل اُردوے معلی " میں ملتا هے [۱] جس میں غالب اپنی پیرانہ‌سالي کا عذر کر کے " لطیف "

---

۱ - " مکمل اُردوے معلیٰ ' (لاهور ۱۹۲۳ ع) ص ۴۱۹ - (ص)

کو ہدایت کرتے ہیں کہ سید ابن حسن خاں[1] یا " قدر " سے اصلاح لیا کریں - جس ذخیرے کا یہاں ذکر ہے وہ اِنہیں لطیف احمد کا جمع کیا ہوا ہے اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اِن کے بیٹے سے مجھے ملا - اس میں اکثر چیزوں کی کتابت " قدر " کے سرمایۂ ناز شاگرد اور " لطیف " کے دوست اور پھر بھائی ' شیخ خلیل احمد ' وجد " بلگرامی کے قلم سے ہوئی ہے - " وجد " کا خط بہت اچھا تھا اور " لطیف " اور اور احباب کی فرمائش سے اکثر چیزوں اور خصوصاً " غالب " کی تحریروں کی نقلیں کردیا کرتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ بلگرام کے ادیبوں میں " غالب " کے رقعوں کی بڑی مانگ تھی اور خطوط نویسی میں وہی ڈھنگ اختیار کرنے کی کوشش اکثر لوگ کرتے تھے -

منتشر ورقوں میں جو چیزیں کام کی ہیں ' اُن کی تفصیل یہ ہے :—

(الف) پانچ ورق (تقطیع : سوا ۵ × ساڑھے ۳ انچ ' خط : نستعلیق شفیعا آمیز) - پہلے پانچ صفحوں میں مختلف فارسی شاعروں کے متفرق شعر ہیں - ص ۶ سے ص ۹ تک غالب کے دو خطوں کی نقل ہے - یہ دونوں خط " اُردوے معلیٰ " میں شامل ہیں مگر کسی قدر اختلاف کے ساتھ -

(ب) سات ورق (تقطیع اور خط وہی) - ص ۱—۸ اور ص ۱۳—۱۸ ؛ باقی ورق نہیں ملے - پہلے صفحے پر

---

۱ - یہ غالب کے شاگرد نہ تھے - (ص) -

گل‌کاری ' سیاہ قلم سے ؛ جدولیں سیاہ اور سرخ ؛
سوا '' بسم‌اللہ الرحمن الرحیم '' کے کوئی عنوان
نہیں — باقی صفحوں پر جدولیں کالی ' عنوان اور
اہم لفظ یا فقرے لال روشنائی سے ؛ صفحوں پر ہندسے
لگے ہوئے - یہ اُن خطوں کی نقل ہے ' جو
غالب نے قدر بلگرامی کے فارسی مسودوں کی اصلاح
کے سلسلے میں یا اُن کے ادبی استفساروں کے جواب
میں اُنہیں لکھے تھے - یہ بھی شبہہ ہوتا ہے کہ
بعض باتوں کو ' جو غیر متعلق سمجھی گئیں '
غالباً '' قدر '' کی رائے سے کاتب نے حذف کر
دیا ہے - یہ پانچ خطوں کی نقل ہے - اُن میں سے
بھی آخر کے تین خط ' کچھ ورقوں کے کھو جانے
سے ' ناقص ہیں -[۱]

(ج) ایک ورق (تقطیع ' پہلے صفحے کی گلکاری ' خط وغیرہ
ب کا سا ' جدولیں سب سرخ -) بسم‌اللہ کے بعد کا
عنوان یہ ہے :—'' تقریظ مترشح قلم نواب والا
نجم‌الدولہ میرزا محمد اسداللہ خاں غالب
مدظلہ '' -

یہ رجب علی بیگ '' سرور '' کی کتاب '' گلزار سرور '' کی تقریظ

---

۱ — '' مکمل اُردوے معلیٰ '' کے ضمیمے میں '' قدر '' کے نام کے ۱۷ خط
درج ہیں جن میں یہ ۵ خط شامل ہیں مگر متن میں کہیں کہیں
اختلاف ہے - (س) -

ہے جو آخر سے ناقص ہے - دوسرا صفحہ اِن لفظوں پر ختم ہوتا ہے :
" .... جس نے میرے دعوے کو" - اِسی تقریظ کی ایک پوری
نقل مجلد مجموعے میں موجود ہے ' جو "وجد" نے اپنے
۲۰ جولائی ۱۸۶۷ء کے خط کے ساتھ "لطیف" کو بھیجی تھی -
اِس کی کیفیت یہ ہے :—

ایک ورق (تقطیع ۸ ایک بٹے ۸ × ۵ انچ ; خط شفیعا) -
کل ۲۲ سطروں میں تقریظ کی نقل تمام ہوئی ہے - آخر میں
یہ عبارت ہے : "جلدی میں لکھا ہے ' قصور غلطی معاف ۱۲
خلیل احمد" - باوجود اِس معذرت کے متن صحیح ہے -
اِس کے ساتھ جو خط "لطیف" کو بھیجا تھا اُس کے آخر میں
یہ فقرہ ہے : "غالب مدظلہ کی نثر اِس خط میں لپیٹتا ہوں اور
حضور[1] کو جب لکھوں گا تو حضور کو بھی نقل اُس کی بھیجوں گا -
ابھی عدیم الفرصتی مانع تحریر ہے ۱۲ خلیل احمد....۲۰ جولائی
سنہ ۱۸۶۷ء"[2] -

(د) ایک ورق (تقطیع ' خط وغیرہ ب کا سا) اول سے
ناقص - کل بارہ سطریں - اخیر سطر کے نیچے :
"اضعف الناس عباس" دستخط کی شان لیے ہوئے -
یہ ظاہرا مفتی سید محمد عباس کے اُس خط

---

۱ - غالباً عبدالبصیر "حضور" بلگرامی مراد ہیں - (ص) -

۲ - ایک اور خط (۸ ستمبر ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا) یوں شروع ہوتا ہے :
"حضرت سلامت ' لیجیے ' نقل خط و چند اشعار قصائد متفرقۂ مرزا نوشاہ صاحب
اِس خط میں لپیٹتا ہوں" - یہ خط اور اشعار فارسی کے ہیں - (ص) -

کا ٹکڑا ہے جو منشی صاحب نے "قاطع برہان"
کی رسید میں غالب کو لکھا تھا اور جس کا جواب
"اُردوے معلیٰ" میں داخل ہے ۔

اِن چاروں نسخوں کا متن ذیل میں دیا جاتا ہے - جہاں کہیں "اُردوے معلیٰ" کا متن صحیح تھا اُس کے لفظ شامل کر لیے گئے ہیں مگر ایسے تمام لفظ یا عبارتیں کھلی‌دار خطوں کے اندر رکھی گئی ہیں - جو لفظ یا عبارتیں قلمی نسخے میں زائد یا مطبوعہ سے مختلف ہیں وہ مطبوعہ نسخے سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہو سکتی ہیں --

(الف) ص ۶—۷— (مکمل اردوے معلیٰ ' ص ۷) -

ستودہ بہر زبان و نامور بہر دیار نواب صاحب شفیق کرم گستر عالی[1] تبار [نواب میر غلام بابا خاں بہادر کو مسرت بعد مسرت و جشن مبارک و ہمایوں ہو] - رقعۂ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی - بسواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی - پانؤوں سے اپاہج ہوں ' کانوں سے بہرا ؛ ضعف بصارت ' ضعف دماغ ' [ضعف دل '] ضعف معدہ ' اِن سب ضعفوں پر ضعف طالع - کیونکر قصد سفر کروں ' تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں ؟ گھنٹے بھر میں دوبار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے ؛ ایک ہفتے [دو ہفتے] کے بعد قولنج دوری کی شدت ہوتی ہے ؛ طاقت جسم میں ' حالت جان میں نہیں - آنا میرا سورت تک کسی صورت حیز امکان میں

---

۱ - [" اردوے معلی " : " مصطفوی " - (م)]

نہیں - زندگی[1] کی توقع آگے مہینوں پر تھی، اب دنوں پر ہے مبالغہ نہیں بالکل میرا یہ ہی حال ہے - إنا للہ وإنا إلیہ راجعون - اپنی مرگ کا طالب غالب -

(الف) ص ۷—۹— (مکمل اردوے معلیٰ، ص ۴۸) -

صاحب، تمہارا خط آیا : میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا - [امراو سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے -] اللہ اللہ، ایک وہ ہیں کہ دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے - اُس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے ؟ [وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے وہ حکیم سنائی کا ہے اور وہ نقل " حدیقہ " میں مرقوم ہے الخ -]

بس اب تم سکندر آباد میں رہے : کہیں اور کیوں جاؤگے - بنگھر کا روپیہ اُٹھا چکے ہو[2] اب کہاں سے کھاؤ گے ؟ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے نہ تمہارے سمجھنے کی جگہہ ہے - ایک خرچ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے :

---

۱ - " زندگی ۔۔۔۔ غالب " - اِس ٹکڑے کی جگہ " اردوے معلیٰ " میں اور عبارت ہے - یہ غالباً اسی دوسرے خط کا اخیر حصہ تھا جو غلطی سے اِس میں شامل ہو گیا - (ص)

۲ - قلمی نسخے میں " ہے " ہے، جو ظاہرا کتابت کا سہو ہے - (ص)

اختیار ہو تو کچھ کیا جائے ' کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے مرزا عبدالقادر " بیدل " خوب کہتا ہے :-

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام
زین ہوسہا بگذر یا مگذر ' می‌گذرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید ' نہ رنجور ہوں نہ تندرست ' نہ خوش ہوں نہ ناخوش ' نہ مردہ ہوں نہ زندہ ؛ جیے جاتا ہوں ' باتیں کیے جاتا ہوں : روٹی روز کھاتا ہوں ' شراب کبھی کبھی پیتا ہوں - جب موت آئے گی مر رہوں گا - نہ شکر ہے نہ شکایت ہے ؛ جو تقریر ہے برسبیل حکایت ہے - بارے ' جہاں رہو خوش رہو ' جس طرح رہو ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو - یکشنبہ ۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ع -

(ب ، ص ۱-۸- (مکمل اردوے معلیٰ ' ص ۴۰۲)

بندہ پرور آپ کے عنایت نامے کے آنے سے تین طرح کی خوشی مجھ کو حاصل ہوئی : ایک تو یہ کہ آپ نے مجھ کو یاد کیا دوسرے آپ کی طرز عبارت مجھ کو پسند آئی ' تیسرے آپ حضرت علامہ جلیل اور آزاد مغفور کی یاد گار ہیں اور میں اُن کے حسن کلام [کا] معتقد - خواہش آپ کی ' کیا ممکن ہے کہ مقبول نہ ہو - جب مزاج میں آئے آپ نظم و نثر بھیج دیں ' میں دیکھ کر بھیج دیا کروں گا اور آرائش گفتار میں کوشش دریغ نہ ہوگی - بارہ برس کی عمر سے کاغذ ' نظم و نثر میں ' مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کررہا ہوں -

باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس[1] اِس شیوے کی ورزش میں گزرے ۔ اب جسم و جان میں تاب وا تواں نہیں ۔ نثر فارسی لکھنی یکقلم موقوف ؛ اردو، سو اُس میں بھی عبارت آرائی متروک ؛ جو زبان پر آئے وہ قلم سے نکلے ۔ پانو رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر، کیا لکھوں اور کیا کروں ؟ یہ شعر اپنا پڑھا کرتا ہوں :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے، دکھلائیں کیا ؟

آپ ملاحظہ فرمائیں، ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں ؟ اور کی فیض‌رسانی اور قدردانی کو کیا روئیں ؟ اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں ۔ تباہی ریاست اودھ نے، باآنکہ بیگانۂ محض ہوں، مجھ کو ۔ اور بھی افسردہ دل کر دیا ؛ بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ‌دل نہ ہوئے ہوں گے ۔ اللہ اللہ ہے ۔ کل آپ کا خط آیا، آج میں نے جواب لکھا، تاکہ انتظار جواب میں آپ کو ملال نہ ہو ۔ والسلم ۔
از اسداللہ ۔ نگاشتۂ بست‌وسوم فروری سنہ ۱۸[۵۷] عیسوی ۔[2]

---

۱ - قلمی نسخے میں ہے : " ستہتر (۷۷) برس کی عمر ہوئی پینسٹھ برس ...." مگر یہ صحیح نہیں - (ص)

۲ - قلمی نسخے میں " ۱۸۸۵ " ہے، جو صحیح نہیں ہوسکتا ۔ " مکمل اردوے معلی " میں " ۱۸۵۷ " ہے ۔ یہ غالباً صحیح ہے ؛ اِس لیے کہ یہ خط اودھ کے التزام سلطنت (۱۸۵۶م) کے بعد، مگر غدر سے غالباً کچھ دن

خط دوم - آغاز اصلاح مسودہ ۔

حضرت، میں نے چاہا کہ حکم بجا لاؤں اور عبارت کو اصلاح دوں، مگر میں کیا کروں ؟ آپ غور کریں کہ اصلاح کی جگہ کہاں ہے ؟ اگر بمثل آپ خود نظر ثانی میں کوئی لفظ بدلا چاہیں، تو ہرگز جگہ نہ پائیں - جس کاغذ پر اصلاح منظور ہوتی ہے، تو بین السطور زیادہ چھوڑتے ہیں - جب اس عبارت کو اور کاغذ پر نقل کروں، تب حک و اصلاح کا طور بنے ۔ میرا کام اصلاح عبارت ہے، نہ کتابت -

'' زردشت آتشکدہ الخ '' - زردشت کو آتشکدے سے وہ نسبت نہیں جو ساقی کو میخانے سے - زردشت بہ اعتقاد مجوس پیغمبر تھا ۔ آتشکدے کے پجاری کو '' موبد '' اور '' ہیر بد '' کہتے ہیں - '' آب حرام اشتیاق '' '' آب حرام '' شراب کو محل مناسب پر کہیں تو کہیں، ورنہ '' نبیذ '' اور '' رحیق '' اور '' قرقف '' اور '' راوق '' کی طرح اسم نہیں ۔ ناچار '' شراب شوق '' یا '' بادۂ شوق '' لکھنا چاہیے - '' اشتیاق '' سے '' شوق '' بہتر ہے ۔

'' ماہم دوسہ جامگی علی التواتر زدہ بودم '' ۔ ['' ما زدہ بودم ''۔]
تمہارا دل اس ترکیب کو قبول کرتا ہے ؟ '' من زدہ بودم '' یا '' مازدہ بودیم '' ۔ اس کے علاوہ '' دوسہ جامگی ؟'' بکاف فارسی یعنی چہ ؟ '' جام '' معلوم، کاف تصغیر کا : '' جامک '' چاہیے -

---

پہلے لکھا گیا ہے، جبکہ '' قدر '' لکھنؤ سے بلگرام آگئے تھے - دیکھو '' کلیات قدر '' ترجمۃ المصنف ص ۱-۲ اور رسالۂ '' ذخیرہ '' حیدر آباد ج ۱ بابت ۱۹۱۵ء، ص ۵۵ - (ص)

" جامگ " کیا ؟ مگر یہ پیروی قتیل کی ہے ' کہ وہ ایرانیوں [کی] تقریر کے موافق تحریر اپنی بناتا ہے - ظہوری ' جلال ' ظہیر ' طاہر و حیر کے - ہاں " جام " کو " جامگ " نہیں لکھا - " دوسہ جامگی " کی جگہ " دوسہ ساغر " یا " دوسہ قدح " لکھو -

" پاچناری[1] گلستان بر باغبان است و تیماری او بر قدردانان " - میں اس فقرے کو نہیں سمجھا - یعنی " بر باغبان " کیا ہے " تیماری " کیا ہے ؟ " تیمار " بمعنی تیمار داری اور غمخواری ہے - جب یہ لفظ خود افادۂ معنی مصدری کرتا ہے ' تو یاے مصدری کیسی ؟ " تیرہ شبی ها بسر آمد " - " تیرہ شبیها بسر آمد " خیر - " تیرہ شبی ها بسر آمد " یعنی چہ ؟[2] " لیلائی دیدم کہ باہزار طرۂ طرار " - " طرہ زلف کو کہتے ہیں ; وہ دو ہوتی ہیں نہ ہزار در ہزار - " جامگی " مکرر دیکھا گیا - معلوم ہوا کہ حضرت نے جو کہیں " جامگی‌خوار " دیکھا ہے تو اس کو " جام خوار " بمعنی شراب خوار سمجھا ہے - یہ غلط ہے - " جامگی خوار " اس نوکر کو کہتے ہیں کہ جس کی تنخواہ کچھ نہ ہو ' روٹی کپڑے پر اس سے کام لیتے ہوں - [3] نظامی ' نوکر حضرت خضر کے ' کتنا روزینہ سخن پاتے ہیں جو خضر فرماتے ہیں :

---

۱ - " پا چناری " اس نوکر کو کہتے ہیں جو ہر وقت مستعد کھڑا رہے - قتیل نے نسبتی " ی " کو مصدری " ی " سمجھا - (ص) -

۲ - مطلب یہ کہ جمع کی علامت " ها " کو لفظ سے ملا کر لکھنا چاہیے - (ص) -

۳ - اس کے آگے کی عبارت : " نظامی .... چاشنی‌گیر من " صرف قلمی نسخے میں ہے - مطلب اس کا یہ ہوا کہ مصنف " معلیع اور

کہ اے جامگی‌خوار تدبیر من   زجام سخن چاشنی گیر من[1] -

" در توبہ باز است و باب رحمت فراز " - معنی اِس کے یہ کہ " توبہ کا در کھلا ہے اور دروازہ رحمت کا بلند " - " فراز " اضداد میں سے نہیں ہے - " باز " کھلا ' " فراز " بلند -
" قدر زعفران زار را بوے گل کرد " - اِس کا لطف کچھ میری سمجھ

معتقد " کے معنوں میں یہاں " جامگی خوار " کا لفظ استعمال ہوا ہے - چوں کہ یہ عبارت مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے ' اِس لیے یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص نے جو غالب کی تشریح سے متفق نہ تھا تعریض کے طور پر یہ عبارت لکھ دی اور شعر کا مطلب اپنے ذہن میں یوں لایا کہ " اے میرے بادۂ تدبیر کے جام‌خوار .... الخ " اور قلمی نسخے کے کاتب نے اُسے اصل عبارت کا جز سمجھ کے اُسی سلسلے میں لکھ دیا - واقعہ یہ ہے کہ غالب نے جو معنے " جامگی خوار " کے بتائے ہیں وہی صحیح ہیں - اِس لفظ کی تشریح میں اوروں نے بھی غلطی کی ہے : چنانچہ نولکشوری شارح نے جو لکھ دیا ہے کہ " جامگی منسوب بہ جام کہ مشاھرہ و سالانہ باشد " غلط در غلط ہے - " جام " کے معنے مشاھرے وغیرہ کے ہرگز نہیں -

۱ - سکندرنامۂ بری ' نولکشوری ' ص ۲۵ :—

مرا خضر تعلیم‌گر بود دوش   برازے کہ آمد پذیراے گوش
کہ اے جامگی‌خوار تدبیر من   ز جام سخن چاشنی گیر من
شنیدم کہ در نامۂ خسروان   سخن راندہ باشی ز آب روان

اِسی لفظ کو نظامی نے " سکندر نامۂ بحری " نولکشوری ' ص ۷ میں بھی استعمال کیا ہے (ص) : " جگر خوارۂ جامگی‌خوارگان " -

میں نہیں آیا - " قدر زعفران‌زار " کہا ' اور پھر اُس کو [کس[1]] نے " بوے گل " کر دیا ؟

" سکرر " کدام زبان است ' عربي یا فارسي ؟[2]

" حسب لیاقت خود " کافي است - " خودم " چه محل دارد ؟ مگر همان شیوهٔ قتیل : بندہ محبورم همان سکهٔ قتیل - صاحب بندہ ' تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو ' نہ مغل کے لہجے کا - لہجے کا تتبع بھانڈوں [کا] کام ہے ' نہ دبیروں اور شاعروں کا - ایسي تقلید کو میرا سلام- فقط[3]

خط سوم در تحقیق ترجمهٔ لفظ هندي " سہي " و " تو سہی " -

(س) . یار سے چھیڑ چلی جاے ' اسد !

گر نہیں وصل تو حسرت هي سہي

ناسخ : رهن رکھوا کر ترا عمامہ دلوا دوں شراب ;

زاهدا ! تجھ کو کروں مرهون احسان ' تو سہي -

اِس " سہی " اور " تو سہی " کا ترجمہ لغت فارسی میں کیا آیا ہے ؟ (ج از غالب) اسما [کے] یا لغات کے واسطے یہ بات ہے کہ عربي میں یہ کہتے ہیں اور فارسی میں یہ اور هندي میں یہ - طرز گفتار هندي کا فارسي ' اور فارسی کا هندي

---

۱ - قلمي نسخہ : " کسي " - (س) -

۲ - " سکرر " تابع مہمل ہے " مکرر " کا ' وہ بھي صرف اُردو کے روزمرے میں - فارسي کے لفظ " سلا " سے اُسے کوئي واسطہ نہیں - (س) -

۳ - یہاں س ۷ ختم هوتا ہے - (س) -

کبھي نہيں ہو سکتا ہے ؛ مثلاً " چوري کا گز مھتا " - اِس کي فارسي کوئي نہ پوچھے گا -

[ص ۹ سے ص ۱۲ تک کے ورق غائب ہیں -]

(ص ۱۳) عرض کي کہ " فلاں باز " طیار " شدہ است و صید مي‌گیرد " - بہر حال اب تاے قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا - اِس لفظ کو مستحدث اور در اصل اُردو اور بتاے قرشت بمعنی آمادہ۱ ، اشخاص اور اشیا پر عام تصور کرنا چاھیے ؛ اور عبارت فارسي میں استعمال اِس کا کبھي جائز نہ ہوگا ۔ ۱۲ -

" نقاب اور قلم اور دھي ، ترجمۂ جغرات " - یہ تینوں اِسم مذکر ہیں - مذکر سے مجھے بحث نہیں ؛ مجیب کا میں احسان مند نہیں - لغت فارسي اور روزمرہ فارسي ہو تو اہل زبان کے کلام سے سند کریں - منطق فارسی میں تذکیر اور تانیث کہاں ؟ اِس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں اور [یہ] ہم صیغہ متکلم‌مع‌الغیر کا ہے ؛ یعنی ہم اور تم اور مجموع [شرفا اور] شعراے دھلي اور لکھنؤ ۔ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے ؛ زیادہ جھگڑا بے فائدہ - " کھورھا ہوں " متعدي - پوربی اِس کو لازمي جانتے ہیں - لازمي : " کھو گیا ہوں " - ہم کہیں گے : " جاگتے ہیں " ؛ لکھنؤ والے کہیں : " جگتے "۔۲

" جان و دل " " دل و جگر " صحیح ؛ " جان و جگر " اِتکسال‌باہر - " آبستن " اور " آبست " کے باب میں یہ قول معترض

---

۱ - اس لفظ کے یہ مستحدث معنے فارسي ہي میں پیدا ہوچکے تھے ہمایوں‌نامۂ گلبدن بیگم میں جابجا یہ لفظ اِن معنوں میں آیا ہے - (ص) -

۲ - مکمل اُردوے معلی : " اہل پورب کہیں گے : جگتے ہیں " - (ص) -

کا غلط ہے کہ " آبست " کو بجاے " آبستن " جائز سمجھتا ہے - " آبست " کوئي لفظ نہیں - " آبستن " اصل لفظ ' " آبستني " مزید علیہ - یہ دونوں صحیح ' بلکہ " آبستنی " زیادہ فصیح - اگر معترض " فیضی " کو نہیں مانتا تو آپ معترض کو کیوں مانتے ہیں ؟ فیضی کي سند مقبول اور مسموع - " ارمغان " اور " ارمغانی " " آبستن " اور " آبستنی " - اے ' یہ تو فارسي لغت ہیں ؛ فارسي‌گویوں نے " حضور " کو " حضوري " اور " فضول " کو " فضولي " اور " نقصان " کو " نقصاني " لکھا ہے - آج تک سنا نہیں کہ " رب کبریا " کسي نے لکھا ہو - " کبریاے الہی " یعنی خدا کي بزرگي ؛ اِس نظر پر " رب کبیر " لکھیں گے نہ " رب کبریا " - " کبریا " صفت واقعي ہے لیکن اگر صفت سے موصوف مراد رکھیں تو ممکن ہے ؛ جیسا کہ " زیدِ عادل " بجاے " زیدِ عدل " - " جناب کبریا " بجاے " جناب الہي " جائز -

" حال " کي جگہہ " حالت " یا " احوال " لکھنا قبیح نہیں ہے ؟ خصوصاً " احوال " کہ یہ بمعنی واحد مستعمل ہے اور یہ استعمال یہاں تک پہنچا ہے کہ " احوال " بمعني جمع مستعمل نہیں ہوتا ؛ جیسے " حور " جمع ہے " حور[اء]" کي ؛ اہل فارس اِس کو صیغۂ واحد قرار دے کر الف نون کے ساتھ اِس کي جمع لاتے ہیں - حضرت سعدی کہتے ہیں :-

حوران بہشتي را دوزخ بود اعراف
از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

بلکہ "حور" کو "حوری" کہہ کر جمع "حوریاں" لاتے ھیں -
حضرت حافظ لکھتے ھیں :-

شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد
حوریاں رقص‌کنان ساغر شکرانہ زدند

غالب نے ایک مقطع میں "حال" کی جگہہ "احوال" لکھا ھے :-

جان غالب ! تاب گفتارى کماں دارى هلوز
سخت بیدردی کہ می پرسی زمن احوال من

آخر اُس[1] کو [اور فیضی کو] معترض سے زیادہ اساتذۂ عجم کے کلام پر اطلاع ھے ؛ وہ - "آہستگی" کیوں لکھتا اور یہ "احوال" کیوں کہتا - صائب کی ایک غزل ھے کہ جس کا ایک مصرع یہ ھے :-

ھرلحظہ دارم نوبتے چوں قرعۂ رمالھا -

اِس غزل میں اُس نے ایک جگہہ "احوالھا" لکھا ھے - ۱۲ -
داد کا طالب غالب - "ملک مغرب بلدۂ دھلي کثرۂ رودگراں"،
یہ کیا لکھا کرتے ھو ؟ شہر کا نام اور میرا نام کافي ھے ؛ محلہ غلط ' ملک زائد - ھندوستان میں دلي کو سب جانتے ھیں اور دلی میں مجھ کو سب پہچانتے ھیں - ۱۲ - انصاف کا طالب غالب -

(ص۱۸) رقعۂ پنجم دربحث صرف فارسی -

(س) "بود" اور "باشد" کہ دونوں صیغے مضارع کے ھیں

---

۱ - یعنی "غالب" - (ص)

بمعنی هست آتے هیں یا نہیں؟ (ج) آتے هیں۔

(س) ماضی مطلق کو ماضی استمراری کے معنے پر لکھنا کیسا؟ (ج) بہجا ہے۔ جب تک علامت استمرار نہ ہو، معنے استمراری کیوںکر پائے جائیں گے؟

(س) فارسي میں مصدر مقتضب اور غیرمقتضب کی کیا شناخت ہے؟ (ج) خود عربي میں مصدر کي صفت مقتضب نہیں فارسي میں کہاں سے ہوگي؟ مقتضب، صفت [بحر][1] کي ہے؛ نہ مصدر کي۔

(س) کس قسم کے مصدر لازمي سے مصدر متعدي بنتا ہے؟
[اِس کے بعد کے صفحے غائب ہیں[2]]

(ج) تقریظ مترشح قلم جادورقم نواب والامناقب نجم‌الدوله میرزا محمد اسدالله خاں غالب مدظله۔

سبحان‌الله! خدا کي کیا نظر فروز صنعتیں هیں، تعالي‌الله! کیا حیرت‌آور قدرتیں هیں! یه جو ''حدائق‌العشاق'' کا فارسي

---

۱ - قلمي نسخه: ''اور'' - (ص)

۲ - فارسی رقعوں میں ایک نقل، غالباً ''وجد'' کے قلم سے، اُس خط کي بھي ہے جو غالب نے آغا محمد حسین ناخدائے شیرازي کو لکھا تھا - یه خط ''پنج آهنگ'' (ص ۲۵۱) اور ''مکمل اردوے معلی'' (ص ۴۱۴) میں درج ہے۔ قلمي نسخے میں وہ حاشیے بھي تقریباً سب موجود هیں جو ''مکمل اردوے معلی'' (ص ۴۱۵) میں هیں اور جن میں کچھ غلطیاں بھي هیں جیسے ''شہرا شراب'' ''منبچھه'' اور ''زومایه''۔ صحیح صورتیں یه هیں: ''شہرا شراب'' (شہرا کي ''ر'' پر تشدید) ''پٹھچھه'' اور ''فرومایه'' - (ص)

زبان سے عبارت اردو میں نگارش پاتا ہے ' ارم کا زمین دنیا سے اُٹھ کر بہارستان قدس کا ایک باغ بن جاتا ہے - وہاں حضرت رضوان ارم کے نخلبند و آبیار ہوئے ' یہاں مرزا رجب علی بیگ صاحب ' سرور " حدائق العشاق " کے صحیفہ‌نگار ہوئے - اِس مقام پر یہ ہیچمیرز ' جو موسوم بہ اسداللہ خاں اور مخاطب بہ نجم‌الدولہ اور متخلص بہ غالب ہے خداے جہان آفرین سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے - ہاں ! اے صاحبان فہم و ادراک ' سرور سحربیان کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اِس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیسا گراں‌بہا پیرایہ ہے :

رزم کی داستان گر سنیے ہے زبان ایک تیغ جوہردار
بزم کا التزام گر کیجے ہے قلم ایک ابر گوہربار

مجھ کو دعوی تھا کہ انداز بیان و شوخی تقریر میں " فسانۂ عجائب " بےنظیر ہے - جس نے میرے دعوے کو اور " فسانۂ عجائب " کی یکتائی کو مٹایا ' وہ یہ تحریر ہے - کیا ہوا اگر ایک نقش دوسرے کا ثاني ہے ؟ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثاني ہے - ماني نقاش بےمعنی صورتیں بناکر پیمبری کا دعوی کرے ؛ کیا عقل کی کمی ہے ! یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعواے خدائي نہ کرے ; کس حوصلے کا آدمي ہے ! سچ تو یوں ہے کہ جناب مہاراجا صاحب والا مناقب عالي‌شان ایشري پرشاد نارائن سنگھ بہادر جس باغ کی آرائش کے کارفرما ہوں اور پھر اُس پر طرہ یہ کہ مرزا سرور چمن‌آرا ہوں ' وہ باغ کیسا ہوگا ؟ بہشت نہ ہوگا تو [اور] کیا ہوگا ! کوئی نہ کہے کہ یہ درویش گوشہ‌نشین فضول و ہیچمرز کیوں ہے ؟

یہ دیکھو بھائی، حضور کا ثناگستر کیوں ہے؟ صاحبو، حاتم سے ہم نے کیا دولت پائی ہے کہ اُس کی سخاوت کی ثنا کرتے ہیں، رستم سے کہاں شکست کھائی ہے کہ اُس کی شجاعت کا ذکر کیا کرتے ہیں؟ معہذا جناب مہاراجا صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان بابو پرسدھم نرائن کا مورد عنایت رہا ہوں - جن دنوں وہ دلی تشریف لائے ہیں اکثر اوقات شریک صحبت رہا ہوں - جب ناآشنائی و بیگانگی درمیان نہ ہو، تو اُن کا نیازمند کیوں اُن کا ثناخوان نہ ہو؟ نہیں، نہیں، میرا کیا منہ ہے ثناخوانی کا؟ میں عاشق ہوں اُن کی شاعرپروری و سخن‌دانی کا - حضور نے قدردانی کی، سرور نے گہرفشانی کی؛ حضور کا اقبال، سرور کا کمال؛ حضور کی عالی‌ہمتی، سرور کی خوش‌قسمتی - اِن شاء اللّٰہ تعالیٰ، یہ نقش صفحۂ روزگار پر یادگار رہے گا، مصنف کا شہرۂ رنگین‌بیانی میں، مہاراج عالی‌جاہ کا نام فیض‌رسانی میں تا روز شمار رہے گا - فقط -

(د) منشی میر محمد عباس کا خط، جس کا شروع کا حصہ غائب ہے :—

.. ..

کلام ہے - معنے صاف ہیں، معترض نا انصاف ہیں - لطف یہ ہے کہ خود نام سے نام پیدا ہے کہ اِس نے "برہان قاطع" کو اُلٹا ہے - اِن دو ناموں کا ایک نمط پر ہونا جائے تامل و غور ہے؛ ظاہراً اُس کا مطلب اور ہے[1] آپ کا مقصد کچھ اور

---

[1] — قلمی نسخہ : "مطلب ہے" - غالباً "اور" کاتب سے چھوٹ گیا - (ص) -

ہے - " قطع " کے معنی کاٹنے کے اور یقین کے بھی آئے ہیں -
اُس نے غالباً معنی ثانی مراد لیے ہیں اور آپ معنی اول استعمال
میں لائے ہیں - بہر صورت " برہان " کی طرف ظاہرا " قاطع "
کی اضافت ہے ' اور اِس ترکیب میں سراسر لطافت ہے - اِس
میں کچھ شک و ریب نہیں کہ ایہام میں حسن ہے ' کچھ
عیب نہیں ؛ لیکن تقصیر معاف :

ظرافت نہ کرنی تھی - یہ کیا کیا ؟
درشتی نے آفت کو برپا کیا -

اضعف‌الناس عباس ۔

مجلد مجموعہ

یہ غالباً خود لطیف احمد "لطیف" کا جمع کیا ہوا ہے ۔
اِس میں فارسی اور اُردو کے اکثر رقعے اور خط وہ ہیں جو
" لطیف " کو اُن کے دوستوں اور عزیزوں نے وقتاً فوقتاً لکھے تھے
کتاب کی جلد کے اوپر اور اندر کے سر ورق پر جلی قلم سے
" تحفۂ احباب " لکھا ہوا ہے - یہ نام بھی شائد خود "لطیف"
ہی نے رکھا ہو -

فارسی تحریروں میں " قدر " کے تین رقعوں کی نقل بھی
ہے جو " وجد " کے نام لکھے گئے تھے - اِن سے اندازہ ہوتا ہے
کہ " قدر " کے نزدیک " وجد " کی شاعری کا کیا رتبہ تھا -

---

١ - قلمی نسخہ : " لاتق "- یہ بھی قلم کا سہو معلوم ہوتا ہے - (م) -

" وجد " کے کل ۱۶ خط هیں ' جن میں سے ایک سید رضا حسین بلگرامی کے ' ایک نجم‌الدین " سهلد " بنارسی کے ' باقی ۱۴ " لطیف " کے نام هیں - اِن ۱۴ میں سے دو فارسی میں (دونوں ۱۸۴۹ع کے لکھے هوئے) اور ۱۲ اُردو میں هیں -

خود " لطیف " کے لکھے هوئے کل ۳ خط هیں ' جن میں صرف ایک اُردو میں هے باقی فارسی میں - باقی آٹھ دس خط اور لوگوں کے لکھے هوئے هیں -

نظم کی چیزوں میں ایک غزل " لطیف " کی اور کچھ کلام " وجد " کا هے -

اِس سارے مواد سے " غالب " کے شاگرد " لطیف " اور " قدر " کے سربرآوردہ شاگرد " وجد " کا جو حال معلوم هوتا هے وہ (مع بعض تفصیلات کے جو حضرات بلگرام کے زبانی دریافت هوئیں) یہاں لکھا جاتا هے :—

لطیف

شیخ لطیف احمد عثمانی بلگرام کے مولوی‌زادوں میں تھے - اِن کے والد کا نام کفایت‌الله تھا[1] اور دادا شیخ بادالله

---

۱ - " تحفۂ احباب " میں ایک خط محمد یار خاں کا (۵ اپریل ۱۸۸۲م کا) لکھا هوا بھی هے ' جس کے کچھ فقرے یہ هیں : " لفافے پر : لطیف احمد از کان پور ' پڑھ کر عرصے تک غور و خوض کرتا رہا کہ الٰہی اُس شہر کثیف میں یہ حضرت لطیف کون ذات شریف میرے عزیزوں قریبوں میں سے پیدا هوئے........آخر سراغ لگا کہ الله اکبر ' هوں نہ هوں ' یہ تو همارے ماموں صاحب قبلہ و کعبہ شیخ محمد کفایت‌الله صاحب مدظلہ کے صاحبزادۂ بلند اقبال معلوم هوتے هیں - (ص) "

"باد" • میر غلام علی "آزاد" کے ہمعصر بتائے جاتے ہیں -
"لطیف" نے عربی کی تحصیل لکھنؤ میں کی تھی اور فن
مناظرہ سے بہت دلچسپی رکھتے تھے - مولانا فضل‌الرحمن گنج
مرادآبادی کے مرید تھے-[۱] ملازمت کے سلسلے میں کانپور میں
ایک مدت تک رہے - "وجد" کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے
کہ ضلع ہردوئی میں اِن کی ملازمت کے لیے اکثر کوشش کی
گئی مگر کوئی صورت نہیں نکلی اور نکلی بھی تو وہ کسی وجہ
سے اِن کو منظور نہ ہوئی -

پہلے "سرور" لکھنوی کے شاگرد تھے، پھر غالب سے اصلاح
لی • بلگرام میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ "لطیف"
ایک بار اپنے اُستاد سے ملنے دلی گئے ' تو اُن کے لیے بلگرام سے
جھجلے[۲] پکوا کر ساتھ لے گئے - غالب کو یہ مزیدار چیز ایسی
پسند آئی کہ سولہ سترہ شعر اُس کی تعریف میں کہہ ڈالے '
جن میں سے صرف ایک ہی اب لوگوں کو یاد رہ گیا ہے : . .

خوشا لذت جھجلۂ بلگرام
کہ شبنم آزو تازگی کرد وام

---

۱ - یہ باتیں امیر احمد صاحب "رسوا" بلگرامی سے معلوم ہوئیں- (ص) -

۲ - یہ لذیذ پکوان اودھ کے اکثر قصبات میں عام ہے - ماش کی دال
کو سل پر پیستے اور چھان پھینٹ کر اُس کے چھوٹے چھوٹے گلگلے بناتے ہیں
اور اُنھیں گھی میں تل کر قوام یا دودھ میں ڈال دیتے ہیں - بعض مقامات
پر اِن کو "شیرازے" اور کہیں "ناز کیاں" بھی کہتے ہیں - (ص)-

ذیل کے خط اور غزل سے معلوم ہو گا کہ "لطیف" کی عبارت کا ڈھنگ اور اُن کے شعر کا رنگ کیا تھا۔

خط

مائی ڈیر برادر[1] سید بندہ رضا صاحب۔

مشتاق دیدار' لطیف احمد' سلام شوق کے بعد' مدعاطراز ہے کہ ایک خط آپ کا اردو اور دوسرا کچھ تو اردو اور کچھ فارسی' کچھ' سنسکرت: یہ دو تو مجھ کو پہنچے' میں نے پائے - شکایت آپ کی سر آنکھوں پر' مگر انصاف کیجیے کہ جب آپ لکھنؤ میں تھے' میں خط پر خط بھیجتا تھا اور آپ کچھ خبر نہ ہوتے تھے؛ اور اب تھوڑے عرصے میں اتنی بڑی شکایت! ...... سنیے صاحب' میں ایک رند لا اُبالی ہوں - میری بات کا برا نہ ماننا چاہیے - میں کیا اور میری بات کیا - لیکن الحمدللہ کہ آپ کو شکایت کا موقع تو ہاتھ لگا......خط کا کاغذ آپ کے واسطے رکھا ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ آپ کے پاس کاغذ بالکل نہیں ہے اور وہاں کہیں دستیاب بھی نہیں ہوسکتا' ورنہ آپ مجھ کو جوتے پھینکنے والے کاغذ پر خط کبھی نہ لکھتے؛ مگر ڈاک پر اِس لحاظ سے نہ بھیج سکا

---

[1] - یہ القاب غالباً اِس مناسبت سے ہے کہ حکیم بندہ رضا "آرزو" مرحوم انگریزی وضع کو بہت پسند کرتے تھے - میں نے بھی اِن کو دیکھا ہے - اکثر انگریزی لباس پہنتے تھے اور اُن کے ہمسن بزرگ اِس بات پر اُنھیں چھیڑا بھی کرتے تھے - اِن کے والد سید حسن رضا خاں' شہزادے برجیس قدر کے اتالیق تھے - اِس ذریعے سے "آرزو" کا قیام ایک مدت تک لکھنؤ میں رہا - "بصر" لکھنوی اور شیخ محمد زکی "زکی" بلگرامی سے تلمذ تھا - ۲۴ جون ۱۹۲۵ء کو بلگرام ہی میں انتقال کیا - (ص) -

کہ متحصول پڑ جائے گا - انشاء اللہ تعالیٰ جب خدا مجھ کو آپ سے ملائے گا، تب یہ تقاضا دور ہو جائے گا - میں آج ۱۷ اپریل کو روانۂ کانپور ہوا ہوں اور چودہ پندرہ دن میں واپس آؤں گا - پھر بلگرام کا قصد ہے.........زیادہ شوق - فقط - بےگناہ لطیف احمد - ۱۷ اپریل سنہ ۱۸۹۷ع -

جب تلک جان میں ہے جان بھی دھیان رہے :

غزل

دل رہے یا نہ رہے، یار کا ارمان رہے
یا خدا مورد جور اپنی سدا جان رہے

دل میں اُس بت کے نہ باقی کوئی ارمان رہے
حسن اور عشق کا اُٹھ جائے نہیں جلد حجاب

پردہ لیلیٰ کا، نہ مجنوں کا گریبان رہے
یا الٰہی، وہ کسی دن تو ہوں محو دیدار

خود بھی حیران ہوں، آئینہ بھی حیران رہے
کس سے وعدہ کیا، کی رات کہاں جا کے بسر

ہم تڑپتے رہے، تم غیر کے مہمان رہے
جی میں ہے ریت لوں خود اپنے گلے پر خنجر

میری گردن پہ نہ جلاد کا احسان رہے
بھڑکے سینے میں مرے آتش موسیٰ، یا رب!

اور آنکھوں سے رواں نوح کا طوفان رہے
واہ، کیا فہم! کہ بندے تو بتوں کے ہو، لطیف!

اور خدا سے ہے مناجات کہ : ایمان رہے

وجد

شیخ خلیل احمد "وجد" بلگرامی، ۱۸۹۹ع تک پہانی (تحصیل شاہ‌آباد، ضلع ہردوئی) کے مدرسے میں مدرس رہے

اُس کے بعد شاہ‌آباد، ہردوئی اور سندیلے کے دفاتر میں کم سے کم ۱۸۸۰ع تک مختلف خدمتوں پر رہے - تقریباً ۱۸۸۸ع میں بدل کر گونڈے گئے اور ۱۸۹۲ع کے بعد تک وہاں عدالت ججی کے ناظر رہے - خدمت سے سبکدوش ہو کر بھی وہیں سکونت رہی اور ۱۹۰۶ یا ۱۹۰۷ع میں انتقال کیا اور گونڈے ہی میں دفن ہوئے - "قدر" بلگرامی کے سر برآوردہ شاگردوں میں تھے - اور "قدر" کو اِن پر بڑا فخر تھا، چنانچہ کہتے ہیں :--

واہ وا! "وجد" و "جواں"، صل علیٰ "ارشد" و "صبح"
اِنھیں لوگوں سے ہوئی ہے مری شہرت کیسی[1]

یہ محض شاعری نہیں ہے- ایک خط میں وجد کو لکھتے ہیں :—

"عزیزالقدر حبیب‌القدر خلیل‌القدر سلامت - در مشاعرہ کہ پار گذشت انتظار غزل شما بسیار گذشت .... طرح یکشنبۂ آیندہ

---

۱ - "کلیات قدر" (آگرۃ ۱۳۰۸ھ) ص ۳۱۷؛ نیز ص ۳۳۵، ۳۶۳ اور ۴۰۸ -

"جواں" : بابو ہزاری لال بنارسی - ۱۲۸۳ھ میں انتقال کیا - قدر نے اِن کی موت پر ایک دردناک قطعۂ تاریخ لکھا تھا، جس کا ایک شعر یہ ہے :—

اے میرے جواں‌مرگ جواں! تو جو سدھارا
مٹی میں ملا آج مرا نام و نشاں، ہائے

"ارشد" : شیخ غلام حیدر بلگرامی - تاریخ‌گوئی میں کمال رکھتے تھے -

"صبح" : شنکر پرشاد بلگرامی - (س) -

آن روے نامہ، سپاہی زادہام غزل بگوئید کہ این بار یقیناً شریک مشاعرہ می‌شوید ...... " ایک اور خط میں کہتے ہیں :—

" حضرت سلامت - بعد نگرانی بسیار، کہ بہ حالت قربانی رسیدہ بودم، سحر گہان[1] بست و نہم ربیع‌الآخر، بعد از یک شب مشاعرہ، نامہ و جامۂ شما مقطع غزل انتظار شد - حبذا سخن بابرو می‌گویند و نثر ہم بد نہ می‌نویسند لیکن سجع را تکلف عبارت می کنند و چرامی کنند - در نثر غالب را پرستم و ہمین فرزانہ در سجع‌نویسی مرا سلک راہ بود است - .... اگر ایزد است در مشاعرۂ دگر از کلام شما صندہت رامی جنبانم - .... درین جلسہ حضرت " شرار " نیز گرم سخن بودند، نہ در طرح - سخنی از شما بہ میان آمد - دیدم کہ سخن پہلودار می رانند - گفتم : صاحب! باشید، اگر تیر شاگرد بر ہدف درآید و مہرۂ استاد بر خطا باشد حق از کیست ؟ "

گونڈے کے قیام کے زمانے میں بہت سے لوگ " وجد " کے شاگرد ہوئے، جیسا کہ " گلدستۂ کیف "[2] کے دیکھنے سے معلوم

---

۱ - قلمی نسخہ : " سحر گاں " ، جو صحیح نہیں - (س) -

۲ - یہ گلدستہ پنڈت شیوناتھ چک " کیف " تخلص گونڈہ (اودھ) سے شائع کرتے تھے اور اس کی ترتیب میں " وجد " بھی شریک تھے - میرے سامنے اس کی تیسری جلد (بابت ۱۸۹۱م) کے نو پرچے ہیں اور چوتھی جلد کا ایک پرچہ (بابت جنوری ۱۸۹۲م) - ہر پرچے میں وجد کا کلام موجود ہے - " کیف " کے حال کے لیے دیکھو تذکرۂ " بہار گلشن کشمیر " الہ‌آباد ۱۹۳۲ء ج ۲، ص ۱۴۷ - (س) -

ہوتا ہے - جناب " اصغر " گونڈوي نے بھی ابتدا میں اُن سے اصلاح لی ہے - " اصغر " صاحب سے معلوم ہوا کہ " وجد " بڑے مرتاض عابد تھے اور آخر زمانے میں زھد و عبادت میں اور بھی ترقي ہو گئی تھي -

سجع‌نویسي سے باز رھنے کا جو مشورہ " غالب " نے " قدر " کو اور " قدر " نے " وجد " کو دیا تھا " وجد " نے اُس پر عمل بھی کیا - خطوں میں القاب آداب مختصر ھیں - عبارت خطوں کي صاف اور بے تکلف ہے ' جیسا کہ " تحفۂ احباب " کے اِن اقتباسوں سے معلوم ہو جائے گا :—

(۱) عزیزي و حبیبي سید رضا حسین صاحب ' -

میرا سلام نیاز اور شوق دیدار قبول ہو - جو کچھ آپ نے منشي لطیف احمد صاحب کے خط میں لکھا یا لکھایا سب بجا اور درست ہے - واقعي دن بھر کمرے میں بیٹھے رھنا یا اِدھر اُدھر واھیات پھرنا اور .... ایک سادہ پرچہ بھی نہ بھیجنا یہ سب میری خطا ہے - .... اور پھر میں یہ بھی نہیں کہتا کہ راہ شکوہ و شکایت مسدود ہو - اگرچہ کسي کي کچھ بھي رائے ہو مگر میرے نزدیک اِس میں کچھ اور ھي لطف ہے - مجھ سے جو کوئي میرا دوست میرا شکوہ کرتا ہے تو واللہ اِس قدر خوش ہوتا ہوں کہ گویا مجھ کو کچھ پڑا مل گیا اور یہ سمجھتا ہوں کہ واقعی یہ میرا دوست صادق ہے - یہاں سندیلے میں جو ایک دو احباب میرے ھیں مدتوں میں اُن کي ملاقات کو نہیں جاتا ہوں اِس لیے کہ وہ مجھ سے شکوہ کریں - اپنے دوست لطیف احمد کو گواہ دیتا ہوں - والسلام ...... گنہگار خلیل احمد غفراللہ لہ - ۲۰ جون سنہ ۱۸۹۷ع -

(۲) خلیل کے خلیل ' لطیف کے لطیف -

میری بےحیائی یہ ہے کہ خطا کروں اور اعتراف ؛ آپ کی بےپروائی وہ کہ جو کچھ ہو معاف - حضور وجد کا جرم و قصور دیکھتے ہیں ؛ کہ اپنے لطف و کرم کا خیال کرتے ہیں - یہ عنایت نامہ بھی مشعر بہ عفو خطا و مسلو بلطف و عطا پہلتچا ؛ بندۂ بےزر بنا لیا - افسوس کہ میں کسی کام کا نہ نکلا - بقول استاد :

میں نہ کسی کام کے لائق ہوا
خلق ہوا ' ننگ خلائق ہوا (قدر)

دنیا کے مخمصے میں ایسا پھنسا ہوں کہ جودت طبع بھی جاتی رہی - کوئی مضمون نہیں سوجھتا جس سے صفحہ پورا کروں - بقول استاذالاستاد :

وہ ولولہ ' وہ جوش ' وہ وحشت نہیں رہی
وہ دل نہیں رہا ' وہ طبیعت نہیں رہی (منعم)

.... آج ہردوئی سے لکھنؤ کو ریل جاری ہو گئی فقط -

نامہ نگار ایک عبد ذلیل ' آپ کا تابعدار نام کو خلیل -

۱۵ جولائی سنہ ۱۸۷۲ء -

(۳) لطیف کے لطیف ' خلیل کے خلیل -

.... ہم تو جانتے تھے کہ آدمی کو خدا بناتا ہے مگر اب آپ بھی بنانے لگے ؛ گویا بندے کے خدا آپ ہی ہیں - میں جولائی کے عشرۂ آخر میں لکھنؤ گیا - رضا حسین سے ملاقات

ہوئي - دو تین گھنٹے تک خوب باتیں رہیں - اِس میں آپ کا بہت ذکر رہا - اُس طول طویل تحریر کا بھي ذکر آیا تھا .... سبحان اللہ ' اب تو آپ بھی "سرور" کے قدم بہ قدم ہو گئے ہیں - وہ قوت اور لیاقت کہاں سے لاؤں جو "غالب" کي طرح تقریظ لکھوں ؟ کیوں نہ ہو ' طباعي اِسي کا نام ہے کہ جو رنگ چاہا رنگا - مجھ کو مدتوں ایک لفظ کا دوسرا قافیہ نہیں سوجھتا ہے - یہی وجہ ہے کہ شعر میں بھی غزل کہتا ہوں جس میں سوائے مطلع کے اور کہیں مصاریع مقفا کی ضرورت نہیں ہوتي - مثنوی نہیں کہتا جس میں ہر شعر میں قافیہ ہو -

اب کہیے آپ کے والد ماجد کا مزاج کیسا ہے - کیا حضرت نے مجھ کو کبھيدیکھا ہے ؟ میں تو قدم بوسی سے محروم ہوں - خیر میں نہ سہی میرا سلام سہی ' والتسلیم فقط - گنہگار ننگ انام عبد ذلیل آپ کا تابعدار برائے نام خلیل - ۹ اگست سنہ ۱۸۷۲ع -

(۴) منشی لطیف احمد صاحب ' تسلیم -

آپ نے یہ مثل سنی ہے کہ پھر خود درماندہ پھر شفاعت کس کی ؟ میرا حال سنیے کہ کمشنر صاحب نے آخر سنہ ۱۸۷۷ع کے دورے میں جو رپورٹ ملاحظۂ دفتر تحصیل کی بابت لکھی اُس میں ایک فقرہ میري نسبت بھی تحریر فرمایا تھا جس کي شہرت عام زمانے میں ہوئي - وہ یہ کہ "ہم نے تمام سب میں دفتر جوتیشل تحصیل سلدیلہ کو نہایت پسند کیا منشی تحصیل ایک اچھا تعلیم یافتہ آدمی ہے اور وہ اپنا کام بخوبی انجام دیتا ہے -" اِس پر صاحب جوتیشل کمشنر بہادر نے

یہ لکھا کہ " .... آپ کی رپورٹ .... کے اخیر فقرے کے دیکھنے سے بڑی خوشی حاصل ہوئی - آپ براہ مہربانی اُس منشی کے نام ' ولدیت ' سکونت اور ملازمت سابقہ و خلاصۂ اعمال‌نامہ سے مجھے سرفراز کریں - یہ بڑی فرحت‌انگیز بات ہے کہ ایک شخص ' جس کا آپ نے ذکر کیا ' اچھا تعلیم یافتہ اپنا کام بہ خوبی کرتا ہے - آپ اُس کو ' اُمید ہے کہ ' اب ترقی معقول دیں گے " - یہ تو تحریر ہے - اب تقدیر دیکھیے .... غرض کہ میں ملصقی سندیلہ میں ناظر ہوا .... اب اِس نوکری سے ایسا بیدل ہوں کہ اگر کہیں زرا بھی سہارا ہوتا تو فوراً چھوڑ دیتا - .... والسلام خیرختام - کمترین خلیل احمد ' غفر اللہ لہ - ۲۳ اکتوبر سنہ ۷۹ -

" تحفۂ احباب " میں " وجد " کا کلام جس قدر ہے یہ ہے :—

(۱) اپنے گیسو کو نہ دیکھا ' مرا پہلو تاکا
تجھ کو دھوکا ہوا ' قاتل ! جو یہاں دل سمجھا
گالیوں کا مجھے شکوا نہیں ' خط تو آیا
لکھ تو بھیجا مجھے جس بات کے قابل سمجھا
رحم جس دل کو نہ بخشا ' تجھے بخشا وہ دل
درد جس دل کو دیا " وجد " کے قابل سمجھا

———

(۲) آج کل ' نام خدا ' حسن پہ مغرور ہیں آپ
پاس تو آئیے ' اللہ ! بہت دور ہیں آپ
" وجد " کی آنکھوں کے تل آپ ہی ہیں ' نور ہیں آپ
چشم موسیٰ کے لیے صاعقۂ طور ہیں آپ

اپنا ثانی نہیں رکھتے ' نہیں رکھتے ہیں حضور
اپنے نزدیک بہت دور ' بہت دور ہیں آپ
مجھ سے ہو اُنس ؛ یہ ممکن نہیں ' ممکن ہی نہیں
نہ میں جن ہوں ' نہ ملک ؛ گو پری و حور ہیں آپ
شیشۂ دل کسی نزاکت نے مجھے مارا ہے
اِک ذرا سخت کسی نے کہا ' بس چور ہیں آپ
دھیان ہے آپ ہی کا ؛ شکل نہ دیکھی ' تو کہا
دل سے نزدیک تو ہیں ' آنکھوں سے گو دور ہیں آپ

---

(۳) لاش پر میری گھڑی بھر کے لیے آئیے تو
کب سے بے گور و کفن ہے ' اِسے اُٹھوائیے تو
ہم نشیں ! کرگزاری مجھے دکھلائیے تو
جائیے ' بیٹھیے ' سمجھائیے ' لے آئیے تو
" روے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد "
دو گھڑی کے لیے ' اے یار ' چلے آئیے تو
دل مرا آپ نے بدلا تو نہیں غیروں سے ؟
مجھ کو دکھلائیے ' پہچان تو لوں ' لائیے تو
میں یہ کیوں کہنے لگا : خود ہی پلٹ آئیے گا
اِس سے کہا ؟ جائیے تو ' جائیے تو ' جائیے تو
صدقے اِن ہونٹوں کے ' اِک بار یہ کہہ دیجیے پھر :
" وجد " اِدھر آئیے تو ' آئیے تو ' آئیے تو

گلدستۂ " کیف " کے جو پرچے پیش نظر ہیں اُن میں " وجد "
کی تیرہ غزلیں اور دو سالی نامے ہیں - اِن کا اِنتخاب ذیل
میں دیا جاتا ہے :—

غزلوں کا انتخاب

بیکس کی لاش پر تو کوئی نوحہ خواں نہ تھا
بانگ جرس ہو جس میں یہ وہ کارواں نہ تھا

یاد آئیں مجھ کو وعظ میں رندوں کی صحبتیں
ہو حق تھا اپنی بزم میں ' یہ این و آن نہ تھا

اے وجد " قدر " و " بحر " کی لازم ہے پیروی
یہ تو نہ ہو کہ کوئی پس کارواں نہ تھا

جب گھورتا ہے یار ' اُچھلتا ہے دل مرا
آنکھیں نہ وہ دکھائے ' تو وحشی ہرن نہ ہو

تاریکی لحد بھی عجب دلفریب ہے
دیکھو کہیں یہی تو سواد وطن نہ ہو

رو میں جو آئے وہ کہہ گزرو " وجد " !

کوئی منہ آئے اگر ' آنے دو

آئیں تو دل لیں ' نہ آئیں جان جائے
دونوں شرطوں میں ہماری ہار ہے

سیکڑوں جس عارضے میں مرگئے
ہم کو بھی ایک وہی آزار ہے[1]

آج پھر اُن سے لڑائی ہوگئی
چار دن کی آشنائی ہوگئی

دل کی دل میں تھی جب' اپنی بات تھی
لب پہ جب آئی پرائی ہوگئی

---

۱ - دو بحریں : (۱) رمل مسدس محذوف ' (۲) سریع مطوی مکسوف -

زاہد! اس طاعت پہ یہ کبر و غرور
بندگی سے کبریائی ہوگئی

استخواں تک میرے پہنچی آج منقار ہما
یاد آئیں یار تیری چتونیاں مدت کے بعد
جب در جنت پہ پہنچے ہم تو پہچانے گئے
دیکھ کر رضواں نے پوچھا: تم کہاں مدت کے بعد
آرزو ہے کہ مرا دم ترے در پہ نکلے
تیرا بیمار ترے کوچے سے مرکر نکلے
اس طلب سے یہی مطلب ہے کہ مطلوب ملے
دل کو میں سینے میں ڈھونڈوں تو وہ دلبر نکلے
محتسب! جانب میخانہ چلا خیر تو ہے
آج کچھ بگڑی نظر آتی ہے نیت تیری

دیکھا جو عید کو در میخانہ کھل گیا
ہم راستہ ہی کاٹ گئے عیدگاہ کا
کہا "وجد" کا کلام ہے مقبول خاص و عام
بزم سخن میں شور ہے اک واہ واہ کا

ساقی نامہ
۱۸۹۱ء

شب اپنا بستر سمیٹتی ہے | سیاہ کمل لپیٹتی ہے
فلک نے تانی سفید چادر | کہ آنیوالا ہے شاہ خاور
سحر کی آمد کا غلغلہ ہے | مہ شبینہ چراغپا ہے
ستارے سب جھلملا رہے ہیں | نیا تماشا دکھا رہے ہیں

نماز کا وقت سر پر آیا — نمازیوں نے پرا جمایا
گجر بجا . وہ ہوئیں اذانیں — پجاریوں نے لگائیں تانیں
وہ عورتیں کچھ نکل کے گھر سے — چلی ہیں دریا کا قصد کرکے
اُمنگ میں گنگنا رہی ہیں — بھجن کلدھیا کے گا رہی ہیں
ابھی ہے کچھ رات کی سیاہی — کہ آنکھیں ملتے اُٹھے سپاہی
لگا کے ہتھیار تن کے نکلے — سب اپنی وردی پہن کے نکلے
شب اپنا دامن چھڑا کے بھاگی — کہ اِس میں ساری خدائی جاگی
طلوع خورشید کے اثر سے — شجر نہائے ہیں آب زر سے
فلک پر اک مہر ہے درخشاں — زمیں پہ گل سیکڑوں ہیں خنداں
مچا تھا دو چار روز سے غل — کہ آنےوالا ہے موسم گل
ہوا یہ فضل و کرم خدا کا — جو کل سنا تھا وہ آج دیکھا
چمن میں فصل بہار آئی — ہوا بھی بدلی گھٹا بھی چھائی
گلوں نے اپنا جمایا بستر — بچھائی سبزے نے اپنی چادر
روش پہ لالہ کھلا ہوا ہے — چمن کا ڈانڈا ملا ہوا ہے
کہیں ہے بیلا کہیں چمیلی — کہیں ہے جوہی نئی نویلی
ہر اک شجر کونپلیں نکالے — کھڑا ہے جوبن کو، نرالے
بجا رہا ہے چنار تالی — لگا رہا ہے انار ڈالی
کسی طرف بہ رہی ہیں نہریں — اُمنگ میں لے رہی ہیں لہریں
کسی طرف حوض ہیں لبالب — کہ تشنہ‌لب آکے چوم لیں لب
یہ سب تو ہے بیچ میں جھمیلا — پھر اِن کے ہے آس پاس کیلا
نمو کا اِک دور اور آیا — کہ آم جامن میں بور آیا
وہ دیکھو مہوا ٹپک رہا ہے — شراب‌خواروں کو تک رہا ہے
شباب پر ہے بہار ' ساقی ! — پھر اب ہے کیا اِنتظار ؟ ساقی !
جمادے تو بھی دکان اپنی — دکھادے رندوں کو شان اپنی

سمٹ کے سب بادہ خوار آئیں ۔ اشارہ پائیں تو بیٹھ جائیں
مزے میں آکر اُڑائیں تانیں ۔ کوئی کہے کچھ یہ کچھ، نہ مانیں
نہیں ہے کچھ محتسب کا کھٹکا ۔ اگر وہ لن سے زرا بھی اٹکا
عمامہ جبہ اُتار لیں گے ۔ اُسی کو پھر رھن مے، کریں گے
جو واعظ آئے تو کیا مزا ہو ۔ کہ گرد رندوں کا جمگھٹا ہو
کوئی کہے : "چھوڑ اپنی بانی" ۔ کوئی کہے : "کہہ کوئی کہانی"
ملے تو زاہد کی بھی خبر لیں ۔ اُسے بھی اپنا مرید کرلیں
پلائیں اُس کو شراب کہنہ ۔ اُبھاریں اُس کا شباب کہنہ
پھر اُس کو گدی پہ لابٹھائیں ۔ اُسی کو پیر مغاں بنائیں
اب ایک باقی رہے ہیں قاضی ۔ اُنہیں بھی کرلیں گے رند راضی
اگر خوشامد نہ کوئی مانی ۔ دکھائی کچھ اپنی شرع دانی
تو بحث علمی پہ اُن کو لاکر ۔ یہ ہم کہیں گے لغت دکھاکر
اگر یہ پینا حرام ہوتا، ۔ "شراب" کیوں اِس کا نام ہوتا؟
یہ کیسی خوش رنگ مے ہے، قاضی! ۔ یہی تو پینے کی شے ہے، قاضی!
نہیں ہے کچھ اختلاف اِس میں ۔ نماز بھی ہے معاف اِس میں
اب اِس کا کوئی جواب دیجے ۔ نہیں تو، لیجے، شراب پیجے
بس اب رہا کوتوال کا ڈر ۔ مگر وہ ہے ایک بندۂ زر
دکھائیں گے ایک کیسۂ زر ۔ وہ موم ہو جائے گا پگھل کر
جو چڑھ گیا کوتوال ڈھب پر ۔ تو چوکی پہرے کا کچھ نہیں ڈر
ہر اِک سے دامن چھڑا کے آخر ۔ یہ دیکھ، ساقی! ہم آگئے پھر
تمام رند آکے تجھ کو گھیریں ۔ تو آنکھ پھیرے، یہ منہ نہ پھیریں
نئے نئے روز راگ لائیں ۔ غزل بھی تصنیف کرکے گائیں

پلا بھی دے تو شراب ' ساقي ! ہوا کرے گا حساب ' ساقی !
لگا کے اونچی دکان بیٹھا بنا ہے عالي جناب ساقی
جو ہے نہ دینا تو صاف کہہ دے سوال کا دے جواب ' ساقي !

غزل ہوئی ختم ' اب ہے کیا غم
جو خوش ہو ساقي تو یہ کہیں ہم
اب اِس کا اِنعام ہم کو دے دے
اِک آخری جام ہم کو دے دے

دکھا چکا اپنا زور خامہ تمام ہونا ہے اب یہ نامہ
پلادے ' ساقی ! اِک اور ساغر سلام لے ' "وجد" اب چلے گھر

ساقي نامہ
۱۸۹۲ع

شکر خدا رنج کا کچھ غم نہیں
بخت کا شکوا کریں وہ ہم نہیں

دھوم ہے میخواروں میں اِک دھوم ہے
اِس کا سبب کچھ تمھیں معلوم ہے
مانگ رہے ہیں یہ دعاے بہار
پڑھتے ہیں جامي کي غزل بار بار
" باز ہواے چمنم آرزوست
جلوۂ سرو و سمنم آرزوست "

تبصرے

نوجوان ورتھر کی داستان غم

مترجمۂ ریاض الحسن ایم اے - صفحات الف ۵۸ ، اور ۱۴۴
لٹریری سنڈیکیٹ : نمبر ۱ ، بیلی روڈ الہ آباد - سنہ ۱۹۳۳ع
قیمت غیر مجلد کی تیرہ روپیہ ، اور مجلد کے لئے دو روپیہ -

یہہ کتاب جرمني کے عظیم الشان شاعر اور فلسفی یوہان و ولف گانگ گوئٹے کی کتاب کا ترجمہ ہے ، جو جناب ریاض الحسن صاحب نے کیا ہے - شروع میں ۵۸ صفحوں کا خفی قلم سے چھپا ہوا ایک طویل و بسیط مقدمہ ہے ، جس میں گوئٹے کے واقعات حیات بیان کرنے کے بعد اس کے فلسفے سے بحث کی ہے ، اور آخر میں خود اس کتاب کے مضمون اور فلسفے سے بحث ہے - اس کے بعد اصل کتاب کا ترجمہ ہے -

گوئٹے اٹھارویں صدی مسیحی کے وسط میں پیدا ہوا ، اور اب سے پورے ایک سو برس پہلے سنہ ۱۸۳۲ع میں اس عالم آب و گل سے رخصت ہوا - اپنی زندگی میں اس نے جو جو کار ہائے نمایاں کئے وہ نہ صرف اُس کی ذات کے لئے بلکہ اس کے وطن اور اہل وطن کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مایۂ ناز رہیں گے - فطرت نے اُسے کچھ ایسی بے چین طبیعت اور ایسا نازک دل عطا کیا تھا کہ ان کی بدولت وہ مدت العمر مختلف

کے قلم سے ماضی قریب ھی میں شائع ھو چکا ھے -
اسی طرح گوئٹے کی ایک اور تصنیف " مغربی مشرقی دیوان "
کا جواب علامۂ اقبال کے سحر آفریں قلم نے اب سے دس برس
پہلے ادا ھو چکا ھے - ورتھر کی باری اب آئی ' اور اس میں
شک نہیں کہ یہ ترجمہ بھی حسن و خوبی کی بہت سی
شان اپنے اندر لئے ہوئے ھے - افسوس کہ گوئٹے کی اور معرکتہ‌الآرا
تصانیف ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ھوئیں - کیا عجب
کہ ان ھی حضرات میں سے کوئی بزرگ ان کی طرف توجہ
فرمائیں -

مقدمے کے بعد ایک مختصر سا " اعتذار " ھے ' اور اس
کے بعد کتاب کا ترجمہ شروع ھوتا ھے - مصنف نے کتاب کو ان
الفاظ سے شروع کیا ھے : " مجھے غریب ورتھر کی داستان جو
کچھ بھی مل سکی ' سب کو احتیاط کے ساتھ جمع کر کے
آپ کے سامنے پیش کرتا ھوں ' اور جانتا ھوں کہ آپ اس
پر میرا شکریہ ادا کریں گے ...... " یہ سب مقدمہ قریب
دس سطروں میں آتا ھے - مگر مترجم صاحب نے اسے بالکل
محذوف کر دیا ھے - اس کے مطالعے سے بہ آسانی اس امر کا
اندازہ ھوتا ھے کہ مترجم نے کس قدر کاوش اور کوشش سے کام
لیا ھے - لیکن ایک غائر مطالعے اور مقابلے سے معلوم ھوتا ھے
کہ ریاض‌الحسن صاحب نے عموماً اس امر کا لحاظ رکھا ھے کہ
انگریزی طرز ادا سے کسی قدر جدا ھو کر اسی خیال کو اپنی
زبان کے اسلوب میں ادا کر دیا ھے - اس کا اثر صرف یہ ھوا
ھے کہ متعدد مقامات پر ترجمہ لفظی حیثیت سے ھٹ کر

آلم و افکار میں مبتلا رہا ' اور یہی افکار اُس کی عظمت اور بلندی قدر کا باعث ہوے - طبیعت کی اُس افتاد اور مزاج کے اس رنگ نے ہر وادی کی سیر پر مجبور کیا ' جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ اُس نے پاھسہ رہتے ہوئے بھی اپنی زندگی ایک بے ہمہ انداز سے گذاری - بقول مترجم "اس میں تخیل کی رنگینی کے ساتھ عقل ' جوش و خروش کے ساتھ سکون ' اور عشق کی بے قراری اور وارفتگی کے ساتھ بے پروائی اور رمیدگی کا توازن اس مناسبت کے ساتھ تھا کہ اس کی روحانی زندگی ہمیشہ خارجی دنیا سے ہم آھنگ رہی - اس کا دل عجائبات عالم کے ہر ذرے کا راز دار بننے کا آرزو مند تھا ... ... فطرت نے اس کی ہمہ گیر طبیعت میں وہ شوق پیدا کیا تھا کہ وہ ہر اس چیز سے دلچسپی لیتا جس سے انسان کا دل متاثر ہو سکتا ہے ' گویا وہ سارے نظام فطرت کو سمیٹ کر اپنے دل کی گہرائی میں چھپا لینے کا خواہش مند تھا .... اس کے سینے میں دو روحیں تھیں : ایک تو شاعر کی حسن پرست ' عشق پرور ' شورش انگیز ' ہنگامہ خیز روح ' اور دوسرے حکیم کے عرفان کی عرفان جو ' حق پسند ' سکون طلب ' نظم آفریں روح .... ان دو روحوں کی کشمکش سے جو توازن پیدا ہو گیا تھا ' وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے " -

گوئٹے کی تصانیف کی تعداد بہت وسیع ہے - لیکن ان سب میں "سچ اور جھوٹ" (جو اس نے خود نوشت - سوانح عمری ہے) ' فاوست ' ولہلم مائسٹر اور ورتر (یا بقول مترجم ورتھر) بہت اہم ہیں - فاوست کا اُردو ترجمہ پروفیسر عابد حسین صاحب

تشریحی اور تفسیری شکل میں نمودار ہو گیا ہے - تاہم مصنف
کا کوئی لفظ اور جملہ اظہار کے بغیر نہیں رہ گیا ہے ' اور اردو
کی سلاست ' روانی اور تاثیر میں بھی فرق نہیں آیا ہے :
وھوالمراد - علامہ کارلائل نے گوئٹے ھی کی کتابوں کے انگریزی
ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوے] کہا تھا کہ " اظہار خیال کی راستی
اور دیانت ھی وہ چیز ہے جسے مترجم کو مدنظر رکھنا چاھئے '
یعنی یہ کہ وہ مصنف کے جذبات کو بالکل اسی طرح ادا کرے
جیسا کہ اس نے خود ادا کیا ہے ' اور یہ کہ ان کیفیات کے
تغیر اور اختلاف میں وہ برابر اصل کی پیروی کرے " اس لحاظ
سے یقین ہے کہ کارلائل کو اس اردو ترجمے پر بھی کوئی اعتراض
نہ ہوتا - اس ترجمے کی زبان عموماً سادہ اور سلیس ہے ' اور اکثر
مقامات پر جن سنگین اور پر معنی جملوں اور فقروں کو
صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
ریاض الحسن صاحب کو اپنی زبان پر کتنی کچھ قدرت حاصل ہے

اس تیرہ سو صفحے کی کتاب میں متعدد مقامات ایسے
ملتے ھیں ' جہاں بہت ممکن ہے کہ اکثر پڑھنے والوں کو فاضل
مترجم کے طرز ادا سے اختلاف ہو ' بالخصوص وہ مقام کہ
جہاں زبان اور محاورے کو ادا سے تعلق ہے - اب یا تو ان کے
بارے میں یہ کہا جائے کہ ان جملوں میں کچھ یوروپی رنگ
جھلکتا ہے ' یا اسے صاحب مترجم کے خاص طرز ادا سے نسبت
دی جاے ' یا بعض جگہوں میں محض انگریزی اسلوب کا اثر
کہا جاے مثلاً ذیل کے قوسین میں دئے ہوئے الفاظ ملاحظہ ہوں -

ا ـ ص ا آخری سطر " ان تمام باتوں کے متعلق مفصل
طور پر آئیے (چلیں) بہت جلد لکھنے والا ہوں "

۲ ۔ ص ۴ دوسرا خط ۔ " تم مجھے کتابوں (کی) الٹے دیتے ہو " ۔

۳ ۔ ص ۴۴ آخری سے قبل سطر ۔ " اس (کی) ایک راگ سن کر " ۔

۴ ۔ ص ۱۵ ۔ ۱۷ ۔ " یا پھر مجھے (سے) کوئی کام بتا دیتی ہے ہے " ۔

۵ ۔ ص ۱۳۹ ۔ ۱۷، ۱۸ ۔ " البرٹ کی ایک تحریر دی جس کو اس نے (اپنی) بیوی کو دے دی " ۔

دوران کتاب میں کم و بیش پچیس جگہ مترجم صاحب نے مفید اور بصیرت افروز حاشیے بھی دیئے ہیں ، جن سے کتاب اور بھی زیادہ قابل قدر ہوگئی ہے ۔

بہ حیثیت مجموعی یہ ترجمہ قابل قدر چیز ہے ، اور لٹریری سنڈیکیٹ مبارک باد کا مستحق ہے کہ اُس نے دنیائے ادب کے اس جوہر پارے کی قدر دانی کر کے اردو اَدبیات میں ایک نفیس اضافہ کیا ۔ غالباً اس " سنڈیکیٹ " سے یہ امید بے جا نہ ہوگی کہ آئندہ بھی اسی نوع کی کتابیں اِس کے اہتمام سے شائع ہوں ۔

کتاب کی طباعت اور کتابت صاف ستھری ہے ، اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ طباعت میں غلطیاں بہت کم ہیں مثلاً تہلیل کو تحلیل (ص ۵۹) بوریا کو بوریہ (ص ۶۳) سوہان کو سوحان (ص ۷۳) لکھا گیا ہے ، اور غالباً یہ بھی اس معصوم کی خطا ہے جسے عرف عام میں کاتب کہتے ہیں ۔

(م ۔ ن)

مہاتما رسکن

(ملنے کا پتا ساغر بک ڈپو میرٹھ قیمت چار آنے)

یہہ مختصر سي کتاب انگلستان کے مشہور ادیب جان رسکن کے سوانح‌حیات اور اسکے اخلاقی نظریات کا ایک مجمل سا خاکہ ہے جان رسکن ایک ادیب اور ناقد فن کي حیثیت سے اول اول نمایاں ہوتا ہے ' لیکن آہستہ آہستہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں پر مصلحانہ انداز سے چھا جاتا ہے - اُسکی زندگي کا یہہ ارتقائی پہلوبجائے خود فلسفۂ حیات کے حیرت انگیز بصائر میں داخل ہے - انساني دماغ کی یہہ بوقلموني کتنی حیرت انگیز ہے کہ مصوری ' تعمیرات ' اخلاقیات ' ادبیات ' اور اقتصادیات کے مختلف سرشتے سب ایک مقام پر باہم ملے ہوئے نظر آتے ہیں - مسٹر انند سروپ بھٹناگر بی - اے جو اس مختصر سي کتاب کے مولف ہیں اس حیثیت سے کہ اُنہوں نے اس عجیب و غریب شخصیت سے اردو داں جماعت کو روشناس کرانے کی کوشش کي ہے مستحق تحسین و ستائش ہیں ' اپ نے اس کتاب میں رسکن کے مختلف موضوعات اور ان موضوعات پر اسکے معتقدات و نظریات کا بہت ھي اختصار و اجمال کے ساتھہ ذکر کیا ہے ضرورت ہے کہ رسکن اور اسکے افادات کو مفصل و مبسوط طور پر ملکي زبان میں منتقل کیا جائے - ہمیں امید ہے کہ جناب مولف صرف اس قسم کی " فہرست مضامین " پر اکتفا نہ فرمایئنگے بلکہ عنقریب جان رسکن پر اس سے بہتر اور اس سے زیادہ مفصل کوئي کتاب لکھکر شایع فرمائینگے -

---

ارسی

ملنے کا پتہ مقبول حسین خاں - دریا باد - الہ آباد - قیمت دو روپیہ

یہہ مولوی نثار حسین خاں "شہدا" کی ریختیوں کا مجموعہ ہے - شروع میں مصنف کی تصویر ' اسکے بعد ریختیاں اور آخر میں سلام اور "قصیدیاں" ہیں - ریختی کی تو بنیاد ہی بقول مولانا شرر مرحوم بے شرمی و بیحیائی کے خیالات و جذبات پر قائم ہوئی تھی بلکہ نصف صدی پیشتر کے بعض سنجیدہ دواوین تک فحش و عریانی سے خالی نہیں ہیں - اسلئے ان ریختیوں کو کسی اعلی اخلاقی معیار کے سامنے لانا ہی بے انصافی ہوگی - البتہ دیکھنے کی چیز یہہ رہ جاتی ہے کہ مثل اور اصناف سخن کے یہہ ریختیاں زمانے کی ترقی اور عام مذاق کی شستگی و بلندی سے کس حد تک متاثر ہوسکی ہیں - چنانچہ انشا ' رنگین ' جانصاحب اور صاحبقران وغیرہ کا کلام سامنے رکھکر دیکھئے تو بلا خوف تردید یہہ کہا جاسکتا ہے کہ آرسی میں صرف زبان کی صفائی و برجستگی ' طرز بیان میں نفاست و لطافت ہی کا اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ فحاشی کے اعتبار سے بھی نسبتاً یہہ اخلاق کی ایک کتاب معلوم ہوتی ہے - کئی کئی ریختیوں کے بعد آپ کو دو ایک شعر ایسے ملینگے جو اخلاق سے گرے ہوئے ہوں - قدیم ریختی گویوں کے مقابلے میں یہہ تناسب یقیناً ایک بہت بڑی ترقی ہے - اصل یہہ ہے کہ عورت کے نام کے ساتھہ ہی کچھہ اسطرح کی آزاد رنگینیوں کا خیال وابستہ ہے کہ عام لکھنے والے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید اکثر بے قابو ہو جاتے ہیں لیکن اگر عورت کے مفہوم میں خود ہماری مائیں اور

پہلوئیں بھی شامل ہوں تو شاید ہمارے قلم کی یہہ شوخ و بیباک روانیاں قائم نہ رہ سکیں ' اور ہمارا لٹریچر عورت کی برگزیدگی و عظمت کے لحاظ سے عورت کے شایاں شان تیار ہوسکے - جیسی صاف آسان اور بے تکلف زبان حضرت "شہدا" نے اختیار کی ہے ہمیں اپنی مستورات کے لئے اسکی بیحد ضرورت ہے - اگر ہمارے مشورہ کی پزیرائی ہوسکی تو ہمیں امید ہے کہ مستقبل قریب ہی میں بجائے ریختی کے اسی زبان میں کچھہ زیادہ کام کی باتیں حضرت مصنف کے قلم سے نکل کر ہم سب کو ممنون بنائینگی -

---

مجموعۂ نغز

پروفیسر محمود شیرانی لکچرر پنجاب یونیورسٹی لاہور ایک کہنہ مشق انشاپرواز ہیں ذوق ادب فطری رکھتے ہیں - اُن کے فاضلانہ مضامین رسالہ اُردو اورنگ‌آباد میں اکثر نکلتے رہے ہیں - غرض علمی اور ادبی حیثیت سے موصوف کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں - حال میں آپ نے زبان اُردو کے علمی ذخیرہ میں ایک بیش بہا اضافہ اور اُردو والوں پر ایک بڑا احسان کیا ہے یعنی اُنہوں نے ایک قلمی تذکرہ شعراے اُردو موسومہ "مجموعۂ نغز" کو پہلے پہل طبع و شائع کیا -

یہ تذکرہ حکیم قدرت اللہ قاسم دہلوی (۱۱۹۹—۱۲۳۹ ھ تقریباً) کی تصنیف ہے جس کی تصنیف سنہ ۱۲۲۱ ھ میں ختم ہوئی چنانچہ اُس کا نام "مجموعۂ نغز" تاریخی ہے -

حکیم صاحب مذکور خواجه میر درد علیه‌الرحمته کے ایک شاگرد هدایت الله خاں هدایت کے شاگرد هیں یه تذکرہ دو جلدوں میں هے - قلمی نسخه میں تو ۳۹۷ ورق یعنی ۷۹۴ صفحات تھے مگر مطبوعه نسخے میں ۸۱۲ صفحات هو گئے - حکیم صاحب موصوف نے دستور زمانه کے موافق فارسی زبان میں اُسے لکھا هے - اس میں تقریباً ۷۰۰ شعراے اُردو (مرد و عورت - شائسته واوباش سب کے) حالات لکھے هیں - تذکرہ کی عبارت رنگین اور مقفی هے اس سے اندازہ هوتا هے که مصنف تذکرہ کے مزاج میں تکلف تھا -

اِس کا قلمی نسخہ دراصل پروفیسر محمد حسین آزاد دهلوی کی ملک تھا جو اُن کے مطالع میں مدتوں رها - چنانچه اس پر آزاد کے کچھ حواشی بھی هیں آزاد کا کتاب خانه اب یونیورسٹی کے قبضه میں هے اس طرح یه قلمی تذکرہ پروفیسر شیرانی کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے هاتھ آیا - اُنھوں نے مذاق سلیم کی مدد اور جدید لوازم طبع و اشاعت کے موافق کافی محنت اور عرقریزی کے بعد اُس کو شائع کیا - تصحیح کے لئے ولایت کے کتاب خانه انڈیا آفس سے اُس کا قلمی نسخه منگوایا ' دونوں کا مقابله کیا ' دیباچه لکھا ' مصنف کے حالات فراهم کئے آخر میں ناموں کی انڈکس دی ' غرض پروفیسر شیرانی ایسے بالغ نظر اور بلیغ سخن گستر کی ترتیب اور نگرانی کو جیسی نفاست اور عمدگی شایاں تھی - کتاب ویسی هی هے کتابت و طباعت عمدہ - جلد نفیس - اس پر مطلا حروف میں نام وشهرہ درج هے -

Ten Gems from Ghalib

مرتبۂ شہاب‌الدین رحمت‌اللہ بی - اے

(ملنے کا پتہ کتابستان ' الہ‌آباد ' قیمت اندرون ملک ایک روپیہ ' بیرون ملک ایک شلنگ چھہ پنس)

اس کتاب میں غالب کے دس اشعار کو مصور کرنے اور انگریزی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے - ترجمے میں کوئی خاص اصول مدنظر نہیں ہے یعنی نہ تو یہ لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور نہ اشعار کی حقیقی اسپرٹ کا خیال کیا گیا ہے بعض جگہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے غالب کے شعر کا مفہوم ہی نہیں سمجھا ' تصویریں جو دیگئی ہیں وہ اس خیال پر مہر تصدیق کرتی ہیں - کل کتاب بارہ صفحوں کی ہے اسی میں ایک صفحہ پر " غالب کی اور دوسرے پر مترجم کی بالمقابل تصویر ہے - کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے اور غیر مجلد ہے - قیمت بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے -

---

اُردو

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن) کا خالص ادبی سہ ماہی رسالہ

جو

جنوری، اپریل، جولائی، اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

جس میں

ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے -

اُردو مطبوعات اور رسالوں پر تبصرے بھی کئے جاتے ہیں -

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب، بی - اے - سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور پروفیسر اُردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد (دکن) -

---

سالانہ چندہ : سات روپیہ ایک نسخہ کی قیمت ایک روپیہ ۱۲ آنے -

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - سٹی روڈ الہ آباد

سے طلب کیجئے